خطۂ پاک اوچ



مسعود حسن شہاب

خطّۂ پاک

اوچ

مسعود حسن شہابؔ

اردو اکیڈمی بہاول پور

یہ کتاب محکمہ اطلاعات وثقافت حکومت پنجاب
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی۔

طبع اول = ۱۹۶۷ء

طبع دوم = ۱۹۸۰ء

طبع سوم = ۱۹۹۱ء

طبع چہار = ۲۰۰۹ء

مطبع =

ناشر = اردو اکیڈمی۔ بہاول پور

قیمت = ۴۰۰/ روپے

ملنے کا پتہ = ۳۳۔سی ماڈل ٹاؤن اے۔ بہاول پور

طبع نو

"خطہ پاک اوچ" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ عموماً اس قسم کی تحقیقی کتابوں کی کھپت بہت کم ہوتی ہے اور سالہا سال تک ان کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن اس کتاب کو خلاف معمول علمی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اور اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ لیکن اس کا دوسرا ایڈیشن فوری طور پر شائع نہ ہو سکا۔ اور تقریباً پندرہ سال بعد ۱۹۸۲ء میں چھاپنے کی نوبت آئی۔ یہ ایڈیشن بھی جلد ختم ہو گیا۔ ۱۹۹۳ء میں ضروری ترامیم و نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا وہ بھی جلد ختم ہو گیا، چنانچہ اب اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ محققین اس تحقیقی کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

فہرست مضامین

باب سوم

باب چہارم

باب ہفتم

باب ہشتم

باب نہم

★ ★ ★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از

ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی

رئیس الجامعہ، جامعہ اسلامیہ

بہاول پور

"الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر البریۃ"

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ آج مجھے "خطۂ پاک اوچ" کی ایک تاریخی کتاب پر "پیش لفظ" لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں جب اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ سے منتقل ہوئی اور صدرِ مملکت کی خواہش ہوئی کہ بہاولپور جو علوم اسلامیہ کا مرکز رہا ہے اس میں ازہر یونیورسٹی کے انداز پر جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا جائے تو مجھے کوئٹہ سے بہاول پور منتقل ہونا پڑا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

جامعہ کی تشکیل چند ماہ میں ہونا تھی۔ نصاب کی تدوین، قواعد و ضوابط کی تنظیم، اساتذہ، طلباء کا انتخاب، پھر اس کے افتتاح کے اہم فرائض نے اوچ جیسی متبرک

سرزمین میں بھی بزرگانِ دین ، اولیاءِ عظام کے مزار مبارک پر حاضری کا موقع نہ دیا۔ لیکن کرم ہے کہ جب بلایا تو رحمت کے دروازے کھول دیئے ۔ جس دن میں حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ اور مخدوم بندگی محمد غوث شاہ گیلانیؒ کے دربار میں حاضر ہوا تو یکایک دل نے کہا کہ بقول حافظ رحمۃ اللہ علیہ !

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

علم و حکمت کے ان درخشندہ ستاروں میں اب بھی وہ فروزانی اور روشنی باقی ہے جو ہماری مجالس علمیہ کو منور کر سکے اور ہمارے قلب و جگر میں حصول علم کی بے پناہ تڑپ پیدا کر دے۔ ہر چند ان کے اجسام ہم سے پردہ پوش ہو گئے ہیں لیکن ان کی ارواح طیبہ آج بھی ہماری تسکینِ ایمانی کے لئے ہماری طرف متوجہ ہیں۔ ان کے بظاہر تغافل میں بھی بے شمار خبرداریاں مضمر ہیں ۔

یہ اتفاق تھا کہ دوسرے دن بہاولپور کے کمشنر جناب دربار علی شاہ صاحب بھی، جن سے میری ملاقات اکیڈمی کے دوران قیام کوئٹہ میں ہو چکی تھی، دربار میں حاضر ہوئے اور تمام کتب اور تبرکات کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی یہی تڑپ پیدا ہوئی جس سے مجھے نوازا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو دین کی محبت بھی عطا فرمائی تھی اور بزرگوں سے عقیدت بھی۔ انہوں نے آتے ہی مجھے ٹیلیفون کیا اور نہ صرف اپنے ان جذبات کا اظہار فرمایا بلکہ خواہش ظاہر کی کہ "تاریخ اوچ پر جامعہ میں کام کیا جائے ۔ جامعہ اپنی ابتدائی منازل سے گزر رہا تھا اس لئے میں نے مشورہ دیا کہ یہ کام اردو اکیڈمی بہتر طور پر انجام دے سکے گی جس کے خود شاہ صاحب سربراہ ہیں اور جس کو ایک معزز اور علم دوست سیکریٹری شہاب صاحب دہلوی کی خدمات بھی حاصل ہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ جو مدد شہاب صاحب کو درکار ہو گی، میں اس سے گریز نہ کروں گا۔

چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر اس کا پروگرام مرتب ہو گیا۔ شاہ صاحب نے

اس سلسلے میں ڈسٹرکٹ کونسل کی ایک میٹنگ طلب فرمائی اور خواہش ظاہر کی کہ اس کے سامنے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں اور "تاریخ اوچ کی ترتیب کے متعلق کمیٹی کے سامنے تجاویز پیش کروں، تمنا ان کی تھی، زبان میری، مرضی پاک پروردگار کی۔

میں نے جو کچھ اس معزز جماعت کے افراد سے عرض کیا تھا ان الفاظ کی صداقت پر آج بھی ایمان رکھتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ سرزمین اوچ عرصہ تک علم و عرفان کا گہوارہ رہی۔ ایک ایسا گہوارہ اور نورانی مرکز جو افتراق سے بلند و بالا تھا، جو عمل کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، جس کی نورانی شعاعیں اس وقت ظلمتکدۂ ہند کو منور کر رہی تھیں۔ کون جانتا ہے جامعہ اسلامیہ، بہاولپور جو اسی خطۂ پاک کے قلب میں ہے۔ پھر اختلافات سے بلند ہو کر ذہنی اور دینی الجھنوں کے موجودہ دور میں نہ صرف سرزمین پاکستان میں علوم اسلامیہ اور اسلامی اقدار کا محافظ ہو بلکہ اپنی علمی وسعتوں و تحقیقی کاوشوں سے ایک بار پھر غرناطہ، قرامطہ کی یادیں تازہ کر دے اور آنے والی نسلیں جب ہماری حکومت کی اس سعی کو دیکھیں تو دعائے خیر سے یاد کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ علم دوست حضرات اور بالخصوص اہلیانِ بہاولپور جناب دربار علی شاہ صاحب کی علم دوستی کے ہمیشہ متشکر رہیں گے کہ انہوں نے اپنے مختصر دوران قیام میں ایک اہم کام کو شروع کروا دیا جو تین سال میں مکمل ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا اجر ضائع نہیں کرتا اور اس اجر کے حق دار شاہ صاحب ہیں، جناب شہاب صاحب اور ان کے معاونین۔

جناب شہاب صاحب کی خواہش ہے کہ کتاب کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھوں تاکہ جن حضرات کے پاس وقت کم ہے ان کے لئے یہ اجمال کا کام دے سکے اور جو تفصیلات کے خواہاں ہیں ان پر مصنف کا نقطۂ نگاہ واضح ہو جائے تاکہ اگر اس کتاب میں انہیں بعض وہ چیزیں نہ ملیں جس کے وہ خواہاں ہیں تو

اسے مصنف کی لاعلمی پر نہیں بلکہ اس کے نقطۂ نظر پر محمول کریں۔

اوچ برصغیر کی ان قدیم العہد اور تاریخساز بستیوں میں سے ہے جہاں اگر ایک طرف سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانیں مرتب ہوتی رہیں اور تہذیب و ثقافت کے ان گنت نقوش ابھرتے اور مٹتے رہے وہاں علوم و فنون کے سوتے بھی یہاں سے پھوٹ کر تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے اور اسلامی تصوف و شریعت کی شمعیں جو کفر و ضلالت کے تاریک گوشوں کو منوّر کرنے کے لئے یہاں جلائی گئی تھیں۔ ایک دنیا نے ان سے اکتسابِ نور کیا۔

اس سلسلہ میں اوچ کا مدرسہ فیروزیہ خاص اہمیت کا حامل تھا جس نے برصغیر میں اس وقت اسلامی تعلیم کے فروغ و ترویج کا فرض انجام دیا جب ہند کی فضا مسلمانوں کے لئے پوری طرح سازگار بھی نہیں ہوئی تھی۔ بہ طرۂ امتیاز بھی سرزمین اوچ کے حصہ میں آیا کہ یہاں چوتھی صدی ہجری سے لے کر گیارھویں صدی ہجری تک یعنی پورے سات سو سال علمائے دین و مشائخ طریقت کا اژدحام رہا۔ ان میں متعدد بزرگان کرام تو وہ ہیں جو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے بلاد اسلامیہ سے یہاں آئے اور انھوں نے اس خطۂ سعادت انتما کو اپنی مستقل اقامت کے لئے پسند کیا اور سینکڑوں بزرگ ہستیاں وہ ہیں جو اسی خاک پاک سے اٹھیں۔ اپنے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت سے دنیا کو اپنا گرویدہ بنایا اور برس ہا برس تک تبلیغِ اسلام اور اقامتِ دین کا فرض انجام دے کر اسی جگہ آسودہ خاک ہو گئیں۔ ان بزرگوں کے متوسلین و منتسبین کا سلسلہ پورے برصغیر میں پھیلا ہوا ہے۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی خطہ ایسا ہو جہاں اوچ کے بزرگوں کا فیض نہ پہنچا ہو۔ کشمیر سے راس کماری تک اور کلکتہ سے پشاور تک جگہ جگہ ان کے نقوشِ پا ملتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اوچ ایک بستی ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان اور ہندوستان پر احاطہ کئے ہوئے تھا۔

کتاب کے مطالعہ سے جگہ جگہ مصنف کی وقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے جہاں ایک ذمہ دار مؤرخ کی طرح واقعات کو بلا کم و کاست پیش کیا ہے وہاں تاریخ کی مختلف بکھری ہوئی کڑیوں کو یکجا کرنے میں بصیرت و بصارت دونوں سے کام لیا ہے۔ مزید بر آں اوچ اور اوچ کی علمی و روحانی شخصیتوں کے متعلق جو مواد مختلف کتب میں ملتا ہے اسے زیرِ نظر کتاب میں جوں کا توں شامل نہیں کر لیا گیا بلکہ مختلف دلائل و شواہد کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ اوچ کی قدیم تاریخ پر قلم اٹھانا اس وجہ سے بہت دشوار تھا کہ اس موضوع پر مستقل و مکمل مضامین کسی تاریخی کتاب میں دستیاب نہیں ہوتے۔ اوچ ماضی بعید میں مسلسل انقلابات سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ اس لئے اس کی تاریخ کی رہی سہی کڑیاں بھی بالکل منتشر ہو گئی ہیں۔ ان حالات میں قدیم تاریخی روابط کو تلاش کرنا اور منتشر کڑیوں کو یکجا کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن یہ بات باعث مسرت ہے کہ شہاب صاحب اس دشوار گزار راستے سے بخیر و خوبی گزر گئے ہیں اور انہوں نے تحقیق و ذوقِ صحیح دونوں سے کام لے کر اس فرض سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔

کتاب کو نو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا اور دوسرا باب اوچ کی مجموعی اہمیت اور ناموں کی بحث سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں مختلف تاریخی ادوار سے بحث کی گئی ہے۔ یہ باب بذاتہٖ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بیک وقت اوچ، سندھ، پنجاب اور ملتان کی ایک مبسوط تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

علمی و روحانی شخصیتوں کا ذکر جس حزم و احتیاط اور آداب و احترام کا متقاضی تھا، فاضل مصنف نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور اسی ضمن میں انھوں نے عام تذکرہ نگاروں کی روش سے ہٹ کر بزرگوں کی

انسانی عظمت کے پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت میں اس وقت ضرورت بھی اس بات کی ہے کہ جن بزرگوں کو ہم آج واجبِ تعظیم سمجھتے ہیں ان کے متعلق دنیا کو بتائیں کہ ان کی ذات سے معاشرہ کو کیا فائدہ پہنچا۔ انسانیت کی انھوں نے کیا خدمت انجام دی اور اسلام کی ترقی و ترویج میں ان کا کیا حصہ تھا۔

"شمعیں جو باہر روشن ہوئیں" اس کتاب کا ایک اہم باب ہے۔ اس میں برّ صغیر کی ان بزرگ شخصیتوں کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اوچ کے خانوادہ ہائے تصوّف سے وابستہ تھیں اور جنہوں نے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اسلامی تبلیغ کے چراغ روشن کئے۔ اس باب کے مطالعہ سے اوچ کی علمی و روحانی عظمت کے نقوش اُبھاگر ہوتے ہیں اور قاری آسانی کے ساتھ یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جن نفوس قدسیہ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اوچ کو چار چاند لگائے۔ ان کے فیوض و برکات صرف اوچ تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ سارا ہندوستان ان کی شمعِ نورانی سے جگمگاتا رہا۔

کتاب میں اوچ کے نادر مخطوطات اور آثار و مزارات کی تصاویر شامل کر کے اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک کتاب کے عام اندازِ تحریر اور طرز نگارش کا تعلق ہے اس کے لئے اگرچہ شہاب صاحب کا نام خود اس بات کی ضمانت ہے کہ کتاب شگفتہ تحریروں کا مرقع ہو گی لیکن مجھے مسرت ہے کہ شہاب صاحب نے کتاب کو محض دلکش، دلچسپ اور جاذبِ نظر بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ادبی اور تاریخی حیثیت سے اس کو ایک دقیع اور معیاری بنانے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجرِ نیک عطا فرمائے اور اس کے فیوض و برکات سے ہمارے نوجوانوں کے قلوب کو منوّر فرمائے۔

آمین ۔

میں اس کتاب کی اشاعت پر اردو اکیڈمی بہاولپور کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جن کے ذکرِ جمیل سے اس کتاب کو مزیّن کیا گیا ہے ۔

حرفِ آغاز

تاریخ اور وہ بھی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ ایک کٹھن موضوع ہے۔ اس موضوع پر قلم اٹھانا ایک دشوار گزار مرحلہ ہے۔ یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب زیرِ بحث موضوع کسی ایسی ہستی سے متعلق ہو جو اپنی مختلف و متنوع حیثیتوں سے شہرہ آفاق رہی ہو مگر حکومتوں کی پے بہ پے تبدیلیوں اور پیہم انقلابات کی زد میں رہنے سے اس کے "تاریخی سلسلہ کی تمام کڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔ اب ان "تاریخی روابط کو تلاش کرنا اور شکستہ زنجیر کی کڑیوں کو باہم یک دگر مربوط کرنا اور اس سے ایک مسلسل کہانی تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

دوسرے بہت سے علمی موضوع ایسے ہیں جو " مائیم و زلف یار و مسلسل حکایتے" کی سہل انگاری کے متحمل ہو سکتے ہیں لیکن فن تاریخ کے تقاضوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے صرف ذوقِ خامہ فرسا کی ستم زدگی ہی کافی نہیں ہے۔ یہاں تو " چیتے کا جگر چاہئے شاہین کا تجسس" کے قبیل کا سر و سامان درکار ہے۔ ہمارے پاس تاریخ کے فن پر جو مواد دستیاب ہے وہ حد درجہ نامکمل ہے۔ ہمارا بیشتر تاریخی سرمایہ ان غیر ملکی حکمرانوں کی دستبرد کا شکار ہو چکا ہے۔ جن کا مقصد ہی استحصال تھا اور جو اپنے ناپاک سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے ہمیں ہمارے ملی ورثے کی ہر قیمتی متاع سے محروم کر گئے۔ ہمارے قومی اثاثہ کے بیش بہا نوادر انگلستان اور یورپ کے بعض دیگر ملکوں کے کتب خانوں یا عجائب

محلوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور ہم ابھی تک احساس زیاں سے محرومی کے ماتم میں مصروف ہیں۔

قسمت چناں فتاد کہ ترکان مست او
در دور ما بہ طاق نہادند جام را

ان حالات میں تاریخی موضوع پر کچھ لکھنا لکھانا ایک کوشش ناتمام کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں ایسی بہت سی بستیاں موجود ہیں بالخصوص سابقہ ریاست بہاولپور کے طول و عرض میں عہد قدیم کے آثار قدم قدم پر نمایاں ہیں جو تاریخ کا ایک دلکش باب بن سکتے ہیں۔ گرد و پیش کے حالات کی شہادت بھی یہی ہے کہ یہ مقامات زبردست تاریخی اہمیت کے حامل ہیں مگر یہی سلسلہ تاریخ کی نامرگوجی ان اسرار کی نقاب کشائی میں سدِ راہ بنتی رہی ہے۔

اوچ کی قدیم العہد بستی بھی اپنا شاندار ماضی رکھتی ہے، شاندار بھی اور عبرتناک بھی۔ ایک رنگا رنگ ماضی جو اپنے دامن میں فقر و شاہنشاہی کی داستانیں سلطنتوں کے عروج و زوال کے افسانے، تہذیبوں کے ارتقاء و تنزل کی کہانیاں، علم و فضل کی کشور کشائی کے قصے اور تصوف و روحانیت کی آفاق گیریوں کے واقعات سمیٹے ہوئے ہے لیکن ان میں تسلسل کا فقدان ہی وہ مرحلہ ہے جسے سر کرنا از بس مشکل ہے۔

اوچ کے متعلق مرتب شکل میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جو استناد کا درجہ بھی رکھتی ہو۔ لے دے کے ایک مختصر سا کتابچہ "تاریخ اوچ" ملتا ہے جو مولوی حفیظ الرحمٰن حفیظ بہاولپوری نے لکھا ہے مگر اس موضوع پر اوّلیت کا شرف رکھنے کے باوجود اس کتاب میں افسوسناک تسامحات پائے جاتے ہیں۔ بیشتر مؤرخین میں سے جن لوگوں نے برصغیر کے اس خطہ کی تاریخ پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی زیادہ معلومات افزا نہیں ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کا کچھ حال" مجمل التواریخ "

میں ملتا ہے۔ اس میں اوچ کے بارے میں بھی کہیں کہیں اشارہ کیا گیا ہے مگر کوئی واضح بات سامنے نہیں آتی۔

"چچ نامہ" وہ پہلی کتاب ہے جو ملتان و سندھ کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے لیکن یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ چچ نامہ کا مرتب اوچ کا باشندہ ہونے کے باوجود اوچ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں وُہ اپنے قیام اوچ کا مختصر سا تذکرہ ضرور کرتا ہے اور اوچ میں اس کی جس انداز میں پذیرائی ہوئی اس کا بھی کچھ حال بیان کرتا ہے مگر اوچ کی بستی کے بارے میں کچھ نہیں کہتا کہ یہ کب آباد ہوئی، اس کا حدودِ اربعہ کیا تھا اور مختلف ادوار میں اس کی تاریخی یا سیاسی اہمیت کیا رہی ہے۔

اس کے بعد "طبقاتِ ناصری" کا نمبر آتا ہے جس کا مصنف قاضی منہاج اوچ کے مدرسہ فیروزیہ کا پرنسپل رہا۔ ہرچند قاضی صاحب ایک مورّخ تھے مگر تاریخ کو وقائع نویسی کے انداز میں پیش کرتے رہے اور ایک مورّخ اور وقائع نویس میں جو فرق ہوتا ہے وُہ ظاہر ہے۔

ایک مورّخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجتہدانہ بصیرت کا حامل ہو۔ اجتہادی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہو۔ دقتِ مشاہدہ اور ذوقِ مطالعہ کا اس حد تک خوگر ہو کہ کوئی جزئی واقعہ اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ اس کی نگاہ سے اوجھل نہ رہے اور جب وہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائے تو قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا تشفی بخش جواب خود اس کے مضمون کے اندر موجود ہو۔

گرد و پیش کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کئے بغیر جو مورّخ ان پر سے سرسری طور پر گزر جاتا ہے وہ تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح جو مورّخ پیش آمدہ حالات کے منظر و پیش منظر سے پردہ نہیں اٹھاتا وہ بھی اپنے فرضِ منصبی سے کما حقہٗ عہدہ برآ

لہ "تاریخ اوچ" ۱۹۳۱ء مطابق ۱۳۴۹ھ میں محبوب المطابع دہلی میں طبع ہو کر شائع ہوئی تھی۔

نہیں ہوتا۔ ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ محض حالات و واقعات کے ذکر پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ ان کا صحیح اور غیر جانبدارانہ تجزیہ بھی کرے اور تجزیہ کا انداز سطحی نہ ہو محققانہ ہو۔ افسوس کہ محولا بالا دونوں کتابوں میں ان میں سے کسی ایک بات کو بھی ملحوظِ نظر نہیں رکھا گیا۔

تاریخ یمینی اور کتاب الہند البیرونی نسبتاً زیادہ قدیم ہیں اور سلطان محمود غزنوی کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے مصنفین اس علاقے میں بہ نفس نفیس آئے ہیں اور اس خطہ میں رونما ہونے والے واقعات سے براہِ راست متعلق رہے ہیں۔ ان سے پہلے مسعودی اور اسی قبیل کے دیگر مورخین بھی اوچ کے اطراف و نواحی سے گزرے ہیں۔ ان میں سے بعض نے باقاعدہ اس علاقے کا سروے کیا ہے مگر اوچ کے بارے میں وہ بھی خاموش ہیں۔ یاقوت حموی کی معجم البلدان میں دنیا جہان کے شہروں کا تذکرہ ملتا ہے مگر نہیں ملتا تو اوچ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ حالانکہ اوچ بڑی قدیم العہد بستی ہے۔ اگر کوئی خارجی شہادت موجود نہ ہو جب بھی علم طبقات الارض کی رُو سے اس بستی کی عمر ارض بابل و نینوا اور مصر و روم سے کسی طور کم نہیں ہے۔

اوچ پر تھوڑا بہت جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ مستشرقین یورپ کی دماغی کاوشوں کا رہینِ منت ہے۔ انہوں نے اس عقدے کو حل کرنے کی کسی قدر کوشش کی ہے کہ اوچ کا محل وقوع کیا تھا۔ اوچ مختلف ادوار میں کن داخلی اور خارجی تبدیلیوں سے دو چار ہوا اور اس کی ترارواقعی اہمیت کس عہد میں کیا رہی ہے۔ تاہم ان ساری تحقیقات کے باوجود ایک تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔

سر الیگزینڈر کنگھم نے "قدیم جغرافیہ ہند" میں اس پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ میجر راورٹی سر الیٹ اور برگز (Burgss) نے بھی اوچ کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے اور اس پر اچھا خاصا مواد مہیا کیا ہے۔

انگریزی دورِ اقتدار میں ہر علاقے کے تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی اور تمدنی حالات پر گزیٹیئر مرتب کئے گئے تھے۔ بہاول پور گزیٹیئر بھی اسی عہد کی ایک دستاویز ہے اور

اس میں اس علاقے کے متعلق کافی کچھ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ البتہ اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ بہت سے سُنے سنائے قصوں اور عوامی کہانیوں کو بھی اس مجموعہ روایات میں جگہ دی گئی ہے جس سے اس کی تاریخی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ بعض بے سرو پا اور غلط روایات بھی جو زبان زدِ عام تھیں اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ انکی چھان بین کئے بغیر ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

بعض ایسی کتابوں میں بھی ضمناً اوچ کا ذکر آیا ہے جو سرزمینِ سندھ کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ ان سے بھی اس شہر کے تاریخی حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا اور بعض عالمی معلومات کی حامل کتابوں اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا میں بھی اوچ کا تذکرہ ملتا ہے لیکن بایں ہمہ اغلاط سے کوئی کتاب بھی مبرّا نہیں ہے۔

"تاریخ اوچ" مصنفہ مولوی حفیظ الرحمٰن حفیظؔ میں واقعات اور سنین کی غلطیاں عام ہیں۔ مثال کے طور پر ایک طرف تو اس کتاب میں سیّد صفی الدین گازرونیؒ کی اوچ میں آمد کا سن ۳۰۱ ہجری بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر انہیں شہاب الدین غوری کے عہد کی شخصیت ثابت کیا گیا ہے جب کہ اس سے سنین میں پوری دو صدیوں کا فرق پڑ جاتا ہے۔

اسی طرح سید جلال الدین سرخ بخاری کی اوچ میں آمد کا سال ۱۲۴۴ھ تحریر ہے۔ مگر مخادیم بخاری کے معتبر قلمی مسوّدات کی رو سے یہ زمانہ ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ بنتا ہے

حضرت سیّد جلال سرخ بخاری کے زمانہ میں اوچ کا نام دیو گڑھ بتایا گیا ہے حالانکہ یہ بات نہ تو روایتاً کہیں ثابت ہے نہ درایتاً صحیح ہے۔ اس زمانہ میں اوچ پر راجہ دیو سنگھ کی حکمرانی کا قصہ بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ معجم الامکنہ اور امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا میں بھی دیو گڑھ اور دیو سنگھ کا افسانہ نقل کر دیا گیا ہے۔ آبِ کوثر کے مصنف شیخ محمد اکرام نے بھی اسے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

ایک جگہ "تاریخ اوچ" میں راجہ ہوڈ کی حکمرانی کا واقعہ درج ہے جس کا ایک وزیر ہچ بتایا گیا ہے۔ حالاں کہ ہچ راجہ ساہس دوم کا وزیر تھا اور راجہ ہوڈ نام کا کوئی حکمران

تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ راجہ بوڈ کا یہ قصہ تاریخ اوچ میں بہاول پور گزیٹیئر کے حوالہ سے درج ہے۔ نقل اور اصل دونوں بے اصل اور خلافِ واقعہ ہیں۔ اوچ کے ناموں کی بحث میں بھی تاریخ اوچ میں بہت سے اغلاط اور اسقام موجود ہیں جن کی نشاندہی ہم نے متعلقہ ابواب میں کر دی ہے۔

سر الیٹ کی تاریخ المورخین (History of Historians) میں راجہ آیند بن کفند کی بابت جہاں یہ لکھا گیا ہے کہ اس نے اپنے ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ایک اسکلنداوسا تھا اور ایک صوبے کا نام انجا تھا وہاں دونوں علاقوں کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک مقام اوچ تھا گویا کسی فیصلہ کن نتیجے پر وہ بھی نہیں پہنچ سکے۔

سر الیگزینڈر کننگھم نے قدیم "جغرافیہ ہند" میں اوچ کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہی وہ شہر ہے جسے اسکندر رومی نے دریاؤں کے سنگم پر بسایا تھا اور اپنے نام پر اس کا نام "اسکندریہ" رکھا۔

کنگھم کی اس بات کی توثیق کسی مستند اور معتبر روایت سے نہیں ہو سکی تاہم "معجم البلدان" میں ٹھیک اسی مقام پر اسکندریہ شہر کے محل وقوع کا ذکر موجود ہے لیکن معجم البلدان اوچ کے متعلق خاموش ہے۔

امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا نے سر کنگھم کی اس روایت کو دلچسپ مگر ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ میجر راورٹی نے امکان کی حد تک اس نظریہ کو تسلیم کیا ہے کہ اوچ اسکلندہ اور اسکندریہ غالباً ایک ہی بستی کے مختلف نام ہیں (مہران اور اس کی شاخیں)۔

ظن و تخمین کی اس فضا میں اوچ کے متعلق روایات کی توثیق اور صحت و عدم صحت کی جانچ پڑتال کوئی آسان کام نہ تھا۔ اپنا ایک عظیم الشان ماضی رکھنے کے باوجود اوچ کی تاریخ پر خمول و گمنامی کی جو تہہ در تہہ گرد جمی ہوئی ہے اس کو صاف کرنے کے لئے آج سے پانچ سات سو یا ہزار برس پہلے کا دور زیادہ موزوں تھا مگر افسوس کہ اس دور میں یہ کام تشنۂ تکمیل رہا۔

اردو اکیڈمی بہاولپور مدت سے اس موضوع پر کوئی تحقیقی کتاب شائع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن وسائل کی کمی اور خاطر خواہ سرمایہ کی عدم موجودگی اس کی راہ میں سنگِ گراں بنی رہی ۔ آخر سابق کمشنر بہاول پور ڈویژن جناب سید دربار علی شاہ صاحب جو اکیڈمی کے صدر بھی تھے ۔ ان کی خصوصی دلچسپی کے باعث یہ مسئلہ حل ہوا اور ڈسٹرکٹ کونسل بہاول پور نے اس علمی و تحقیقاتی کام کی تکمیل کے لئے مالی امداد منظور کی ۔

یہ مالی امداد بھی شاید کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوتی اگر اس مرحلہ پر ڈاکٹر سیّد حامد حسن بلگرامی صاحب، رئیس الجامعہ ، جامعہ اسلامیہ ، بہاول پور جیسی علمی شخصیت کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی ۔ صاحب موصوف کی علمی رہنمائی کے نتیجے میں نہ صرف تحقیق و تدقیق کی نئی نئی راہیں سامنے آئیں بلکہ کتاب کی ترتیب و تدوین میں افادی اعتبار سے بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ۔

سید دربار علی شاہ صاحب کے تبادلے کے بعد اردو اکیڈمی کی صدارت کے فرائض جناب غلام یزدانی ملک صاحب کمشنر بہاول پور ڈویژن کے سپرد ہوئے تھے ۔ اس لئے قدرتی طور پر اکیڈمی کے زیر تکمیل کاموں میں ان کی دلچسپی و حمایت کا حصول ناگزیر تھا اور یہ بات باعث تشکر و امتنان ہے کہ صاحبِ موصوف نے نہ صرف اس منصوبے کی تکمیل میں اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرمایا بلکہ کتاب ہٰذا کو زیادہ سے زیادہ وقیع و مفید بنانے کے لئے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا ۔

زیر نظر کتاب تاریخ کے جدید اسلوب پر لکھی گئی ہے اور اس میں محض واقعات کو جوں کا توں پیش کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر بات حوالہ، ماخذ اور سند کے ساتھ لکھی گئی ہے اور جہاں اسناد کی سہولت میسّر نہیں تھی وہاں صرف وہی بات کہی گئی ہے جو دیگر روایات کے مقابلے میں زیادہ قرین قیاس ہو اور بداہت عقل اور اصول درایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہو ۔

کوشش یہ کی گئی ہے کہ قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے دوران کسی ذہنی خلش میں مبتلا نہ ہونے پائیں اور ان کے اذہان میں پیدا ہونے والے ہر الجھاؤ کا حل

خود کتاب کے اندر موجود ہو۔ اسی طرح یہ کتاب صرف اوچ کی تاریخ نہیں رہی بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسی دائرۃ المعارف کی ہو گئی ہے جو بیک وقت کئی علوم کی جامع ہو۔ یہ سندھ کے خطہ کی ایک مستند تاریخ بھی ہے اور اس علاقہ کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کی سیاسی، طبعی، جغرافیائی اور علمی و ادبی کوائف و حالات پر سیر حاصل مواد بھی پیش کرتی ہے۔

تاریخ اوچ کے وہ ابواب جن پر امتدادِ زمانہ کی گرد جمی ہوئی ہے، ان کے دھندلے نقوش کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں جس قدر تحقیقی مواد مل سکتا تھا اس سے استفادہ کئے بغیر نہیں چھوڑا گیا۔ دوران تحقیق صرف کتابی علم پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ وجدان کو بھی کہیں کہیں مشعلِ راہ بنایا گیا ہے لیکن اس حد تک جس حد تک ایک مورخ کے لئے اس کا سہارا لینا ناگزیر ہوتا ہے۔

شاید اس بات پر کچھ لوگ چونکیں اور سوچیں کہ تاریخ کا وجدانیات سے کیا تعلق ہے لیکن ایک بالغ نظر مورخ واقعات کی نا مربوط کڑیوں کو آپس میں ملانے کے لئے جہاں اور بہت سے خارجی سہارے تلاش کرتا ہے وہاں اسے اپنی فراست و بصیرت کی آنکھیں بھی کھلی رکھنا پڑتی ہیں۔ اس داخلی سہارے کے ذریعہ جب وہ کسی خاص نکتہ تک رسائی حاصل کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ معاملہ کی پوری نوعیت جو وہ پیش کر رہا ہے سو فیصد صحیح ہو تاہم تاریخ کے ایک طالب علم اور ایک متلاشی حق کی حیثیت سے وہ خود اپنے ذہن کو اور دوسرے بہت سے ایسے ذہنوں کو جو حقیقت کے جویا ہوں، کسی حد تک مطمئن کرنے کا سر و سامان ضرور مہیا کر لیتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ فنِ تاریخ میں اس نہج پر بہت کم کام ہوا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس سے مانوس نہ ہوں اور وہ کتاب کے بعض مندرجات کو "دور کی کوڑی لانے" کے مترادف سمجھیں لیکن مستشرقین یورپ اور دیگر مغربی مورخین کی فنی کتابیں جن کی نظر سے گزری ہیں یا ماضی قریب کی ایک بزرگ علمی شخصیت سید سلیمان ندوی کی تاریخی کتابوں کا جن حضرات نے مطالعہ کیا ہے

وہ اس اسلوب کو یقیناً نظرِ استحسان سے دیکھیں گے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجتہاد و استنباط کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو کیوں کہ اس کے بغیر تاریخ کی بھول بھلیوں میں سے باہر نکلنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ بالخصوص تاریخ کے گم شدہ اوراق کی بازیافت تو بڑی حد تک ایک ذوقی چیز ہے اور ذوقِ سلیم کی رہنمائی کے بغیر اس راہ میں ایک قدم آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی دردسری بھی اپنی جگہ موجود ہے لیکن یہ خطرہ مول لئے بغیر اس گھاٹی کو کوئی سر نہیں کر سکتا اور اس کٹھن کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے تب کہیں حقائق تک رسائی ہوتی ہے۔

اوچ کی قدامت کے بارے میں ہم نے تفصیلی بحث کی ہے اور فکر و نظر کے لئے بحث کے کئی نئے پہلو تلاش کئے ہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ اوچ بہت پرانی بستی ہے لیکن اس کے ماضی بعید کے آثار دھندلا گئے ہیں اور وقت کے بے رحم ہاتھوں نے یہ نشانِ عبرت بھی بہت کچھ مٹا دیئے ہیں۔ ہم نے جہاں ان آثار کی کھود کرید میں کافی تحقیق و تجسس سے کام لیا ہے وہاں محکمہ آثارِ قدیمہ کی غفلت شعاری بھی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ اوچ کی کہنگی اور اس کی تاریخی اہمیت پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں قیاسات کا بڑا دخل ہے۔ ہمیں کسی مستند تاریخی کتاب میں اوچ سے متعلق ایسا ٹھوس مواد دستیاب نہیں ہوا جو پانچ ہزار برس قبل کے اوچ کی عظمت کا صحیح نقشہ ہماری نظروں کے سامنے اجاگر کر سکے اس لیے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی حقیقت پر ہمارے پاس کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہے۔ البتہ بعض نوشتوں اور حجری کتبوں سے ہمارے قیاسات کی تائید ہوتی ہے اور انہیں ہم نے اوراق میں شرح و بسط سے پیش کر دیا ہے۔

اوچ سے متعلق ایک اہم باب وہ ہے جس میں اوچ کی روحانی یا علمی شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب تک بزرگ شخصیتوں کے بارہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں کا دستور یہ رہا ہے کہ وہ ان کے باب کرامات پہ سارا زورِ بیان صرف کرتے رہیں اور ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ متعلقہ شخصیت کو مافوق البشر ہستی ثابت کیا جائے۔ ہم

نے اس پہلو سے دانستہ گریز کیا ہے اور کرامات کے موضوع کو بہت کم چھیڑا ہے، اس لئے نہیں کہ بزرگانِ دین کی حیات مبارک کا یہ پہلو کچھ اہم نہیں بلکہ بعض روائتیں جوشِ عقیدت کی رہین منت ہوتی ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت سے ان کا کس حد تک واسطہ ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر اس باب میں یہ رہا ہے کہ انسانوں کے بارے میں جب بھی گفتگو کی جائے تو صرف انسانی عظمت کا پہلو نمایاں ہونا چاہئے ان بزرگان دین سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا، خود ان کے معاشرے کو ان کی ذات سے کیا کچھ حاصل ہوا۔ ان کی دینی، مذہبی اور سماجی خدمات کیا تھیں۔ یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے ایک سبق حاصل ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کی قرار واقعی حیثیت کا پتہ چلتا ہے اور ان کی علمی اور روحانی عظمت کا نقش دلوں پر ثبت ہوتا ہے۔

اوچ سے نسبت رکھنے والے بزرگ اس برصغیر کے شرق و غرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس برصغیر سے باہر بھی ایک دنیا ان کی مرید و معتقد ہے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جنہوں نے اس خانوادہ عالی نسب سے اکتساب فیض نہ کیا ہو۔ ان سب بزرگوں کے حالات قلم بند کرنا اور ان شخصیتوں کی فکر رسا کا احاطہ کرنا بہت دشوار تھا اس کے لیئے وقت سے زیادہ مجھے اپنی بے سرو سامانی کا احساس ہے۔ میں نے صرف ان چیدہ چیدہ شخصیتوں سے متعارف کیا ہے جن کی حیثیت اپنے ہمعصروں میں کسی قدر ممتاز تھی اور جن کی وجہ سے سلسلۂ طریقت کو فروغ نصیب ہوا یا جن کی دینی اہمیت کے ساتھ ساتھ انہیں دنیاوی وجاہت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ تعارف کا انداز بھی اختصار کا پہلو لیئے ہوئے ہے اور اجمالی ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے

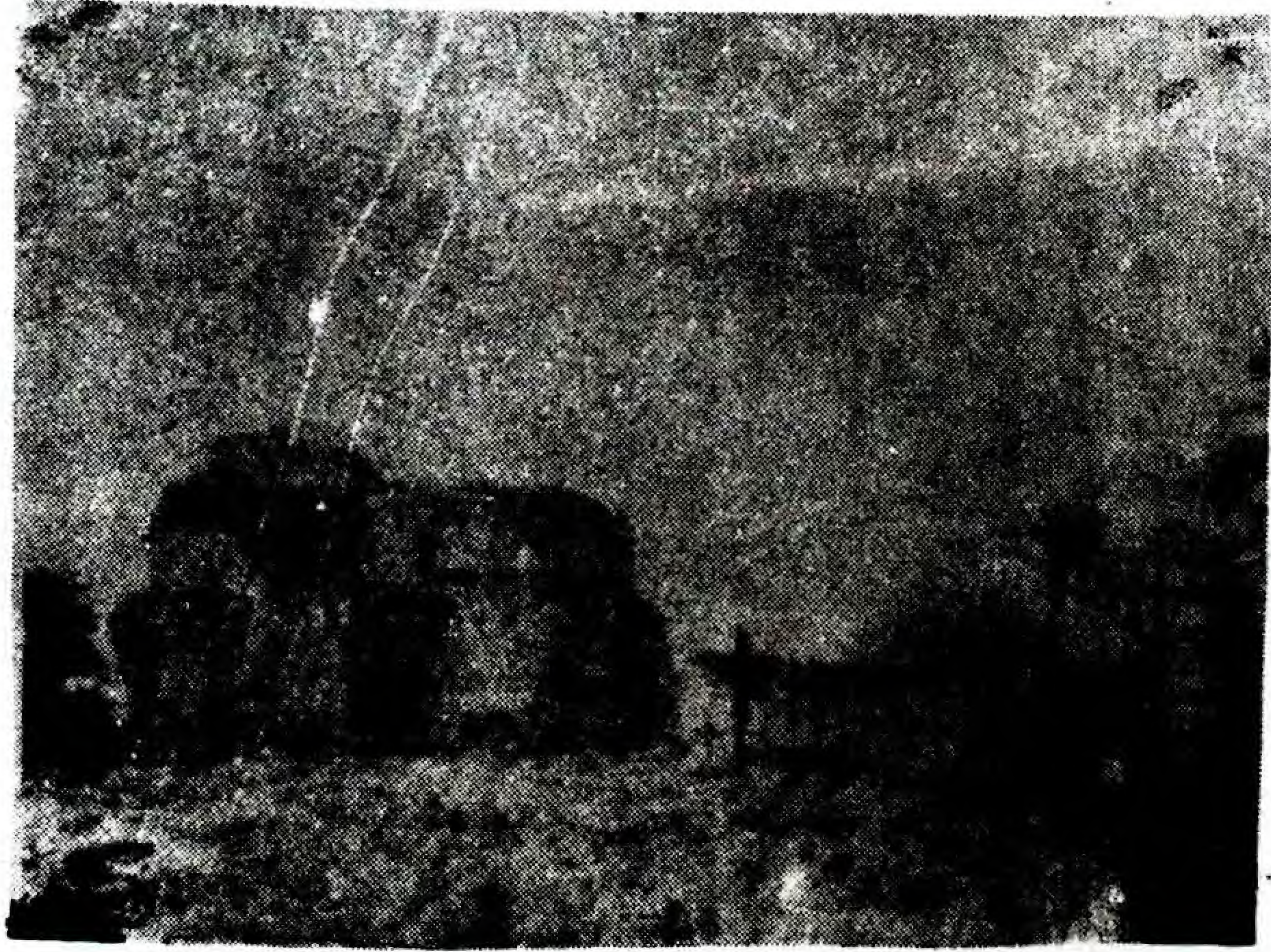
اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں گیلانی اور بخاری حضرات کے بیش قیمت مخطوطات سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ اوچ کے خلیفہ خاندان کے پاس جو قلمی مسودات ہیں ان سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض نادر و نایاب تاریخی مطبوعات بھی ہمارے پیش نظر رہی ہیں۔ اوچ سے متعلق شاہی

قرائن و توقیعات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو ڈھیروں کی تعداد میں اوچ کے ان قدیم روحانی خاندانوں کے پاس موجود ہیں۔

کتاب میں اوچ کے آثارِ قدیمہ سے متعلق بعض تصاویر بھی شاملِ اشاعت ہیں جن سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ بعض مخطوطات کی تصاویر سے بھی کتاب مزین ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم اپنی بے بضاعتی کے باوجود جو کچھ مواد جمع کر سکے ہیں وہ حقائق کی نقاب کشائی میں معاون ہو اور قارئین کرام ان بزرگوں کے دینی و روحانی فیوض سے محروم نہ رہیں۔

مسعود حسن شہاب



اُدچ شریف کے کھنڈرات

باب اوّل

اوچ شریف

اندلس کی تباہی و بربادی پر اس عہد کے مشہور شاعر صالح بن شریف رندی نے جو درد انگیز مرثیہ کہا تھا، اس کا ایک شعر ہے۔

یمزق الدھر حتما کل سابغۃ

ان کان ذی یزن والغمد غمدان

یعنی زمانہ ہر تلوار کے لوہے کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے خواہ وہ "ذی یزن" کی تلوار ہو اور اس کی نیام "غمدان" کا سنگین و مستحکم حصار۔

اس شعر کے مصداق زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے کتنے ہی بھرے پرُے شہروں کو برباد کر دیا۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جہاں کہیں عالیشان اور عظیم الشان عمارات تھیں آج وہاں مٹی کے تودے اور ریت کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح اس برّصغیر پاک و ہند میں بھی ایسے بہت سے شہروں کے نشانات ملتے ہیں جو ہزاروں سال اپنی آبادی کی بہار دکھانے کے بعد ایسے خزاں رسیدہ ہوئے کہ پھر کبھی ان کا باغ وجود لہلہا نہ سکا۔ انہیں میں کچھ ایسے شہر بھی ہیں جنہیں امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹنے کے باوجود یہ شرف حاصل ہے کہ وہ نہ صرف ہماری سیزدہ صد سالہ تاریخ کی شاندار روایات کو اپنے دامن میں

سمیٹے ہوئے ہیں اور ہماری ملی عظمتوں اور قومی رفعتوں کے آئینہ دار ہیں بلکہ نسل انسانی کی تاریخ میں ان شہروں کو سنگ میل اور نشانِ منزل کی اہمیت حاصل ہے۔ اسی قسم کی ایک بستی اوچ شریف ہے جو سابقہ ریاست[1] بہاولپور کا ایک اہم تاریخی، روحانی اور مذہبی مقام اور عظیم روایات کا حامل ایک ایسا شہر ہے جو آج سے کم و بیش تین ہزار سال پیشتر بہت بڑا تجارتی اور فوجی مرکز تھا اور آج ویرانوں، کھنڈروں، شکستہ قبروں، کہنہ دیواروں اور بوسیدہ عمارتوں کی عبرت سرائے بن چکا ہے۔

یہ شہر سابقہ ریاست بہاولپور کی حدود میں چناب اور راوی کے سنگم کے قریب ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہ سیاست، تمدن، تجارت اور علم و آگہی کا گہوارہ تھا۔ سیاحوں نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، فاتحین نے یہاں ڈیرے ڈالے۔ راجاؤں، مہاراجاؤں اور امرا و سلاطین کے عروج و زوال کی داستانیں اسی سرزمین پر مرتب ہوتی رہیں۔ علم و عرفان کے سوتے یہاں سے پھوٹے، روحانیت کے چشمے یہاں جاری ہوئے اور وہ کونسی دنیا کی دولت اور علم و عرفان کی نعمت تھی جو اس کے حصہ میں نہیں آئی۔ پھر یہ سلسلہ صرف دس بیس یا سو دو سو سال تک ہی نہیں بلکہ ہزاروں سال قائم رہا۔ لیکن جب انقلاب وقت کا ہتھوڑا چلا تو اس کی عظمت و رفعت کا ڈھانچہ مسمار ہو کر رہ گیا۔ تمام آب و تاب مٹی میں مل گئی اور روحانی و مادی خوش اسلوبیوں کا جتنا رنگ و روغن تھا سب اتر گیا۔ اب یہاں نہ تجارت کی گرم بازاری ہے نہ علم و معرفت کی ہنگامہ پروری۔ نہ طبل و علم کی شور افگنی ہے۔ نہ تصوف و روحانیت کی مسند آرائی۔ البتہ اس کی ایک خصوصیت جو لیل و نہار کی لاکھوں گردشوں میں سے گزرنے کے باوجود آج بھی قائم و برقرار ہے۔ وہ اس کی وہ دائمی شہرت

---

[1] عباسی خاندان کی ایک شاخ داؤد پوترا کے حکمران نواب صادق محمد خاں عباسی اول نے سنہ ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۲۷ء میں ریاست بہاول پور کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۵ء میں پورے مغربی پاکستان کے ون یونٹ بن جانے کی وجہ سے اس کی علیحدہ حیثیت ختم ہو گئی اور یہ صوبہ مغربی پاکستان کا ایک حصہ بن گئی۔

ہے جو ہر زمانہ میں نمایاں رہی اور لیل و نہار کی گردشیں اس کے وجود کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے محو کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ جب اس کی مادی شان و شوکت کی رونقیں ختم ہوئیں تو اس کی آغوش روحانیت کے ان گنج ہائے گراں مایہ کے لئے وا ہو گئی۔ جن سے اس دھرتی کی ساکھ قائم ہے۔

کیا ہوا اگر اس کی وہ مرکزی اہمیت باقی نہ رہی جب وہ ایک بہت بڑی سلطنت کا دارالحکومت اور صدر مقام تھا۔ اس کے لئے یہ امتیاز کیا کچھ کم اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ان اہل اللہ کی آرام گاہ قرار پائی جو دلوں کی دنیا کے فاتح اور حکمران تھے اور جن کی فتح و تسخیر کی جہانگیریوں کے سامنے کجکلاہوں کی گردنیں ختم ہوتی رہیں اور جن کی بارگاہ فقر و استغنا میں بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہیبت حق کے جلال سے لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے۔ گویا اوچ کی سرزمین آج بھی بڑے فخر و ناز سے یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ مشہور ایرانی شاعر علی حزیںؔ کے ان اشعار کا حقیقی مصداق وہی ہے۔

زبان دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم ‏ ‏ ‏ ‏ ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیںؔ از پائے رہ پیما بسے افسردگی دیدم ‏ ‏ ‏ ‏ سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا

اوچ کی قدامت

اوچ کا سرسری جائزہ لینے سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ نیرنگئ زمانہ نے کئی بار اس شہر کو اجاڑا ہے اور حادثات وقت کے تھپیڑوں نے بار ہا اسے پامال کیا مگر ہر بار ققنس کی طرح یہ ایک نیا جنم لیتا رہا ہے۔ یہ خصوصیت بھی اس شہر کے مقدر کا طرۂ امتیاز ہے کہ جہاں اس کے در و دیوار تغیرات و انقلابات کا شکار ہوتے رہے ہیں وہاں اس کا نام بھی تبدیلی کے اس حادثے سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ زمانہ قبل از مسیح میں بیسیوں فاتحین اور طالع آزما حکمرانوں نے اس سرزمین کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا اور ہر نامور فاتح نے اس شہر کے محل وقوع اور اس کی سیاسی و جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر اپنے نام کو زندہ جاوید بنانے کے لئے اس شہر کی عظمت کا سہارا ڈھونڈا۔

اوچ کی بستی کب بسائی گئی اور کون لوگ تھے جنہوں نے اسے پہلے پہل آباد کیا۔ اس کے بارے میں تاریخ حتمیت کے ساتھ کوئی بات بتانے سے قاصر ہے البتہ آثار و قرائن کی رُو سے جو قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں ان کی بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آریاؤں کی آمد سے بہت پہلے اس شہر کی بنیاد پڑی اور یہاں اس تہذیب نے ابتدا میں جنم لیا جس کے ڈانڈے اس برّصغیر میں ہڑپہ اور موئن جوڈیرو سے اور عراق میں سمیری تہذیب سے ملے ہوئے تھے۔

علم الآثار اور حفریات کے ماہرین نے ہڑپہ اور موئن جوڈیرو کو ایک ہی تہذیب کی عملداری کے تابع قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے جب ہڑپہ اور موئن جوڈیرو جس کے درمیان چار سو میل کا فاصلہ ہے۔ ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو سکتے ہیں تو اوچ بھی اس کل کا ایک جزو کیوں نہ ہو گا۔

اوچ اور اس کے اطراف و جوانب کے علاقوں سے جو آثار قدیمہ اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اوچ کی قدامت موئنجوڈیرو اور ہڑپہ سے کسی صورت کم نہیں ہے۔

اوچ تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی لحاظ سے مملکتِ سندھ میں شامل ہے اور سرزمینِ سندھ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود نسل انسانی کی اپنی تاریخ۔ یہ وہ علاقہ ہے، جہاں انسانی تہذیب و تمدن کا چراغ اس وقت روشن ہوا جب ابھی فطرت کے بہت سے اسرار مخفیہ کی نقاب کشائی بھی نہیں ہوئی تھی اور دھرتی اپنے رازوں کو اپنے سینے میں چھپائے انسانی عزم و ہمت کی آزمائش پر تلی ہوئی تھی۔

آریاؤں کی آمد سے بہت پہلے یعنی آج سے کم و بیش پانچہزار سال قبل وادیٔ سندھ اپنی ایک مخصوص تہذیب رکھتی تھی جس کے ڈانڈے عراق کی سمیری تہذیب سے ملے ہوئے تھے اور سرزمین بابل کی طرح یہاں کا تمدن بھی پورے عروج پر تھا۔ وادیٔ فرات کا جنوبی حصہ جہاں اب بغداد واقع ہے، سُمّر کہلاتا تھا۔ یہاں ایک قدیم بستی

لہ ضمیمہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا از مورٹیمر وہیلر

سه سندھ پر پانچویں صدی ہجری میں ایک خاندان سومرو کی حکومت کا سراغ ملتا ہے۔ ان کے بارے میں مورخ کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ یہ دراصل کون لوگ تھے۔ بعض عرب مورخین نے انہیں عربی النسل ثابت کیا ہے۔ مغربی مورخوں کے نزدیک یہ راجپوت تھے جو اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے مگر ان کے نام اور ان کی تہذیب و معاشرت ہندوانہ رہی۔ کچھ بعید نہیں اگر یہ لوگ سمیری نسل کے بقیتہ السیف ہوں اور وادیٔ بابل کے علاقہ سمر کی نسبت سے "سومرو" کہلاتے ہوں۔

"تل اسمار" کے کھنڈر ملے ہیں جو وادیٔ سندھ کے مشہور کھنڈراتی شہر موئن جو ڈیرو سے گہرے علاقائی رابطے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

ان دونوں پرانی تباہ شدہ بستیوں سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں اور ان بستیوں کے فن تعمیر میں جو مماثلت اور یک رنگی پائی جاتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں علاقے ایک ہی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں موئن جو ڈیرو سے جو مجسمے اور بت برآمد ہوئے ہیں ان کی ڈاڑھی اور بالوں کو بنانے کا طریقہ اور سر پر رومال باندھنے کی رسم سمیری تہذیب سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔

علم الآثار کے ایک ممتاز عالم ڈاکٹر فرینک فورٹ کی تحقیق کے مطابق "تل اسمار" "موئن جو ڈیرو" اور ہڑپہ ایک ہی تہذیبی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو "تل اسمار" سے ایک ایسی مہر ہاتھ لگی ہے جس پر موئن جو ڈیرو کے بیل کے مجسمے جیسی شکل بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح شاہان اُر کے مقبروں سے بھی ایک ایسی مہر دستیاب ہوئی ہے جو موئن جو ڈیرو سے برآمد ہونے والی مہروں سے مشابہ ہے۔ موئن جو ڈیرو کی قدیم عمارتوں میں جس قسم کا مسالہ (E umen,) استعمال ہوا ہے وہ ان تہذیبوں کے درمیان باہمی تعلق کی تائید مزید کرتا ہے۔

یہ مسالہ موئنجو ڈیرو کے بڑے حوض میں دیواروں کے درمیان اور فرش کے نیچے استعمال کیا گیا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرینِ فن کی رائے میں وادیٔ سندھ میں اس ٹیوین کا رواج بھی سمیریوں کا رہینِ منت ہے کیونکہ یہاں کے لوگ اس سے واقف نہیں تھے۔ جب کہ عراق میں اس کا استعمال عام تھا۔ یہ مسالہ عمارت کو پانی اور نمک کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

سمیری تہذیب کا خاتمہ غالباً دراوڑیوں کے ہاتھوں ہوا جو اس سے پیشتر بحیرۂ روم

سلہ سندھ کے مشہور شہر اُدر اور عراق کے قدیم شہر اُر میں جو لفظی مماثلت پائی جاتی ہے وہ بھی اس امر کی غماز ہے کہ یہ دونوں علاقے باہم یک دگر مربوط تھے۔

کے کنارے آباد تھے اور کسی حادثے کی بناء پر یا جذبہ توسیع پسندی کے تحت ہندوستان آئے۔ یہ لوگ بھی پہلے پہل سندھ میں آکر آباد ہوئے۔

سندھ میں بولی جانے والی ایک زبان بروہی بھی ہے جس کے بولنے والے اب بھی کہیں کہیں سندھ میں ملتے ہیں اور بلوچستان میں تو ان کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے۔

بروہی بولی دراوڑیوں کی زبان سے ہم آہنگ ہے۔[1] فادر ہیرس نامی ایک ماہر آثارِ قدیمہ نے موئنجوڈیرو کے برآمد کتبات کی تعبیر دراوڑی زبانوں کے مروّجہ رسم الخط کے ذریعہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ لوگ دراوڑ تھے۔ دراوڑ قوم ہی کی ایک شاخ مید ہے جو سندھ کی قدیم ترین اقوام میں شمار ہوتی ہے۔ آریاؤں کی آمد کے بعد ان لوگوں کی غالب اکثریت جنوبی ہند کی طرف نقل مکانی کر گئی۔ مدراس (Madras,) جو آریاؤں سے قبل کی قوموں کا مرکزی علاقہ ہے اسی مید قوم کے نام سے منسوب ہے۔[2]

سندھ کی تہذیب پر دراوڑیوں کے اثرات کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ موئن جو ڈیرو اور ہڑپہ کے مقام پر جو قدیم قبریں دریافت ہوئی ہیں وہ دکن اور جنوبی ہند کی قبروں سے جہاں دراوڑی قومیں اب تک آباد ہیں بالکل مشابہ ہیں۔[3]

دراوڑی قوموں کا اثر و نفوذ آریاؤں کی آمد کے بعد ختم ہو گیا۔ یہ عظیم قوم جو وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئی تھی سب سے پہلے سندھ میں سکونت پذیر ہوئی اور رفتہ رفتہ اپنی طاقت اور ملک گیری کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے یہاں کی دوسری

---

[1] ہسٹری آف انڈیا از سر ایچ۔ ایم ایلیٹ صفحہ ۱۲۲

[2] "قدیم ہندوستان" "Aryan Rule in India"
– pp. 34 - 38 by E. B. Havell

[3] "ویدک ہند" از زیڈ۔ اے راگوزن صفحہ ۹۸ باب چہارم

[4] عرب ہند تعلقات از سید سلیمان ندوی

قوموں کو مغلوب کرتی ہوئی تمام ہندوستان پر چھا گئی۔ ان کی آمد کا زمانہ تین ہزار سال قبل از مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ یہ لوگ پانچ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور وید کی روایت کے مطابق جسے آریا اپنی الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ اس مناسبت سے ان کو "پنج جنا" کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی سکونت کے لئے پانچ دریاؤں کے سنگم کو پسند کیا۔ وید کی عبارتوں میں "وتاستا" (جہلم) اور "آسکینی" (چناب) کے ملاپ سے پیدا ہونے والے عظیم دریاؤں کو "چندرا بھاگا" کہا گیا ہے۔ اس "چندرا بھاگا" دریا سے "اروتی" (راوی) "شوتدری" (ستلج) اور "ویاس" (بیاس) کا جہاں ملاپ ہوتا ہے وہاں آریا قوم کی ایک بہت بڑی بستی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح قدیم کتابوں میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ آریاؤں نے سب سے پہلے "پنج ناد" کے علاقے میں ایک منظم حکومت کی بنیاد رکھی جو بڑھتے بڑھتے وادیٔ گنگا تک پھیل گئی۔

رگ وید۔ مہا بھارت۔ رامائن اور بعض دوسری قدیم مذہبی کتابوں میں پنچال نام کی ایک ریاست کا بھی بار بار ذکر آیا ہے جو غالباً پنج ندی کے مترادف ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پنچال کی ریاست کا ایک نام کرویتی بھی تھا۔ رگ وید کی تصریح کے مطابق یہ علاقہ سندھو (دریائے سندھ) اور آسکینی (چناب) کے درمیان واقع تھا۔ مہا بھارت اردو ترجمہ (صفحہ ۲۴) میں پانچال کے علاقہ کو دھرت راشٹر کے بیٹے دریودھن کے قبضے میں بتایا گیا ہے۔ اس نے یہ ریاست اپنی بہن رانی دھسلا کو بخش دی تھی۔

لہ وادی سندھ کی ایک ندی کا نام 'کری واہ' ہے۔

اسلامی عہد میں محمد بن قاسم کی فوجوں کا ایک زبردست مقابلہ سندھ کے راجہ داہر سے اس ندی کے پار بھی ہوا تھا۔ یہ واقعہ بروز بدھ ۹۔ رمضان ۹۳ھ کا ہے۔ اسی طرح وادی سندھ میں کو د بار نے ایک پہاڑ نہ سندھ یا م کر دبھی آتا ہے۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے تاریخ سندھ۔ مصنفہ ابو ظفر ندوی مرحوم)

رگ وید میں دریائے سندھ کی عظمت کا بار بار ذکر آیا ہے اور اس کے کنارے بسنے والوں کی خوشحالی کی خبر دی گئی ہے چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے۔

"چمکنے والی، درخشاں، عالیشان، ناقابل تسخیر سب ندیوں سے زیادہ اس میں پانی ہے خوبصورت ابلق گھوڑے کی طرح حسین ہے"[1]

"وہ سندھو تیزی کے ساتھ آتی ہے۔ دوسری ندیاں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ سرسوتی ندیوں میں وہ سب سے پاک ہے۔ وہ پہاڑوں سے آ کر سمندر میں گرتی ہے۔ دنیا کے لئے دولت و فلاح لے کر آتی ہے۔ جو لوگ اس کے کنارے آباد ہیں ان کے لئے اس کے پانی میں دودھ اور شہد ہے"[2]

قدیم آرائی شہروں کے محل وقوع کے متعلق یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہ بستیاں عموماً دریاؤں کے کنارے ایسے مقامات پر بسائی گئی تھیں جہاں دو یا زیادہ دریاؤں کے سنگم کے نزدیک تکونی علاقہ واقع تھا۔

وی۔ اے سمتھ نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ ہند" میں اس نظریہ کی تصدیق کی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے پاٹلی پتر (پٹنہ) کی مثال پیش کی ہے جو دریائے سون اور گنگا کے سنگم کے قریب ایسے علاقہ میں بسایا گیا تھا جو تکونی شکل کا تھا۔[3]

اوچ کا محل وقوع بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ بستی آریاؤں کے بالکل ابتدائی عہد میں بھی موجود تھی۔ اس لئے کہ اوچ دریائے گھاگھرا[4] کے کنارے آباد ہے اور دریائے گھاگھرا رگ وید کے بیان کے مطابق "ان سات ندیوں میں سے ہے

---

[1] ویدک ہند

[2] رگ وید بحوالہ ویدک ہند صفحہ ۲۰۴ باب ۷

[3] وادیٔ سندھ کے اس گم شدہ دریا کے بارے میں مورخین کی رائے یہ ہے کہ وہ اٹھارہویں صدی تک سابق ریاست بہاول پور میں بہتا رہا ہے اور آج جہاں وسیع ریگستان ہے وہ علاقہ اس دریا کی گزرگاہ کے قریب واقع ہونے

جن کے کنارے آریا پہلے پہل آکر آباد ہوئے اور جنہیں وہ اپنے گیتوں میں پیار سے ساتِ بہنیں یا سات مائیں کہتے تھے۔"

کے باعث نہایت سرسبز و شاداب خطہ تھا۔ اس زمانہ میں صحرا کی وسعت چشم حسود کی طرح تنگ تھی اور آج جہاں حد نگاہ تک ریت کے تودے اور مٹی کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں وہ کسی زمانہ میں لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور مسکراتے ہوئے مرغزاروں کی ایک جنت شاداب تھی۔

"اینشنٹ ہسٹری آف انڈیا" کے مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

وہ وسیع صحرا جو راجپوتانہ اور سندھ کے بہت بڑے علاقہ پر محیط ہے پرانے زمانہ میں نہایت محدود تھا۔ اس وقت ہاکڑہ یا دریندہ نامی دریا (دریائے گھاگھرا کے دوسرے نام) ریاست بہاولپور میں سے گزرتا تھا اور اپنی مختلف سمتوں کو پھوٹتی ہوئی نہروں کے ذریعہ وسیع علاقہ کو سیراب کرتا تھا۔

اسلامی عہد میں یہ دریا سندھ اور ہندوستان کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا تھا۔ یہ دریا اٹھارھویں صدی عیسوی میں بالکل غائب ہوگیا لیکن اس کی قدیم گزرگاہ اور اس گزرگاہ کے کنارے پر آباد تباہ شدہ شہروں کے کھنڈر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ٹاڈ (Tod,) نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "تاریخی روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ علاقے جو بنجر اور ویران ہو چکے ہیں اور وسیع و عریض ریگستان بن گئے ہیں دریائے ہاکڑا کے خشک ہو جانے کے باعث ان پر یہ آفت نازل ہوئی"۔ (وقائع بیکانیر)

چولستان کا علاقہ دریائے ہاکڑا یا گھاگھرا کے شمال مغرب میں واقع ہے اور یہ زبردست صحرا ایک زمانہ میں پوری طرح آباد تھا۔ پرانی بستیوں کے آثار قدیمہ اس علاقہ میں اب تک دستیاب ہیں۔

دریائے ہاکڑا یا گھاگھرا کے منبع، اس کی قدیم گزرگاہ، اس کے محل وقوع اور اس کے ناموں کے بارے میں مختلف آراء اور قیاسات پیش کئے گئے ہیں۔ بعض مورخین اور ماہرین جغرافیہ کی رائے میں جس دریا کے بالائی حصہ کو سوترا، سوتدری یا سوتدرو (ستلج) کہا جاتا ہے۔ اس کا نشیبی حصہ ہاکڑا کہلاتا ہے۔

کرنل منچن جو سابقہ ریاست بہاولپور میں ایک عرصہ تک پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ ان کی رائے میں ہاکڑا دریائے جمنا کی قدیم گزرگاہ پر بہنے والے دریا کا پرانا نام ہے۔

جورنل ... کے "گمشدہ ریویو" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ گم شدہ دریا جس کی

سندھ کے علاقہ کا قدیم آریائی نام "سپت سندھو" بھی تھا یعنی سات ندیوں کی سرزمین۔ ایرانی اس کا تلفظ "ہپت ہندو" کرتے تھے۔ زرتشتا کی مقدس کتاب "اوستا" کا مشہور باب جس میں جغرافیائی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں واضح طور پر یہ درج ہے کہ "خالق کائنات نے جن علاقوں کو سب سے پہلے انسانی آبادی کے لئے منتخب کیا ان میں یہ خطہ بھی شامل تھا۔"

یہ گزرگاہ اب تک موجود ہے دریائے ستلج تھا۔ ٹاڈ کی دانست میں ہاکڑا پنجاب کے بیچوں بیچ میں سے گزرتا ہوا روہڑی بھکر اور اوچ کے درمیان دریائے سندھ میں کہیں مدغم ہوگیا ہے۔ (وقائع بیکانیر) یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ دریائے جمنا پہاڑوں میں سے بہہ کر نکلا تو پانی کے بہاؤ کا زور مغربی جانب ہوگیا اور اس طرح اس کی منہ زوری کی یادگار یہ گزرگاہ باقی رہ گئی۔

ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اوچ کے پاس جس دریا کی گزرگاہ آج تک موجود ہے وہ دریائے بیاس ہے جو اپنا رخ تبدیل کر گیا اور اس کی قدیم گزرگاہ کا نشان باقی رہ گیا۔

بعض مغربی مورخوں کی رائے میں دریائے گھاگھرا یا ہاکڑا دراصل دریائے سندھ کی قدیم گزرگاہ ہے اور اس کو وہیند بھی کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہیند نام کا ایک پرانا شہر آج بھی دریائے سندھ کے کنارے موجود ہے اور اسکندر رومی نے یہاں اپنی فوجی مہم کے دوران قیام بھی کیا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ سب سے زیادہ قرینِ قیاس نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک مستقل ندیا سرسوتی ہے جس کے زیریں حصہ کو گھاگھرا، ہاکڑا یا وہیند کہا جاتا ہے اور جو پانی کی کمیابی کے باعث آہستہ آہستہ ریگستان میں جذب ہو کر غائب ہوتا چلا گیا اور ایک گزرگاہ کا نشان اپنی یادگار کے طور پر باقی چھوڑ گیا۔ جغرافیائی نقطہ نظر سے دریائے ہاکڑا یا گھاگھرا کی گزرگاہ زیادہ تر ریتلے علاقے تھے اور دریا کی اپنی تہی دامنی اور بے مائیگی اس کے خشک ہونے کا باعث بنی۔ اوچ کے اطراف و نواح میں ایسی بہت سی بستیاں آج بھی موجود ہیں جو اوچ کی طرح اس قدیم دریا کے کنارے آباد ہیں اور جن کی قدامت اوچ سے کسی طور پر کم نہیں۔ قلعہ ڈیراور، قلعہ مٹو، قلعہ مروٹ، پتن منارا، بھٹہ واہن اور اسی قبیل کی دیگر کئی ایک بستیاں ہیں جو زمانہ قدیم سے اس دریا کے کنارے واقع ہیں اور دریا کی سرد مہری اور تغافل کے باعث شکوہ سنج روزگار ہیں۔

داریوس اول کی قبر پر جو سنگی کتبہ نصب ہے اس میں بھی باجگزار صوبہ جات کی فہرست میں یہی نام تحریر کیا گیا ہے۔ یہ نام اس اعتبار سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہلم، بیاس، راوی، ستلج اور چناب کے علاوہ سندھ ندی بھی اس میں شمار ہو جاتی ہے اور ساتواں دریا "سرسوتی" ہے جو غالباً پانی کی کمی کی وجہ سے یا پھر اس لئے کہ اس کی گزرگاہ کا علاقہ زیادہ تر ریگستانی ہے۔ راستہ ہی میں کہیں غائب ہو جاتا ہے اس لئے اس کو بعض پرانے تذکروں میں "نظر نہ آنے والا دریا" "unseen river" بھی کہا گیا ہے۔ اس مقدس دریا کے نشیب کے حصہ کو گھاگھرا یا ہکڑا اور وہندہ کہا جاتا

سابقہ ریاست بہاول پور کے مختلف قصبات جو اس دریا کی گزرگاہ کے آس پاس واقع ہیں ان میں یہ دریا مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ حاصل ساڑو کے علاقہ میں اسے "باگاں والی" کہا جاتا ہے۔ میکلوڈ گنج میں "ترواہنا" منچن آباد میں "کالی بڈھی" مہار شریف، فرید اور چشتیاں میں "ہریاری" اور "گرہون"۔ حاصلپور میں "پھالہ" شہر رائیکے میں "جمالو" شیخ واہن میں "چیکانا" طلباتی میں "پیپاٹ" خیرپور میں "گاگڑا" دراور اور اس کے اطراف میں "مکارنگ" سنجر میں "جرات" ڈیرہ بکھا میں "ککی" بہاول پور میں "وہندہ" راوچ، پتوہڑی اور گڑھی اختیار خاں میں "ترگری" مئو مبارک میں "کالا" "نوشہرہ"۔ رحیم یار خاں میں "گورہیلہ" گڑھی باگڑ میں "وہندہ" اور کوٹ سبزل میں "گورہیلہ" کے ناموں سے مشہور ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تصوف و روحانیت کا قدیم مرکز اجمیر بھی اسی دریا کے کنارے بسایا گیا ہے اور اجمیر کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی اوچ کی تاریخ، دریائے ہاکڑا جیسلمیر اور بیکانیر کی ریاستوں کو بہاول پور کی ریاست سے اس کے جنوب مشرق میں جدا کرتا ہے اور راجپوتانہ اور پاکستان کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا ہے۔

دریائے ہاکڑا یا گھاگھرا کا سرچشمہ چمبا کی پہاڑی ریاست میں واقع ہے جو کلو کی وادی کے قریب ہے۔ سرسہ ضلع حصار (مشرقی پنجاب۔ انڈیا) میں بھی اس کی قدیم گزرگاہ کے نشانات ملتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جتنے پیچ و خم اور جیسا طویل راستہ اس دریا کے حصہ میں آیا ہے اور جس قدر روشوار اس کی گزرگاہ ہے ہندوستان کے شاید ہی کسی دریا میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو۔

دریائے جمنا کا دہانہ بھی دریائے ہاکڑا کے قریب ریاست چمبا ہی میں واقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جغرافیائی

ہے اور یہ وہی دریا ہے جسے بعض مورخوں نے وادی سندھ کا گم شدہ دریا (Lost river of Sind), کہا ہے۔

وادی سندھ کے اس گم شدہ دریا کی قدیم گزرگاہ اوچ کے مشہور بزرگ سید جلال سرخ بخاری کے مزار کے قریب آج بھی موجود ہے۔ بی بی جیوندی اور بہاول حلیم کے مقبروں کو اسی دریا کی کبھی کبھار اٹھنے والی لہروں نے مسمار کر دیا ہے۔

علم طبقات الارض اور آثار قدیمہ کے ماہرین فن کے نزدیک موئنجو ڈیرو، ہڑپہ اور اوچ کی عمروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ موئنجو ڈیرو اور ہڑپہ کی جو سطح کھدائی کے بعد برآمد ہوئی ہے۔ اگر دریائے گھاگھرا کی قدیم گزرگاہ کی جانب سے اوچ کا جائزہ لیا جائے تو ان تینوں بستیوں کی سطح ایک برابر ہو گی۔ ؎

ماہرین نے اسے ایک ہی دریا کی دو مختلف شاخوں سے تعبیر کیا ہے۔

؎ ماہرین آثار قدیمہ کی رائے یہ بھی ہے کہ اوچ کی موجودہ بنیاد اس کے اپنے قدیم تباہ شدہ بستی کے آثار پر قائم ہے اور یہی وجہ اس کی عام سطح سے بلندی کی ہے۔ اگر دریائے گھاگھرا کی قدیم گزرگاہ میں کھڑے ہو کر مشرقی جانب دریا کے کنارے پر نظر ڈالی جائے تو تہہ بہ تہہ کھنڈرات کے واضح نشانات دکھائی دیتے ہیں، بالخصوص پختہ اینٹوں کی دیواروں کا سلسلہ صاف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کسی پرانے قلعہ یا کسی قدیم عمارت کی دیواریں ہیں جو مٹی کے ڈھیروں میں سے جھانک رہی ہیں اور ناپائیداری دنیا کا سبق یاد دلا رہی ہیں۔

اگر آج بھی ان تہہ بہ تہہ عمارتوں کی کھدائی کر کے ان کے اسرار درون پردہ کی نقاب کشائی کر دی جائے تو بعض ایسے نوادر اور نایاب اشیاء کا ایک ذخیرہ ان تہوں میں سے برآمد کیا جا سکتا ہے اور تاریخ کے تسلسل کے لئے ایک زبردست علمی مواد بہم پہنچ سکتا ہے جو وادی سندھ بالخصوص اوچ کی قدامت پر ایک دستاویز کی حیثیت حاصل کر سکے گا۔

اوچ کے قدیم نام

اس بستی کا نام اوچ کیسے پڑا اور اوچ کے علاوہ یہ اور کن ناموں سے مشہور ہوئی اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تاہم قیاس یہ ہے کہ آریاؤں کی آمد کے بالکل ابتدائی دور میں اس کا نام "سپیدہ صبح کی دیوی" (The goddess of the Dawn), کے نام پر "اشاش" (USHAS), رکھا گیا جو بعد میں بگڑ کر اوسا اور پھر صدیاں بیت جانے کے بعد اوچھ بن گیا۔ قدیم تذکروں میں اوچ کو اوچھ بھی لکھا گیا ہے۔

رگ وید کی روایت کے مطابق جو ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب ہے آریا مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے ان میں "اشاش" بھی تھی جو "نورِ سحر کی دیوی" کہلاتی تھی۔

آریائی عہد کے ہندوستان میں شہروں اور بستیوں کو دیوی دیوتاؤں کے نام سے منسوب کرنے کا عام دستور تھا چنانچہ دہلی کے قریب جو پہلا شہر آریاؤں کے زمانہ میں بسایا گیا اس کا نام "اندر پرشٹ"[۱] تھا سیتاپور بھی اس دور کا شہر ہے جو اب

---

[۱] آثار الصنادید مصنفہ سرسید احمد خاں مرحوم

تک موجود ہے۔ اندر اور سیتا دونوں دیوتاؤں کے نام ہیں۔ ایسے ہی اشاس دیوی کے نام پر کسی شہر کا نام رکھا جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔

اشاش دیوی کا تصور عہد قدیم کی یونانی دیو مالا میں بھی ایوس[1] (EOS)، کے نام سے موجود ہے اور لاطینی میں اس کا نام اورورا[1] (AURORA)، ہے۔

اشاش دیوی کے بارے میں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ رگ وید کے قدیم نوشتوں کی رو سے یہ دیوی خشک موسم کی تمہید ہے اور ایک ایسے دن کا پیش خیمہ ہے جس میں بادل اور بارش کا کہیں نشان نہ ملتا ہو۔ سنسکرت میں "اشاش" کے لغوی معنی جلنے اور دہکنے کے ہیں۔ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر "اشاش دیوی اور اندر" دیوتا میں ہمیشہ کش مکش رہی۔ اندر دیوتا طوفان، آندھی اور بارش کا دیوتا ہے اس لئے اشاس کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس "سوریا" یعنی سورج دیوتا کے متعلق رگ وید کہتا ہے کہ وہ اشاس کا عاشق ہے کہیں وہ سوریا کو پتی (شوہر) اور اشاس کو پتنی (بیوی) قرار دیتا ہے۔ کہیں رگ وید انہیں بھائی بہن کے مقدس رشتہ سے نوازتا ہے کیوں کہ وہ دونوں "دیاؤس" یعنی آسمان کی اولاد ہیں اور کہیں اشاس کو سورج دیوتا کی ماں قرار دیتا ہے۔

اوچ کے محل وقوع اور اس کی طبعی و جغرافیائی حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک ایسا منطقہ حارہ ہے جہاں چلچلاتی دھوپ اور خشک موسم کا سکہ رواں ہے اور

---

[1] The story of Civilization our oriental heritage. Part I, Page 2. 3. 4. Ancient India by E. Royston Pire,

[2] وادی سندھ میں "ارور" سے ملتے جلتے نام کے کم از کم تین شہروں کا ثبوت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ سندھ کی قدیم آبادی کے نزدیک خصوصی اہمیت کا حامل تھا اور اسے ایک قسم کا مذہبی تقدس حاصل تھا خود اوچ کا ایک نام "رور" بھی ہے جیسا کہ آگے چل کر ہم اس پر مفصل بحث کریں گے۔

اوچ کے قریب ایک بستی سیت پور ہے جو غالباً یہ ہے کہ سیتا پور ہوگی۔

جہاں بارش کا تناسب بہت کم اور بادل کا وجود برائے نام ہے۔ دریاؤں کے مقام اتصال پر آباد ہونے اور دریائے گھاگھرا کی تند و تیز موجوں کے قرب کے باعث اوچ کی بستی کو نہ بادل کی ضرورت تھی نہ پانی کی کمی کی شکایت اسے صاف، شفاف موسم اور چمکتے ہوئے آفتاب کی ضرورت تھی اور وہ اس خطہ میں اپنی تمام زندگی بخش توانائیوں کے ساتھ موجود تھا۔

رگ وید کی یہ عبارت ملاحظہ ہو جس میں اشاس کی جلوہ سامانیوں کا ذکر کیا گیا ہے

"ہماری مایۂ حیات آگئی۔ تاریکی دور ہو گئی نور کی آمد آمد ہے۔ اشاس نے سوریا کا راستہ کھول دیا ہے ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں زندگی طویل ہے۔ شاعر (پجاری) جو درخشاں اشاس کی پوجا کرتا ہے اپنے بھجن کو لے کر اٹھتا ہے۔

اشاس اپنے پوجا کرنے والے پر چمک" اے دیوتاؤں کی ماں" اے ادیتیؔ کی مظہر۔ اے قربانی کی نشان بردار۔ طاقت ور اشاس اپنی چمک دکھا۔ اٹھ ہماری درخواستوں کو سُن اے نعمتیں عطا کرنے والی!"

اشاس کی تعریف میں جو بھجن ملتے ہیں ان میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ بار بار پیدا ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ وہ بے پایاں سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "وہ بار بار پیدا ہوتی ہے۔ گو قدیم ہے۔ اس کی چمک ہمیشہ ایک ہی رنگ کی ہے۔ وہ آدمیوں کی زندگی اس طرح گنواتی ہے جیسے کوئی جواری اپنے روپے گنوائے" (رگ وید کیم ۹۲ ۔ ۱۰)۔ مشہور ہے کہ اسم اپنے مسمی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی نام کی تاثیر ہے کہ اوچ کی قدیم بستی بن بن کر بگڑی اور بگڑ بگڑ کر بنتی رہی۔ ایک دوسرے بھجن میں

ت ادیتی سورج دیوتا کا دوسرا نام ہے۔ یہ سارا علاقہ ملتان سے لے کر اوچ تک اپنی موسمی کیفیات اور جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر اشاس اور "ادیتی" کی پرستش کا خاص مرکز رہا ہے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جب بشاری مقدسی ملتان آیا ہے تو وہ ملتان میں "آدت" نامی سورج دیوتا کے بت کا تذکرہ کرتا ہے۔

(عرب ہند تعلقات از سید سلیمان ندوی)

اشاس کی عظمت کو جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ اس دیوی کے نام سے منسوب ہستی پر کس قدر صادق آتے ہیں۔

"اشاس ان سپیدہ ہائے صبح کے نقش قدم پر چلتی ہے جو ختم ہو چکے ہیں۔ اور جو آنے والے ہیں۔ ان کا پیش خیمہ ہے۔ گزرے ہوئے اور آنے والے سپیدہ ہائے صبح میں کیا بُعد عظیم ہے۔ اشاس حسرت کے ساتھ ان سپیدہ ہائے صبح کو یاد کرتی ہے جو ختم ہو چکے ہیں اور آنے والوں پر خوشی کے ساتھ چمکتی ہے وہ فانی انسان جنہوں نے عہد اولین میں اشاس کو دیکھا تھا دنیا سے سدھار گئے۔ اب ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ بھی اسے دیکھیں گے۔ زمانہ گزشتہ میں اشاس ہمیشہ طلوع ہوتی تھی اور آج بھی یہ درخشاں دیوی دنیا کو منور کر رہی ہے نہ اس کو فنا ہے نہ انحطاط"۔ (رگ ویدیکم - ۱۱۳ - ۱۳)۔ یہ اشاس دیوی دولت و خوشحالی کی مظہر تھی۔ رگ وید کہتا ہے۔

"اٹھ اے اشاس! اے آسمان کی بیٹی! عظمت کے ساتھ آ اور ہمیں فلاح عطا کر۔ اے درخشاں اور فیاض دیوی ہمیں دولت دے۔ سپیدہ ہائے صبح اپنے ساتھ گھوڑے اور مویشی لاتے ہیں۔ اے اشاس مجھے بہت دولت دے اور بادشاہوں کو بذل و نوال پر مامور کر۔ (رگ ویدیکم ۱۱۳ - ۱۹ - ۲۰)

ے رگ ویدیکم ۱۴۳ - ۱۹ - ۲۰ بحوالہ ویدک ہند

رگ وید کی مندرجہ بالا تمام عبارتیں "ویدک ہند" مصنفہ زیڈ۔ اے راگوزن مطبوعہ حیدرآباد دکن سے ماخوذ ہیں۔

رگ وید کی اس عبارت میں گھوڑوں اور مویشیوں کی فراوانی کو "اشاس" کی برکات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اشاس جن موسمی کیفیات کا علامتی نشان ہے۔ ان کیفیات کے زیر اثر علاقوں میں گھوڑے ... ہمیشہ عمدہ اور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مرطوب آب و ہوا کے علاقوں کی نسبت خشک آب و ہوا ... جانوروں کے لئے انتہائی سازگار ہوتی۔

ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں کی روایات کی روشنی میں ہندوستان میں سولہ بڑی ریاستوں کا سراغ ملتا ہے جن میں سے ایک ریاست کا نام "اُچّھا" تھا اگرچہ تاریخ اس کے بارے میں مزید کچھ بتانے سے قاصر ہے تاہم نام کی مناسبت سے ممکن ہے یہ وہی اوچ کا علاقہ ہو۔ آریاؤں کے قدیم حکمرانوں کی فہرست میں ایک نام "اچابُن" بھی ملتا ہے نیز مہا بھارت نے آریا راجاؤں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس کے بموجب ایک راجہ کا نام "اچابسرادا" تھا۔ رگ وید میں اشاستی یا "اشاستا" نام کے ایک راجہ کا ذکر کیا گیا ہے جو مہاراجہ "جانکا" کا جانشین تھا۔ اب یہ بات کہ اچابن، اچابسرادا اور اشاستہ ایک ہی شخصیت تھی یا تین مختلف شخص تھے۔ اس کے بارے میں بھی کوئی یقینی بات نہیں کی جا سکتی لیکن اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ اوچ غالباً انہی ناموں

لہ قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ ۱۲-۱۵-۳۳

(Political History of ancient India).

لہ آثار الصنادید میں سر سید مرحوم نے تویلی پالم دہلی سے ملنے والے ایک سنگی کتبہ کا ذکر کیا ہے جس میں اچابن نامی راجہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اس پر حسب ذیل عبارت جو دراصل رگ وید سے ماخوذ ہے کندہ ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ "بیتا اور یہ پاشا یعنی بیاس اور شتدرو یعنی ستلج اور چندر بھاگا یعنی چناراں سے مل کر سندھو یعنی اٹک جس جگہ پر بڑے بڑے شہر، پیراین سے مع لواحقین بستی ہے جس نے سندھو کا پانی کرشن آب حیات ہے۔ پیا اس کے نزدیک شہد و شراب اور امرت کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ گیان امرت بھی۔

اس سندھو کے پانی سے دھلی ہوئی جو زمین ہے وہ سب گناہوں کو دور کرنے والی اور پاک ہے۔ اس پر "رو" نام شہر ہے جو گنگا کے نزدیک ہونے والی امراؤتی یعنی بہشت کو ہنساتا۔ اس رو میں اس "اودر" کا باپ ہری پال نام ہوا جس کا باپ "بسوراج" اس کا باپ "دولہر" اس کا باپ "یرتی" ہوا۔ یہ نسب "اودر" کا ہے اودر کی ماں کا نام "چندی سو" پرتھو کی دختر۔ پرتھو کا باپ سرش چند۔ اس کا باپ اوچابن۔ اوچابن کا باپ "سہدیو" سہدیو کا باپ "تول" تول کا باپ "اشوبر" وہ اشوبر سیکھ کا بیٹا اور "کور" کا پوتا ہوا۔ (آثار الصنادید ص۳)،

اس کتبہ کی عبارت میں دریاؤں کے مقام اتصال پر "رو" نامی ایک شہر کا ذکر کیا گیا ہے جس پر نظر پڑتے

سے ماخوذ ہوگا۔ آشاس یا اوس سے ملتا جلتا ایک لفظ "اجا" بھی ہے اس کے معنی بھی سورج دیوتا کے ہیں۔ راجہ اجا سیسوناگ خاندان کا ایک نامور بادشاہ ہو گزرا ہے جس نے اجمیر کا شہر اپنے یا دیوتا کے نام پر بسایا۔ اجا کے معنی سورج اور میر کے معنی ہیں پہاڑ۔ اس لئے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اچہ دراصل اج ہو جیسا کہ عرب مورخوں کے ہاں اس کا تلفظ بھی ملتا ہے اور عین ممکن ہے کہ اچہ اور اجمیر دونوں کا بانی بھی راجہ اجا ہو۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اوچہ یا اوچ کی طرح اجمیر بھی دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ہے اور آج بھی اس کی گزرگاہ اجمیر کے قریب پانچ میل کی مسافت پر واقع ہے۔

راجہ اجا کا نام بعض پرانے نوشتوں میں "اچھو" (ACHO), بھی مذکور ہے۔ چنانچہ پولیٹیکل ہسٹری آف انڈیا کے صفحہ ۱۱۰ پر مسٹر جیسوال کے حوالہ سے درج ہے کہ انڈین میوزیم کی بھارت گیلری میں پٹنہ کے بتوں میں سے ایک بت یوداین کا ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں: بھاگے اچھو چھونی دیسے"۔ مسٹر جیسوال اچھو کو اجا کا مترادف قرار دیتے

ہی ذہن بے اختیار چولستان کے اس لق و دق صحرا کی جانب جاتا ہے جسے بہاولپور کے لوگ "روہی" کہتے ہیں۔ تاریخ فرشتہ کی تصریح کے مطابق "رو" سے وہ مخصوص کوہستانی سلسلہ مراد ہے جو طول میں بجور سے سیبی تک اور عرض میں حسن ابدال سے کابل اور قندھار تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سندھ شامل ہے (تاریخ فرشتہ ص۱۲ ج ۱)

: مسٹر جیسوال کی اس وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ اچھو اور اجا میں جو لفظی فرق پایا جاتا ہے وہ محض علاقائی زبانوں کے اختلاف کے باعث ہے ورنہ معنی کے اعتبار سے اچھو اور اجا دونوں لفظ ہم معنی ہیں اس لئے اجمیر اور اوچہ کا بانی ایک ہی شخص ہوگا۔

اوچ کا ایک لفظ بعض پرانے تاریخی تذکروں میں اوچھ بھی آیا ہے۔ تاریخ فرشتہ نے اوچ کو ہمیشہ اوچھ لکھا ہے اس لئے قرین قیاس بھی ہے کہ اوچھ اوچھو کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اچھو اور اوشاس بھی قریب المخرج ہیں اور سنسکرت لب و لہجہ میں اجا" اوچھ" اوشاس" میں چنداں تباعد نہیں سمجھا جاتا تلفظ کی مشابہت کے ساتھ ساتھ تینوں لفظوں کے رسم الخط میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔

ہیں ۔ ایران کے ایک نامور بادشاہ دارا گشتاسپ (DARIUS)، نے اپنے ایک معتمد جرنیل "سکائی لیکس" (SKYLEX)، کو ۵۱۵ ق م میں ایک لشکر جرار دے کر سندھ بھیجا۔ اس نے وادئ سندھ کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔ اوچ کا ایک نام "اسکالندا" بھی ہے۔ ممکن ہے یہ سکائی لیکس کی نسبت سے اسکلندا کہلایا ہو اسی طرح سکندر مقدونی جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس نے دریاؤں کے مقام اتصال پر ایک شہر بسایا جس کا نام اس نے اسکندریہ رکھا۔[۱]

تقریباً تمام مورخین جن میں اے کننگھم ۔ ایلیٹ ۔ ڈاسن ۔ جیمس ایچ جینس وی ۔ اے اسمتھ ۔ میجر راورٹی جیسے مغربی مورخین شامل ہیں، کے علاوہ مشرقی مورخین بھی اس امر پر متفق ہیں کہ اوچ ہی اسکندریہ تھا۔ وی ۔ اے ۔ اسمتھ اپنی کتاب قدیم تاریخ ہند میں لکھتا ہے ۔

" دریائے سندھ سے پنجاب کے دریاؤں کے مقام اتصال پر ایک شہر بسایا گیا جس کے متعلق سکندر کو امید تھی کہ وہ پھلے پھولے گا ایک ڈاک یارڈ بھی وہاں تعمیر کیا گیا۔ اے کننگھم کی رائے میں وہ شہر اوچ تھا"[۲] (قدیم جغرافیہ ہند)[۳]

ایک اور روایت کے مطابق اوچ کا نام اشوک اعظم کے ایک بیٹے جلوک کی رانی " اسان دیوی " کے نام پر پڑ گیا ہوگا۔ جلوک اپنے باپ کے مرنے کے بعد سندھ، پنجاب، کشمیر اور قنوج کے علاقہ کا حکمران بنا۔ یہ اپنے باپ کے برعکس بدھ مذہب کا مخالف اور " شیو " کا پجاری تھا۔ جلوک اور اس کی رانی " اسان دیوی نے کئی مقامات پر شیو کے مندر تعمیر کرائے۔[۴]

۱۔ "Early History of India" by V. A. Smith.

۲۔ قدیم تاریخ ہند۔ قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ

۳۔ A. Cunningham's ancient Geography of India (pp 242–8)

Historical Atlas of India - by Charles Joppen S. I. (P.4).

۴۔ قدیم تاریخ ہند از وی۔ اے سمتھ

اوچ کے علاقے میں بھی اوچارانی کی کہانیاں اب تک زبان زدِ عوام ہیں۔ ممکن ہے یہ وہی اسان دیوی ہو لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے[1]۔ پہلی صدی عیسوی میں یو۔ چی قوم ایران سے لے کر دریائے سندھ اور دریائے جہلم تک کے علاقوں پر حکمراں ہوئی ان کے زیر انتداب علاقوں میں اوچ کی بستی بھی تھی اس لئے عین ممکن ہے کہ اس فاتح قوم کے نام پر اس بستی کا نام اوچ پڑ گیا ہو۔ اس قیاس کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ترکستان کے علاقہ میں جو یو۔چی قوم کا اصل مسکن ہے۔ کرغان اور اوچک نام کے شہر آج تک موجود ہیں[2]۔

بنا بریں یہ کچھ بعید نہیں کہ اس بستی کو اس کے نئے فاتحین نے اوچ کا نام دے دیا ہو۔ شہروں کے ناموں میں اس قسم کی سیاسی تبدیلیاں ہر دور میں عام رہی ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ بدستور قائم ہے۔ فاتح صرف اقتدار کا بھوکا نہیں ہوتا۔ شہرت کی خواہش

---

[1] ۔ سکندر رومی کے عہد میں جو اشوک سے سو سوا سو برس قبل کا عہد ہے دریاؤں کے مقام اتصال پر جہاں اب اوچ کی بستی آباد ہے ایک قوم اوسا دیوی (OSSA DIOI). کا تذکرہ تقریباً تمام معتبر مؤرخوں نے کیا ہے۔ اس سے جلوک کی رانی "اسان دیوی" کے نام پر اس بستی کا نام پڑنے کی روایت غلط معلوم ہوتی ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ جلوک کی رانی "اوسا دیوی" قوم سے تعلق رکھتی ہو اور اس نسبت سے بجائے نام کے اپنی قومی مناسبت کی بنا پر اس نام سے مشہور ہو گئی ہو۔ "اوسا دیوی" اور "اشاس دیوی" میں جو صوتی، لفظی اور معنوی تماثل موجود ہے اس سے البتہ ہمارے سابقہ نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ یہ بستی اور اس بستی کے باسی "سپیدہ صبح کی دیوی" "اشاس" سے منسوب تھے۔

بعض تاریخی کتابوں میں اشاس (USHAS) کا لفظ سین مہملہ سے بھی مذکور ہے۔ یعنی ساس (USAS) حوالہ کے لئے دیکھئے اے۔ ایل بھاشم کی انگریزی کتاب THE WONDERS THAT WAS INDIA by A. L. Bhasham, (pp. 2[illegible]3 - 402).

[2] ۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا۔

بھی اس کی فطرت میں موجود ہوتی ہے۔ تاریخ اوچ مؤلفہ مولانا حفیظ الرحمٰن میں بہاولپور گزیٹیئر کے حوالہ سے یہ قیاس آرائی بھی کی گئی ہے کہ لفظ اوچ "ہچ" یا ہوڈ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"راجہ ہوڈ کے وزیر ہچ نے اوچ کے قریب ایک تالاب کھدوایا تھا جس کو رانی تلا (رانی کا تالاب) کہتے ہیں۔ اس تالاب کے موقعہ پر کچھ کھنڈرات مل گئے ہچ نے وہ آثار قدیمہ برآمد کر کے ان برباد شدہ کھنڈرات کو پھر آباد کیا اور اس مقام کا نام اپنی یادگار کے لئے ہچ رکھا اور یہ لفظ بعد میں اوچ ہوگیا یا پھر راجہ ہوڈ نے جو زمانہ قدیم میں اس علاقہ کا حکمران تھا ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام اس نے اپنے نام پر ہوڈ رکھا۔ لفظ ہوڈ رفتہ رفتہ ہوچ اور پھر اوچ ہو گیا۔[۱]

تاریخ اوچ کے مصنف نے اوچ کے کچھ اور نام بھی گنوائے ہیں جن میں پابیہ، بسمد، تلواڑا، چاچ پورہ، سندر قابل ذکر ہیں لیکن تاریخ اوچ کی مندرجہ روایات کا دارومدار زیادہ تر بہاولپور گزیٹیئر پر ہے اور بہاولپور گزیٹیئر میں بہت کم روائتیں ایسی ملیں گی جن میں واقعات کی صحت اور ان کے ا[illegible]د کا اہتمام کیا گیا ہو۔

البتہ کچھ نام ایسے ہیں جو تاریخ اوچ کے مصنف نے اپنی قیاس آرائی سے اوچ پر چسپاں کر دیئے ہیں اور بات کو وزن دار بنانے کے لئے بعض مستند تاریخی کتابوں کا حوالہ بھی پیش کر دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ میں کسی ایسے راجہ ہوڈ کا مطلقاً ذکر نہیں ملتا جو اس علاقہ کا حکمران رہا ہو اور جس کے وزیر کا نام ہچ ہو۔ ہچ وزیر جو بعد میں ایک خود مختار بادشاہ بنا۔ رائے ساہسی کا وزیر تھا اور رائے ساہسی راجہ سیہرس کا بیٹا تھا۔ رائے خاندان جو پانچویں صدی عیسوی میں سندھ بشمول ملتان و اوچ کا حکمران تھا۔ "ہوڈ" نام کے کسی راجہ کا تذکرہ نہیں ملتا مولہ بالا تاریخ اوچ میں راجہ ہوڈ کا زمانہ پہلی صدی عیسوی کا نصف آخر بتایا گیا ہے۔ جو سراسر خلاف واقعہ ہے۔

یہ زمانہ یو۔ چی قوم کے اقتدار کا ہے جب یہاں کڈفائس دوم (KAD PHISES II) حکمران تھا۔

"سید معصوم بکھری نے اس مقام کا نام تلواڑا لکھا ہے"۔

حالاں کہ میر معصوم اپنی تاریخ سندھ میں اوچ کو ہمیشہ اوچ ہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ انہیں کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ اپنی کتاب میں پچاس جگہ اوچ لکھنے کے بعد یکایک اسے تلواڑا کہنے لگتے۔ مولوی صاحب نے میر معصوم بکھری کی عبارت کے سیاق وسباق کے ذکر کی مطلقاً ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ یہ لکھنے کی زحمت کی ہے کہ میر معصوم نے کہاں پر اوچ کو تلواڑا لکھا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک مورّخ کا بیان ہے کہ جس وقت اس علاقہ کو یونانیوں سے راجہ چندر گپت نے ایک جنگی امداد کے صلہ میں حاصل کیا تو اس وقت اس قصبہ کا نام "رام کلی" رکھا گیا تھا۔ یہ نام اب تک اوچ کے ملحقات میں ایک بستی کا ہے"۔

وہ مورّخ کون ہے جس نے یہ بات لکھی ہے مولوی صاحب نے اس کا کچھ اتہ پتہ نہیں بتایا۔ تاریخی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پنجاب، سندھ اور راجپوتانہ گپت سلطنت میں شامل نہ تھے[1]۔

یہی حال اس کے دوسرے ناموں کا ہے کہ بلا کسی دلیل کے جو نام بھی ان اطراف میں سے کسی بستی کا مولوی صاحب کے علم میں آیا۔ انہوں نے اس کو بلا تکلف اوچ پر منطبق کر دیا۔

"چچ نامہ میں پابیہ، اسکلندہ اور سکہ تین الگ الگ بستیاں بیان کی گئی ہیں اور کامل ابن اثیر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بسمد اوچ سے بالکل مختلف ایک دوسرا شہر تھا اور اصطخری اور بشاری مقدسی نے ملتان سے اس کا فاصلہ ۲۴ میل متعین کیا ہے جو کسی صورت بھی اوچ نہیں ہو سکتا۔

صاحب تحفۃ الکرام ان تمام قیاسات کے برعکس لفظ اوچ کی وجہ تسمیہ اس

---

[1] تاریخ ہند کی تمہید از پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۳۷ء

کے مقام کی بلندی کی مناسبت سے قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اوچ مشہور و متبرک مقام ہے جو عہد قدیم سے ملتان کے تابع ہے۔ یہ سرزمین ان چھ مقامات میں سے ہے جن کے قلعوں کو رائے ساہسی بن سیہرس نے رعایا کو مالگزاری ادا کرنے کی بجائے مٹی سے تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس طرح یہ مقامات اونچے ہو گئے تھے۔ مدت گزر جانے کی وجہ سے یہاں کی عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں اب یہاں کے سات مقامات میں سے تین مقامات بستی اوچ گیلانی، اوچ مخدوم جلال جہانیاں۔ اور اوچ مغلیہ ایک دوسرے کے قریب آباد ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی سطح زمین اونچی یعنی بلند ہے۔" [1]

چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں جب سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اسکی ترکتازیوں کی حدود میں بھاٹیہ نامی ایک علاقہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے مراد بھی یقیناً یہی اوچ اور اس کے مضافات ہوں گے اس لئے کہ اس دور میں اس خطہ پر بھٹی راجپوتوں کا تصرف تھا۔

غزنوی عہد کے مشہور مورخ عتبی نے جو سلطان محمود غزنوی کا مصاحب خاص تھا۔ بھاطیہ پر حملہ کا ذکر کیا۔ ہے وہ لکھتا ہے۔" بھاطیہ کی دیواریں اتنی بلند تھیں کہ باز کی پرواز وہاں تک ممکن نہیں تھی اور اس کے ارد گرد بہت بڑا دریا گھیرا ڈالے ہوئے تھا۔ بھاٹیہ کا حکمران راجہ بجے راؤ تھا۔ تین شب و روز تک لڑائی جاری رہی۔ ہاتھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ایک سو بیس ہاتھی بادشاہ کے قبضہ میں آئے"۔ البیرونی نے بھی

---

[1] تحفۃ الکرام مصنفہ میر شیر علی قانع ٹھٹھوی ص ۲۶۴ اصل عبارت یوں ہے۔

" اوچ خطۂ نامی و بقعۂ گرامی از قدیم توابع ملتان است۔ ارضش از جملۂ شش امکنہ است کہ رائے ساہسی بن سیہرس قلعہ جات آں را بہ رعایا عوض محصول حکم بنا ساختن خاک فرمودہ بود تا ارتفاع یافتند بمرور دہور آں بناہا منہدم گشت اکنوں از ہفت موضع سہ موضع متصل اوچہ گیلانی اوچہ بخاری مخدوم جلال جہانیاں و اوچ مغلیہ برابر ہم آباد وجہ تسمیہ آں کہ زمین بلند دارند"۔ (تحفۃ الکرام)

جو غزنوی دربار کا نامور مورخ گزرا ہے اس بستی کا ذکر بھاتیہ کے نام سے کیا ہے۔ اوچ کا نام بھاتیہ کس سبب سے ہوا۔ اس پر تاریخ مبارک شاہی سے روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ مبارک شاہی کے مصنف فخرالدین مرو روزی جو شہاب الدین غوری کے ہم عصر مورخین میں سے ہیں لکھتے ہیں۔

درسنہ احدی وسبعین وخمسمائۃ سمت اوچ و بہاطیہ و ملتان لشکر کشید طائفہ بہاتیہ در حصار اچہ محصر شدہ باسلطان محاربہ کردند بعد مدتے بعون اللہ تعالیٰ حصار اچہ فتح شد اقطاع ملتان و اوچ میر سپہ سالار علی کرماخ را دادہ خود طرف دارالملک غزنین مراجعت فرمود (تاریخ مبارک شاہی صفحہ ۲۱) یعنی ۵۷۱ھ میں شہاب الدین غوری نے اوچ بہاتیہ اور ملتان پر چڑھائی کی۔ گروہ بہاطیہ اوچ کے قلعہ میں محصور ہو کر سلطان سے آمادہ پیکار ہوا۔ ایک عرصہ کے بعد اللہ کی مدد سے اوچ کا قلعہ فتح ہوگیا۔ سلطان نے ملتان اور اوچ کے علاقے میر سپہ سالار علی کرماخ کی تحویل میں دیئے اور خود غزنین واپس لوٹ گیا۔)

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اوچ ہی کا نام بھاتیہ تھا کیونکہ اس علاقہ پر بھاتیہ نامی ایک قوم حکمران تھی اور اس مناسبت سے اوچ کو بھاتیہ کہا جاتا تھا۔ طبقات اکبری میں بعینہٖ یہی روایت موجود ہے۔

"وطائفہ بھاتیہ در حصار اوچ متحصن شدہ چند روز محاربہ کردند آخر فتح شد۔"
(طبقات اکبری صفحہ ۱۶ ج ۱)

تاریخ فرشتہ میں ہے "محمود غزنوی کے عہد میں یہاں بھٹی قوم کی آبادی غالب تھی۔ اس لئے اسے "بھاتیہ" کہا جانے لگا۔ اس زمانہ میں اوچ کا حکمران راجہ بجے راؤ تھا۔ (تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۰۔ ج۔ الف) آئین اکبری میں دریائے بیاس کو جو اوچ کے قریب بہتا تھا دریائے بھٹ کہا گیا ہے (آئین اکبری صفحہ ۱۰۳۷) بہاطیہ کے مختلف تلفظ ملتے ہیں۔ کہیں اسے بہاطیہ کہیں باتیہ اور کہیں بھنیہ لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے لکھا ہے کہ "باتیہ ایں را در کتب تاریخ بہاطیہ نیز می نویسند تقریباً مشتمل

بودہ بر ریاست بہاول پور و نواحی آں (تشریحات برہج نامہ صفحہ ۲۵۷)

بعض تاریخی تذکروں میں اوچ کا نام دیو گڑھ بھی مذکور ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ راجہ دیو سنگھ کے زمانہ میں اس شہر کو دیو گڑھ کہا جانے لگا۔

اوچ کے خلیفہ خاندان کے مخطوطات میں ایک عبارت حضرت سیّد جلال سُرخ بخاری کی طرف منسوب ہے جس کا ترجمہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اوچ شریف کا علاقہ جو ملک دیو گڑھ کا ایک شہر تھا اور راجہ دیو سنگھ کے تصرف میں تھا۔ وہ اسلام کی فتح سے اس فقیر کے قبضہ میں آیا اور اس کا نیا نام اوچ مبارک رکھا گیا۔ یہ رانی ادچھ کی طرف منسوب ہوا۔ اس طرح شہر سیت پور جہاں راجہ دیو سنگھ کی بہن رانی سینا رہتی تھی۔ وہ اس کے نام سے مشہور ہوا۔ قیامت تک کے لئے یہ بستیاں مشہور رہیں گی"۔ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کے نزدیک بھی اس بستی کا نام دیو گڑھ تھا اور حضرت سید جلال سرخ بخاری کے ڈر سے راجہ دیو سنگھ بھاگ گیا مگر اس کی لڑکی سندر پری نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر حضرت سید جلال سُرخ بخاری نے اس بستی کا نام اوچ رکھا۔

معجم الامکنہ میں بھی یہی روایت بیان کی گئی ہے۔ آب کوثر کے مصنف شیخ اکرام نے بھی بلا تحقیق یہی بات نقل کر دی ہے اور "تاریخ اوچ" کے مصنف مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب نے بھی اس بالکل خلاف واقعہ روایت پر صاد کیا ہے لیکن ہمیں اس روایت کو تسلیم کرنے میں بوجوہ تامل ہے۔ حضرت سید جلال سرخ بخاری کی آمد اوچ میں ساتویں صدی ہجری کے وسط میں یا اس کے نصف آخر کے ابتدائی سالوں میں ہوئی ہے۔ یہ زمانہ ناصر الدین محمود کی حکومت کا ہے۔ اس سے کم و بیش ۲۵ برس پہلے اوچ ناصر الدین قباچہ کا دار الحکومت تھا اور قباچہ سے شمس الدین التمش نے چھین کر اس پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اس صورت میں جب کہ کم از کم سو سال پہلے سے یہاں مسلمانوں کی مضبوط حکومت قائم تھی۔ اچانک کسی ہندو راجہ کا اس پر غلبہ سراسر بداہت

عقل کے خلاف ہے اس لئے یہ سارا واقعہ محض افسانہ ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ حضرت سید جلال سرخ بخاری کے اس سے ملتے جلتے ایک اور واقعہ سے کسی راوی کو اشتباہ ہوا ہو اور اس نے اسے اوچ کی طرف منسوب کر دیا ہو۔

حضرت سید جلال سرخ بخاری کے عہد میں ڈیراور کا قلعہ جو بہاولپور کے قدیم تاریخی قلعوں میں سے ہے، ہندو ریاست جیسلمیر کی عملداری میں تھا۔ ڈیراور ان دنوں ریگستان نہیں بلکہ دریا کی گزرگاہ پر واقع ہونے کی وجہ سے بڑا سرسبز و شاداب خطہ تھا حضرت سید جلال سرخ بخاری کا ڈیراور کے قلعہ میں آنا اور یہاں کے مہاراجہ اور اسکے متعلقین کو قبول اسلام کی دعوت دینا تاریخی طور پر ثابت ہے۔ مہارانی ان دنوں حاملہ تھی۔ آپ نے پیش گوئی فرمائی کہ راجہ کا بیٹا ولی اللہ ہو گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ منڈی یزمان کے قریب بہاولپور سے تیس پینتیس میل کے فاصلہ پر چنن پیر کے نام سے جو مزار موجود ہے وہ اس مہاراجہ کے بیٹے کا ہے۔ ممکن ہے دیو سنگھ اس مہاراجہ کا اور دیو گڑھ قلعہ ڈیراور کا نام ہو۔

اسکلندہ، اوچ اور ارور

قدیم تاریخی کتابوں میں اوچ یا اوچہ کے علاوہ اسکلندہ اور ارورز کے نام بھی ملتے ہیں جن کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مختلف شہروں کے نام ہیں۔ لیکن جہاں تک راقم الحروف کی رائے کا تعلق ہے قدیم ترین جغرافیائی نقشوں اور ابتدائی عرب مورخوں کی تاریخی کتب کے مطالعہ کی بناء پر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسکلندہ، اوچ اور ارور ایک ہی شہر کے تین نام ہیں۔

اسکلندہ کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ایک خیال ہے کہ یہ نام دارا گشتاسپ کے جرنیل سکائی لیکس (SKYLEX). کی طرف منسوب ہے جس نے غالباً ۵۱۰ھ قبل مسیح میں وادیٔ سندھ کا سارا علاقہ مسخر کر لیا تھا۔ پرانے تذکروں میں "اسکلند اوسا" نام کا ایک شہر بھی ملتا ہے جس کے متعلق گمان یہی ہے

کوروؤں کے مشہور راجہ دریودھن کی بہن رانی دھسلا کا پایۂ تخت "اسکلندا" تھا۔ ڈاسن (Dawson) نے نشاندہی کی ہے کہ یہ وہی شہر ہے جو بعد میں اسکلندرہ کے نام سے مشہور ہوا۔

تعلیقہ۔ "صاحب مجمل التواریخ آں را عسقلند نوشتہ این شہر را باوچہ قدیم مشخص کردہ اند" (تشریحات ڈاکٹر ... صفحہ ۹۰)۔

کہ یہ اوچ کا قدیم نام ہے۔ اسکلند کے ساتھ اوسا کا اضافہ غالباً اشاس دیوی سے قدیم رابطے کا مظہر ہے۔ بعد میں یہی اسکلند جسے " عسقلند اور عکسلندہ بھی لکھا جاتا ہے اسکندرہ بن گیا۔ چنانچہ میجر راورٹی Maj. Raverty, نے اپنی کتاب " مہران اور اس کی شاخیں" میں۔ اسکندرہ کے متعلق حسب ذیل نوٹ لکھا ہے۔

" چچ نامہ کے نسخوں میں اس نام کا املا ہیں مختلف طریقہ سے ملتا ہے۔ ان میں سے ایک عکسلندہ بھی ہے جو زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ عکسلندہ غالباً عسکلندہ یا اسکلندہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ مجمل التواریخ کے مصنف نے اس کو عسقلندہ لکھا ہے۔ میر معصوم نے اس اسکلندہ کو اپنے قیاس کی بناء پر اسکندرہ لکھا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ قدیم شہر سکندرؔ مقدونی کے حملہ کے بعد اسی نام سے مشہور ہو گیا ہو۔ اس خطہ میں اوچ بھی ایک قدیم شہر ہے اس لئے بعض مورخوں نے اسکندرہ کو اوچ سے بھی تعبیر کیا ہے۔"

" جغرافیہ سندھ Geography of Sind " میں بھی اس نظریہ کی تائید کی گئی ہے۔ کہ " اسکندرہ " سے مراد یہی اوچ ہے۔ علاوہ ازیں یاقوت حموی نے اپنی مشہور کتاب " معجم البلدان " میں اسکندریہؔ نام کے دو شہروں کا ہندوستان میں ہونا ثابت کیا ہے جن میں سے ایک " فی مجاری الانہار " (دریاؤں کی گزرگاہ کے پاس) تھا۔ " قدیم

لہ معجم البلدان صفحہ ۲۲۵-۲۲۶ ۔ باب الہمزۃ والسین (وقال اہل السیر بنی الاسکندر ثلاث عشر مدینۃ و سماہا کلہا باسمہ ثم تغیرت اسامیہا بعدہ و صار لکل واحدۃ منہا اسم جدید...... و منہا الاسکندریۃ التی بناہا فی بلاد الہند ...... و منہا الاسکندریۃ التی فی مجاری الانہار بالہند"

ترجمہ:۔ مورخین کہتے ہیں کہ اسکندر نے تیرہ شہر بسائے تھے اور ہر ایک شہر کا نام اپنے نام کی رعایت سے اسکندریہ رکھا لیکن بعد آگے چل کر یہ نام بدل گئے اور ہر ایک شہر کا نیا نام پڑ گیا۔ ان میں ایک اسکندریہ اس نے ہندوستان کی حدود میں اور دوسرا ہندوستان میں ہی دریاؤں کے سنگم کے قریب بسایا تھا۔

جغرافیہ ہند کے مصنف سر الیگزنیڈر[1] کننگھم کی رائے میں اوچھ ہی وہ شہر ہے۔ جسے سکندر اعظم نے دریاؤں کے سنگم پر بسایا تھا۔ دوسرے مورخین[2] بھی اس بات پر متفق ہیں کہ سکندر رومی نے دریاؤں کے مقام اتصال پر ایک شہر بسایا جس کا نام اس نے حسبِ معمول اسکندریہ رکھا۔

سکندر اعظم کی آمد سے قبل سندھ پر کفند نامی ایک راجہ حکمران تھا جس نے اپنی بیٹی سکندر کی نذر کی تھی اور اسکندر کی خدمت میں بہت سے تحائف ارسال کئے تھے ان تحائف میں ایک ماہر ڈاکٹر، ایک فلسفی اور شیشہ کا ایک گلدان بھی تھا۔ شاہ نامہ میں فردوسی نے اس کا تذکرہ "کید" کے نام سے کیا ہے۔ کفند کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا آیند تخت پر بیٹھا اور اس نے ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا اور ہر صوبہ کا الگ الگ گورنر مقرر کیا۔ ایک صوبہ کا دارالحکومت "اسکلند[3] اوسا" تھا

بارھویں یا تیرھویں صدی قبل از مسیح میں سندھ پر راجہ جیدرتھ اور اس کی رانی دھسلا کی حکمرانی کا سراغ ملتا ہے۔ رانی دھسلا کا پایہ تخت "اسکالندا[4]" تھا۔ اوچ کا قدیم نام "ارور" یا "رور" بھی ہے۔ فتوح البلدان میں بلاذری نے جس شہر کا ذکر رور اور بغرور کے نام سے کیا ہے وہ اس سے مختلف شہر ہے۔ اسی طرح الورجو سندھ کا قدیمی پایۂ تخت ہے وہ بھی ارور سے الگ اور اس سے کافی فاصلہ پر آباد ایک دُوسرا شہر ہے جیسا کہ خود بلاذری کے بیان سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ رور، بغرور اور ارور تینوں الگ الگ شہروں کے نام ہیں، کامل ابن اثیر میں محمد بن قاسم کے عہد فتوحات کی جو تفصیلات

---

۱ سر الیگزینڈر کننگھم کا اینشینٹ جغرافیہ آف انڈیا صد ۲۳۲

۲ پولیٹیکل ہسٹری آف اینشینٹ انڈیا از ہیم چندرائے ص ۱۳۳

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا

۳ ہسٹری آف سندھ از ایلیٹ ڈاؤسن

۴ مجمل التواریخ بحوالہ تاریخ ہند از ایلیٹ ص ۵

ملتی ہیں ان سے بعض اہم شہروں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں رور کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ کامل ابن اثیر کے بیان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راور رور بغرور اور رور تین الگ الگ شہر تھے، کامل ابن اثیر میں ہے۔

"جب داہر مقتول ہو گیا تو محمد نے بلادِ سندھ پر قبضہ کر لیا اور شہر راور کو بھی فتح کر لیا۔ یہاں داہر کی بیوی رہتی تھی اسے اندیشہ ہوا کہ قید ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی لونڈیوں باندیوں سمیت آگ میں جل کر مر گئی۔ محمد یہاں سے برہمن آباد کی طرف چلا اور یہ منصورہ سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔ اس وقت منصورہ میں کوئی آبادی نہیں تھی بلکہ جنگل تھا۔ شکست خوردہ حریف نے یہیں آکر پناہ لی۔ محمد نے برہمنا باد کو فتح کر لیا۔ بہت سے آدمیوں کو قتل کیا، عمارتوں کو منہدم کر دیا پھر رور اور بغرور جا رہا تھا کہ باشندگان ساوندری ملے انہوں نے صلح کر لی۔ یہیں سے رور گیا رور سندھ کے شہروں میں سے تھا جو پہاڑ پر تھا کئی مہینے کے محاصرہ کے بعد صلح ہو گئی وہاں سے وہ سکہ فتح کر کے نہر بیاس کی طرف گیا اور اس کو عبور کر کے ملتان پہنچا (کامل ابن اثیر حصہ دوم جلد چہارم صفحہ ۱۷۱، ۱۷۰)

مذکورہ بالا اقتباس سے رور کے محل وقوع کا سراغ ملتا ہے کہ وہ بسمد اور سکہ کے درمیان تھا اور پہاڑ پر واقع تھا۔ پہاڑ سے اگر محض سطح مرتفع مراد ہو تو اوچ بھی نسبتاً اونچائی پر ہے اور ایک اونچے ٹیلے پر آباد ہے۔

عرب مورخوں کے ہاں اس قسم کی مشتبہ روائتیں عام ہیں اور اس کی بڑی وجہ عجمی ناموں سے عدم مناسبت کے علاوہ سنے سنائے واقعات پر انحصار بھی ہے۔ اوچ، اسکلندہ اور ارور یا رور کے بارے میں ہماری رائے جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا

---

[1] ارود اور رور دونوں ہی ناموں سے اس بستی کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دراصل اس بستی کا نام رور رکھا گیا اور اس پر عربی قاعدے کے مطابق "ال" کا اضافہ کیا گیا جس سے یہ الرور بن گیا۔ یہ عجمی اثرات سے الرور کی بجائے ارور متداول ہو گیا۔

یہی ہے کہ یہ تینوں نام ایک ہی بستی کے ہیں اور اس کی بڑی وجہ وہ ایک ہی قسم کے واقعات ہیں جنہیں مختلف مورخین نے ان تینوں ناموں والی بستی پر منطبق کیا ہے مثلاً تاریخ معصومی نے جو واقعہ اسکلندہ یا اسکندرہ کے متعلق محمد بن قاسم کے حالات کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ بعینہٖ اسی واقعہ کو تیسری صدی ہجری کے ایک مورخ یعقوبی رور سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

حتی اتی الرور وھی من اعظم مدائن السند فحاصرھم حصارا شدیدا وھم لایعلمون ان داھر قد قتل فلما اعلمھم بعث الیھم محمد بن قاسم بامراۃ داھر فقالت لھم ان الملک قد قتل فاطلبوا الامان فاطلبوہ فنزلوا علی حکم محمد فتحوا لہ بلد المدینۃ فدخلھا ثم استخلف فیھا۔ یعقوبی ج ا ص۳۴۶

ترجمہ: حتیٰ کہ جب محمد بن قاسم رور پہنچا جو سندھ کے بہت بڑے شہروں میں سے ہے تو اس نے اہل شہر کا بڑا سخت محاصرہ کیا اور یہاں کے لوگ اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ داہر مارا جا چکا ہے۔ جب محمد بن قاسم کے محاصرہ سے یہاں کے لوگ پریشان ہو گئے تو محمد بن قاسم نے داہر کی بیوی کو ان کے پاس بھیجا اس نے جا کر انہیں بتایا کہ بادشاہ مارا جا چکا ہے اس لئے اب تم امان طلب کر لو چنانچہ اہل شہر امان کے طلب گار ہوئے اور انہوں نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی اور شہر کا دروازہ کھول دیا۔ محمد بن قاسمؒ نے شہر میں داخل ہو کر یہاں ایک حاکم مقرر کر دیا۔"

اب اسی واقعہ کو تاریخ سندھ کے مصنف میر معصوم کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۹۳ھ کے اوائل میں داہر کے بیٹے بہادروں کی ایک جماعت کے ساتھ آ کر اسکندرہ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ یہ قلعہ بیحد مضبوط تھا وہاں سے آ کر انہوں نے سندھ کے بعض علاقوں پر چھاپے مارے۔ یہ اطلاع پا کر محمد بن قاسم اس طرف روانہ ہوا اور جا کر اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد اناج کی قلت کی وجہ

سے تکلیف پیدا ہوگئی اور لشکرِ اسلام صرف گوشت پر گزارہ کرنے لگا۔ محمد بن قاسم نے کچھ سمجھدار آدمی داہر کے بیٹوں کے پاس بھیج کر انہیں رعایت اور مہربانی کا دلاسا دیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ راجہ داہر زندہ بچ کر نکل گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ جلد ہی ہندوستان سے ایک لشکر جرار ساتھ لاکر انتقام لے گا۔ اس پر محمد بن قاسم نے داہر کی بیوی لاڈی کو الور سے بلا کر اس کے بیٹوں کے پاس بھیجنے کا حکم دیا تاکہ وہ جاکر ان کی غلط فہمی دور کر دے۔ چنانچہ لاڈی کو حاضر کر کے اہل قلعہ اور داہر کے بیٹوں کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے اسے دروازے کے باہر ہی روک دیا اور خود فصیل کے اوپر چڑھ آئے۔ داہر کی بیوی نے انہیں جنگ کے واقعات اور داہر اور اس کے سرداروں کے قتل ہونے کی کیفیت نام بہ نام سنا کر نوحہ و ماتم شروع کیا لیکن انہوں نے اسے جھوٹا سمجھ کر پتھر اور اینٹیں ماریں اور کہا تو اس جماعت کے ساتھ مل گئی ہے۔ چنانچہ لاڈی واپس آگئی اور محمد بن قاسم کی فوج قلعہ شکن آلات کی طرف متوجہ ہو کر منجنیق اور آتشبازی کے دیگر اسلحہ جات کام میں لائی بہت جلد وہ قلعہ فتح ہو گیا۔ کافروں کو برباد کر کے بہتوں کو قتل کیا گیا۔ جو تھوڑے بچے انہوں نے اسلام کی اطاعت قبول کر لی۔ زر کثیر اور بے انداز سامان لشکرِ اسلام کے ہاتھ آیا۔ قلعہ میں جو بت خانہ تھا۔ جب اسے توڑا گیا تو اس میں سے گنجِ عظیم برآمد ہوا جسے بحق خلیفہ ضبط کر لیا گیا اور دیگر مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکال کر مسجدوں کی تعمیر پر خرچ کیا گیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم الور جا پہنچا۔"

تفصیلات سے قطع نظر یہ ایک بڑا واقعہ ہے جسے یعقوبی نے مختصر پیرایہ میں بیان کیا ہے اور میر معصوم نے کسی قدر وضاحت کے ساتھ۔ اب تاریخ فرشتہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتا ہے۔

"راجہ داہر کا ایک عرب بہادر سے مقابلہ ہوا اور عربی سوار نے ایک ہی ضرب میں راجہ کا کام تمام کر دیا۔ راجہ کے درباریوں اور اس کے عزیزوں نے یہ حال دیکھتے ہی ننگ و نام کا لحاظ بھی نہ کیا اور حصار اور در غالبا اڈچھ)

میں پناہ گزیں ہو گئے۔ "چچ نامہ" کے مصنف نے داہر کی بیوہ رانی لاڈی کے اس واقعہ کو جسے میر معصوم نے تاریخ سندھ میں اسکلندہ کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ ارور سے متعلق کیا ہے جیسا کہ اس کے حسب ذیل عنوان سے واضح ہوتا ہے۔

"رفتن لاڈی زن داہر بمخاطبت اہل حصار الور"

مزید برآں ارور کے محل وقوع کا جو نقشہ پرانے عرب مورخوں اور سیاحوں نے پیش کیا ہے۔ وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ارور اور اوچ ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔

مسعودی نے جو ۳۰۳ھ میں سندھ آیا ہے۔ لکھا ہے

" ملتان اور منصورہ کے درمیان ارور ہے جو منصورہ کے پرگنوں میں شامل ہے ملتان سے منصورہ تک جانے میں تین دن کے راستے پر مقام دوشاب ملے گا۔ پھر" ارور"[2] مسعودی نے ارور کو تمام دریاؤں کے سنگم پر واقع ایک شہر قرار دیا ہے اور اس طرح بات بالکل واضح کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے

فاذا انتھی جمیع ذلک الی مدینۃ الرور من غربیھا و ھی من اعمال المنصورۃ سمی ھنالک مھران۔ (مروج الذہب مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۲۸)

ترجمہ:۔ جب یہ تمام دریا رور کے مغربی جانب جا کر یک جا ہوتے ہیں۔ جو منصورہ کے ماتحت علاقوں میں سے ہے تو وہاں اس کا نام مہران ہو جاتا ہے۔

ابو دلف مشعر بن مہلل جو ۳۳۱ھ میں ہندوستان آیا ہے وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے ارور کا شہر حدود منصورہ میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے یہ ملتان کے برابر ہے اور اس کے گرد دو فصیلیں ہیں۔[3]

---

[1] یہ رائے مشہور مستشرق برگز (Burgs) کی ہے۔

[2] مروج الذہب مسعودی

[3] سفرنامہ ابن مہلل بحوالہ رہبر السیاحہ:

ابو اسحاق اصطخری نے جو ۳۴۰ھ میں ملتان آیا اور بشاری مقدسی نے جو ۳۷۵ھ میں یہاں تھا ملتان سے ارور کا فاصلہ تقریباً ساٹھ میل بتایا ہے۔ اصطخری نے ارور کے محل وقوع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ ملتان اور ارور کی مسافت کو یوں واضح کرتا ہے۔" اب مغرب سے جنوب دریا کے مشرقی جانب ملتان سے بسمد دو مرحلہ (۲۴ میل) بسمد سے ارور ۳ مرحلہ (۳۶ میل) پر واقع ہے"۔

بشاری مقدسی کا بیان اصطخری کے معین کردہ فاصلہ کے عین مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے۔

" ملتان سے بسمد دو مرحلہ پر اور بسمد سے ارور ۳ مرحلہ پر ہے[1]۔

ابن حوقل بغدادی کا زمانہ آمد ۳۶۷ھ ہے۔ وہ کہتا ہے[2]۔

" سندھ کے بڑے شہروں میں سے ایک ارور ہے۔ طول و عرض میں ملتان کے برابر ہے۔ اس کی دو شہر پناہیں ہیں۔ یہ بھی دریائے سندھ کی مشرقی جانب آباد ہے لیکن اس کا شمار منصورہ کی حدود میں ہے"۔

منصورہ کے محلِ وقوع کے بارے میں بھی مورخین نے تحقیق سے کام نہیں لیا۔ بعض نے اسے حیدرآباد کے قریب کوٹری کے آس پاس ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن پرانے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منصورہ سکھر روہڑی کے آس پاس کہیں واقع تھا۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں بکھر کو منصورہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے[3]۔

" سندھ کے مشہور شہر بکھر کا پرانا نام منصورہ تھا۔ یہاں آ کر چھیوں دریا مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور دو حصوں میں بٹ کر اس کے نیچے سے گزرتے ہیں۔

---

[1] احسن التقاسیم بشاری مقدسی

[2] اشکال بلاد (ذکر السند)

[3] آئین اکبری صفحہ ۱۶۰ ج ۲

ایک حصہ دکھن اور ایک حصہ اتر ہو کر" گویا سکھر اور روہڑی کے درمیان جو جزیرہ واقع ہے اس کا پرانا نام منصورہ تھا اور بعد میں بکھر کے نام سے مشہور ہوا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی مشہور کتاب "عرب ہند تعلقات" میں آئین اکبری کی اس وضاحت کو صحیح قرار دیا ہے لیکن اس کے برعکس اگر منصورہ کو کوٹڑی کے قریب کہیں ثابت کیا جائے تو مشہور مورخ مسعودی کی یہ روایت غلط ثابت ہوتی ہے کہ ارور ملتان اور منصورہ کے وسط میں واقع ہے اور اگر ارور سے سکھر کے قریب کا پرانا دارالحکومت مراد لیا جائے تو بشاری مقدسی اور اصطخری کا ملتان اور ارور کے درمیان تعین کردہ فاصلہ درست نہیں رہتا۔ بنا بریں توجیہہ و تطبیق کی اور کوئی صورت سوائے اس کے نہیں کہ ارور اور اوچ کو ایک ہی بستی قرار دیا جائے۔

کچھ عرصہ پہلے تہران سے ایک عربی کتاب "حدود العالم من المشرق الی المغرب" طبع ہو کر شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اپنی قدامت و ندرت کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ اس کا سن تصنیف ۳۷۲ھ ہے۔ سندھ کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کے مصنف نے ارور کا حال بھی لکھا ہے اس کی رائے میں دریائے سندھ کے پار کا علاقہ سندھ کہلاتا ہے اور ارور کو وہ ہندوستان میں شامل کرتا ہے جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے۔

سندھ کے حدود اربعہ کا جو نقشہ اس نے دیا ہے اس کی رو سے سندھ کے مشرق میں دریائے سندھ، جنوب میں سمندر، مغرب میں کرمان اور شمال میں وہ بیابان ہے جو خراسان سے متصل ہے۔

گویا ارور جو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کا شہر ہے دارالحکومت اور سے بالکل متصل ہے جو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے دریائے سندھ کے جنوب میں پڑتا ہے اور وادیٔ سندھ کی حدود کے اندر شامل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ظہور اسلام کے بعد کی دو تین صدیوں تک اوچ یا ارور کی حیثیت ایک عام شہر کی سی ہو کر رہ گئی تھی اور ملتان یا منصورہ

ئی راج دھانی سے متعلق ہونے کے باعث یہ مرکزیت کا امتیاز کھو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے نصف اول تک اس شہر کی اہمیت کے بارے میں کوئی خاص تذکرہ کتب تواریخ میں موجود نہیں ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ سندھ کے بڑے شہروں میں اس کا شمار تھا جیسا کہ ابودلف مشعر مہلہل نے اپنے سفرنامہ میں اور ابن حوقل بغدادی نے اپنی مشہور کتاب اشکال البلاد میں اس شہر کو آبادی اور وسعت کے اعتبار سے ملتان کے برابر قرار دیا ہے اور اس کی دوہری شہر پناہ کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کی زمین نمناک ہے۔

بہر حال یہ امر شک و شبہ سے بالا ہے کہ ارور اوچ ہی کا دوسرا نام ہے اور ارور کو الور سے نسبت دینے کی جو غلطی کی گئی ہے وہ ان دو لفظوں کی باہمی مشابہت کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اوچ کا محل وقوع ارور کے محل وقوع کی طرح دریائے سندھ کی مشرقی جانب ہے جب کہ الور جو سندھ کا قدیمی دارالحکومت ہے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے جنوب میں ہے۔

یہ فرق سندھ کے قدیم نقشہ جات کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جن میں ارور اور الور نام کی دو بستیاں الگ الگ دکھائی گئی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ قدیم بستیوں میں صرف ارور ہی ایک ایسی بستی ہے جو دریائے ہکڑہ کے شمالی کنارے پر ٹھیک اسی مقام پر واقع ہے جہاں اوچ نظر آتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں جو عرب مورخ سندھ اور ملتان کے علاقہ میں سے گزرے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اوچ کا ذکر اس نام سے نہیں کیا حتیٰ کہ بعد کے عرب مورخوں نے بھی جو اوچ میں اقامت گزیں ہوئے اور جن میں چچ نامہ کے مؤلف ابوبکر علی بن حامد کوفی بھی شامل ہیں۔ اوچ نام کی کسی بستی کا مطلقاً ذکر نہیں کرتے البتہ اوچ کے محل وقوع پر آباد ارور نام کی ایک بستی کا ذکر کم و بیش تمام مورخین نے کیا ہے۔ مسعودی ابن حوقل اصطخری اور اس عہد کے دیگر مورخین نے ارور کا جو اتہ پتہ بتایا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ارور اوچ ہی کا دوسرا نام تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس بستی کا قدیمی نام ادچ ہے تو اس نام سے عرب مورخوں بالخصوص چچ نامہ کے مؤلف نے کیوں اعراض کیا۔ یہ خاصا اہم سوال ہے اور ہم یہاں اس کا مختصر سا جواب پیش کر رہے ہیں گو اس کے لئے کوئی مستند ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے اور یہ محض قیاس آرائی ہو گی تاہم یہ قیاس آرائی بھی واقعات کی روشنی میں اور مستند تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہے اس لئے حقیقت سے زیادہ قریب ہو گی۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا رانی وحسلا کے عہد میں یعنی ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح یہ بستی "اسکلند" "وسا" کے نام سے مشہور تھی اور یہ شہر رانی وحسلا کا پایۂ تخت تھا پھر راجہ کفند اور اس کے بیٹے راجہ آیند کے دور حکومت میں بھی یہ بستی نمایاں اہمیت کی حامل اور ایک صوبہ کا دارالحکومت تھی۔

اسکندر رومی نے اس بستی کو اپنے نام سے منسوب کیا اور اس کا نام اسکندریہ رکھا مگر یہ نام بھی کچھ زیادہ رواج پذیر نہ ہو سکا اور یہ اپنے قدیم نام اسکلندہ ادسایا محض اسکلندہ کے نام سے متعارف رہا۔

قدیم سنسکرت میں اور قدیم پہلوی زبان میں اسکلند مضبوط حصار کو کہتے ہیں۔ چچ نامہ میں چچ برہمن کی فتوحات کے ذیل میں اور محمد بن قاسم کی فاتحانہ یلغار کے ضمن میں اس مقام کا نام اسکلندہ درج ہے۔ چچ نامہ کا اصل مصنف ایک عرب تھا۔ جسے محمد بن قاسم کی فوج میں شریک ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ مقام اسکلندہ کے قدیم نام ہی سے معروف تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے جن مورخوں نے اوچ کو ارور سے تعبیر کیا ہے وہ سب کے سب یہاں اس دور میں آئے جب یہاں قرامطہ برسراقتدار تھے اور قرامطہ کی حلقہ بگوشی یہاں کا مشہور قبیلہ "سومرہ" اختیار کر چکا تھا۔ سومرہ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ سمیری قوم کے بقیۃ السیف لوگ تھے جن کا آبائی وطن عراق کا مشہور شہر اُر تھا تبلیغ کی مبادیات سے جو لوگ واقف ہیں انہیں یہ بتانے کی چنداں ضرورت

نہیں کہ اپنی تبلیغ کو موثر بنانے کے لئے مبلغوں نے ہمیشہ نفسیاتی حربوں سے کام لیا ہے چونکہ قرامطہ کا مرکزی مقام بھی "تل اسمار" ہی کے قریب واقع تھا اور اُر کے قدیم عراقی شہر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ اس لئے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہ قرامطہ نے اپنی دعوت کو اثر انگیز بنانے کے لئے سومرہ قبیلہ کا ان کے قدیم آبائی وطن سے جذباتی تعلق قائم کرنے کی غرض سے اس بستی کا نام ارور رکھ دیا ہو۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سلطان محمود غزنوی چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہاں پہنچا ہے۔ اس کی آمد کا مقصد قرامطہ کا استیصال تھا۔ وہ ۳۹۶ھ میں ملتان اور اوچ پر حملہ آور ہوا ہے۔ اس کے مصاحبین میں یمینی ایک مشہور مورخ بھی اس کا ہم سفر تھا۔ تاریخ یمینی میں ارور نامی بستی کا کہیں ذکر نہیں ملتا البتہ بھاٹیہ کا ذکر اس میں موجود ہے۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اوچ کا نام ارور صرف ڈیڑھ سو برس کی اس مختصر سی مدت کے دوران مشہور ہوا۔ جب تک یہاں قرامطہ کا تغلب تھا جونہی قرامطہ منظر سے غائب ہوئے یہ بستی بھاٹیہ کہلانے لگی۔

قرامطہ کی سرگرمیوں اور ان کی دسیسہ کاریوں سے جو لوگ بخوبی واقف ہیں، وہ ان کی اس قسم کی جدت آفرینیوں سے چنداں متعجب نہیں ہوں گے جیسا کہ انہوں نے اپنے مرکزی مقام کا نام "دارالہجرۃ" رکھا تھا۔ ممکن ہے اس طرح انہوں نے اپنے غلبہ اقتدار میں اوچ کو ارور کا نام دے دیا ہو۔ بہر حال تیسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے اواخر تک اوچ غائب ہے اور ارور کے نام سے جس بستی کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے وہ سب اوچ کی تمام خصوصیات کی حامل ہے اور یقیناً اوچ ہی ہے۔

البتہ اسلامی دور میں شہاب الدین غوری کے عہد سے اس قصبہ کا نام اوچ تقریباً تمام تاریخی کتابوں میں مذکور ہے۔ تاریخ مبارک شاہی، طبقات ناصری، جوامع الحکایات

تاریخ فرشتہ وغیرہ میں اوچ ہی کے نام سے اس بستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ لفظ اوچ کی ابتدا اس دور سے ہوئی۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کے ادوار میں اوسا، اچھا وغیرہ نام ملتے ہیں جو صوتی اعتبار سے اوچ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ اوچ کے ناموں کا یہ اختلاف اس امر کا غماز ہے کہ اگرچہ اس بستی کا قدیم ترین نام تو وہی ہے جو "اشاس دیوی" کی مناسبت سے رکھا گیا تھا لیکن بعد کے زمانوں میں حالات کے تغیر اور اقتدار کی پے در پے تبدیلیوں کے ساتھ اس کے نام بھی بدلتے رہے۔ کبھی یہ صرف "اشاس" کہلاتا تھا۔ پھر جب یہاں ایک سنگین حصار قائم ہو گیا تو اسے اسکلند اوسا کہا جانے لگا (اسکلند کے معنی ہیں مضبوط قلعہ کے) پھر جب اسکندر رومی نے اس سرزمین پر اپنا تسلط جمایا تو یہ اوسا اور اسکلندہ کی بجائے اسکندریہ بن گیا۔ جب بھٹیوں کے زیر اثر آیا تو بھاٹیہ کے نام سے مشہور ہوا اور جب قرامط کی تحریک سے سومرہ قبیلہ کے لوگ متاثر ہوئے تو یہ بستی ارور کہلائی۔ جو سومرہ قوم کی قدیم ترین آبادی کی نشان دہی کرتی تھی۔

شہروں اور بستیوں کے ناموں میں اس قسم کی تبدیلیاں خلاف معمول نہیں ہیں سیاسی ادوار کی تبدیلیوں سے شہروں کے نام اکثر و بیشتر متاثر ہوتے رہے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ میں تو بہ کثرت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شہر کا نام بدل کر اس کی جگہ دوسرا کوئی نام رکھ دیا گیا اور صدیوں تک وہ شہر اس نئے نام سے پکارا جاتا رہا۔ ہندوستان کا مشہور شہر الہ آباد کا پرانا نام پراگ ہے لیکن اسلامی دور میں اسے الہ آباد کہا جانے لگا۔ اب جب کہ وہاں ہندو برسر اقتدار ہیں اسے دوبارہ پراگ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ وارانسی صدیوں تک بنارس بنا رہا مگر اب پھر اپنے پہلے نام سے پکارا جا رہا ہے۔

مدینہ منورہ کا پرانا نام یثرب تھا لیکن ہجرت نبویؐ کے بعد یہ مدینۃ الرسولؐ کے نام سے مشہور ہوا تاہم اس کا سابقہ نام بھی قائم ہے۔ مکہ مکرمہ کا پرانا نام بکہ ہے۔ لیکن آج بہت کم لوگ اس کے اس نام سے متعارف ہیں [illegible]

اہمیت بدستور مسلّم ہے۔ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا روس کے آمر مارشل اسٹالن کے دور میں ایک شہر کا نام اسٹالن گراڈ رکھا گیا مگر جونہی شخص مذکور کا اقتدار ختم ہوا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے حریفوں کے ہاتھوں میں زمام اقتدار آئی سٹالن گراڈ کی بجائے اس شہر کو اس کے سابقہ نام سے پکارا جانے لگا۔ کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت سے اوچ بھی دوچار ہوا اور اس کے ناموں میں بھی سیاسی قسم کے تغیرات اثر انداز ہوتے رہے ورنہ اس کا موجودہ نام اوچ اشاس یا اساس ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو تقریباً ۹ سو برس سے بدستور معروف ہے۔

ہمارے سامنے دہلی کی مثال موجود ہے جس کا پہلا نام " اندر پرست " تھا مگر ایک راجہ دہلو جب برسر اقتدار آیا تو یہ " اندر پرست " سے دہلی بن گیا پھر شاہجہان کے عہد اقتدار میں اس کا نام شاہجہان آباد پڑ گیا اور یہ اسی نام سے کافی عرصہ تک مشہور رہا۔

اوچ کا محلِّ وقوع

اوچ کے بارے میں مختلف تاریخی تذکروں اور سفرناموں میں جو مواد ملتا ہے ہم اسے یہاں یک جا طور پر پیش کر رہے ہیں اس سے قارئین کو اوچ کے محل وقوع اور اس کی جغرافیائی اہمیت کا بخوبی علم ہو سکے گا۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ آریاؤں کی بیشتر آبادیاں دو یا زیادہ دریاؤں کے سنگم کے تکونی علاقے میں بسائی گئی ہیں[1]۔ اوچ کا محلِ وقوع بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے یعنی وہ دریائے ستلج کے جنوبی کنارے پر آباد ہے اور دریائے ستلج اور دریائے چناب کے ملاپ سے مثلث کا جو زاویہ بنتا ہے اس میں واقع ہے[2]۔

اوچ سابقہ ریاست بہاول پور میں پنجند کے مغربی ساحل پر آباد ہے۔ ملتان سے اس کا فاصلہ ۷۰ میل اور بہاول پور شہر سے اس کی مسافت ۳۸[3] میل ہے اور یہ بہاولپور کے جنوب مشرق میں واقع[4] ہے۔

---

[1] قدیم تاریخ ہند

[2] امپیریل گزیٹیر آف انڈیا اور معجم الامکنہ

[3، 4] معجم الامکنہ فاصلے کا تعین غلط ہے اوچ بہاول پور شہر سے تقریباً ۴۴ میل کے فاصلے پر ہے۔

اوچ کے بارے میں تقریباً تمام تذکرے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دریاؤں کے مقام اتصال پر آباد کیا گیا ہے اور اسکندر رومی کی فوجی مہم کے ضمن میں اس کا نام بھی آتا ہے۔ وی۔ اے اسمتھ نے لکھا ہے کہ :۔

یہ قطعی ناممکن ہے کہ سکندر کے زمانہ میں دریاؤں کے مقام اتصال کا تعین کیا جا سکے لیکن ایک مدت مدید کے بعد ابتدائی عرب مصنفوں کے زمانہ میں تمام دریا ایک مقام پر ملتے تھے جو " ودش آب " کہلاتا تھا اور موجودہ ریاست بہاول پور کے علاقہ میں واقع تھا۔ ۱؎

ابتدائی عرب مورخوں میں مسعودی ایک ایسا مورخ ہے جس نے " ودش آب " کا ذکر کیا ہے اور اس سے متصل ایک شہر روڑ ۲؎ کا ذکر کیا ہے جہاں تمام دریا ہم ہو کر دریائے " مہران " بن جاتے ہیں۔

ڈیوڈراس نے اپنی کتاب " پانچ دریاؤں کی سرزمین اور سندھ The land of five rivers and Sind " میں اوچ کے متعلق لکھا ہے۔

چنی دی گوٹھ ریلوے اسٹیشن، خانپور سے ۴۰ میل پر ہے۔ اس کے مغرب میں ۶ میل کے فاصلے پر اوچ ایک پرانا شہر ہے جو دریائے پنج ند کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ موجودہ بستی چھوٹی اور غیر معروف ہے اور پرانے شہر کے کھنڈروں پر اس کی بنیاد ہے جب کہ ایرین (Arrien). لکھتا ہے کہ یہ سکندر اعظم کے حکم سے دریاؤں کے مقام اتصال پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اپنے محل وقوع کے قدرتی ذرائع کے سبب۔ یہ شہر جلد ہی متمول اور آباد ہو گیا۔ سندھ کے چار مشہور علاقوں میں سے ایک علاقہ یا صوبہ کا دارالحکومت اوچ تھا۔ سکندر اعظم کے چلے جانے کے بعد

۱؎ قدیم تاریخ ہند

۲؎ مروج الذہب مسعودی

۳؎ ہم نے اوچ کے ناموں کی بحث میں ثابت کیا ہے کہ اوچ، روڑ اور اسکندریہ ایک ہی شہر کے تین نام ہیں

"آیند بن کفند" اس علاقہ کا حکمران بنا۔ شہر کا نام اس وقت اسکنڈہ اوسا تھا جو "الیگزینڈریہ اوچا" کا بگڑا ہوا ہے۔ جنرل کننگھم کے خیال میں یہ وہی شہر ہے جسے چچ نامہ میں اسکندریہ لکھا گیا ہے۔ اس شہر کو چچ نے اپنے ملتان کے محاصرہ میں حاصل کیا تھا۔ اوچ بہت انقلابات کا شکار ہوتا رہا ہے۔ اسے محمود غزنوی نے فتح کیا۔ محمد غوری نے اس پر اپنا تسلط قائم کیا۔ ۱۵۲۴ء میں حسن ارغون سندھی نے اسے تباہ کیا۔ ملتان کی فتح کے بعد حسن ارغون نے اس کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کا حکم دیا اور بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لئے قلعہ کے اندر بہت سی فوج متعین کر دی۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں اوچ ہمیشہ کے لئے مغل سلطنت کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور ملتان کے صوبہ کا ایک ضلع قرار دیا گیا۔

اوچ اب ریاست بہاول پور میں ہے۔ اس کے قریب قریب چند ایک کھنڈر ٹیلے اور پشتے ہیں۔ مسلمان اس مقام کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ یہاں سادات کے مشہور پانچ شہیدوں کے مزارات ہیں۔ یہ مقام رائے ساہسی دوم کے قلعوں میں سے ایک تھا۔

تیمور اور اکبر کے زمانہ تک۔ چناب اور سندھ کا جنکشن اوچ کے محاذ میں مٹھن کوٹ کے موجودہ مقام اتصال کے اوپر ۶۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہ اس وقت تک تبدیل نہیں ہوا تھا جب تک کہ "رینل" نے ۱۷۸۸ء میں ہندوستان کا جغرافیہ لکھا اور ۱۷۹۶ء میں مرزا مغل بیگ نے اس علاقہ کا سروے کیا مگر موجودہ صدی کے آغاز میں دریائے سندھ کے رخ بدلنے سے اوچ سے ۳۰ میل اوپر ایک پرانی شاخ کو چھوڑ کر جنوب مغرب کی جانب بہہ نکلا اور مٹھن کوٹ پر دوسری شاخ میں شامل ہو گیا۔

سر ہنری ایلیٹ نے اپنی کتاب مورخین سندھ (Historians of Sind)، میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ سندھ کی قدیم سلطنت چار صوبوں میں تقسیم تھی ان میں سے تیسرا صوبہ قلعہ اسکنڈہ اور "ماںبار" پر مشتمل تھا۔ اس علاقہ کو "طواڑا اور پچ پور بھی کہتے ہیں۔ دریائے بیاس کے قریب واقع ہونے اور اسکنڈہ اوسا نام کی وجہ سے

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام موجودہ اوچ ہی تھا۔

اوچ ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ چچ نامہ میں اس کا ذکر اس نام سے شاید اس لئے نہیں ملتا کہ اس دور میں یہ کسی اور نام سے مشہور ہوگا ورنہ چچ اور محمد بن قاسم کے زمانہ کے بیشتر تاریخی واقعات اس مقام کے گرد و پیش رو نما ہوئے ہیں۔ "اسٹریبو" اور ایرین کے بیان کے مطابق اس کا محل وقوع دریائے چناب کے سنگم کے قریب واقع ہے۔ اس مقام کی شناخت اور اس کے تعین کے بارے میں ہماری یہ رائے غالب قیاس کی بنا پر ہے۔

کرنل منچن جو عرصۂ دراز تک ریاست بہاول پور میں دولتِ انگلشیہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے متعین رہا ہے، اوچ کے محل وقوع کے متعلق لکھتا ہے۔

"سر ہنری الیٹ کی تاریخ چچ نامہ کے مطابق جسے وہ اصل عربی کتاب چچ نامہ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ موجودہ ریاست بہاول پور مملکت الور کا ایک جزو ہے اسے اسکلنڈہ اور پبیا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پہلا نام اسکلنڈہ تو اوچ کا پرانا نام ہے اور دوسرے نام کے متعلق مجھے یہ اعتماد ہے کہ اس کا ترجمہ "ماورأ بیاس" کرنا چاہئے۔ جس طرح میں نے واضح کیا ہے۔ اوچ کا قصبہ اس دریا کی ایک پرانی شاخ کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور یہ قلعہ کی صورت میں ان دریاؤں کے مقام اتصال کے ڈیلٹا پر واقع ہے۔"

سر الیگزینڈر کننگھم نے "قدیم جغرافیہ ہند" میں اوچ کے محل وقوع اور اس کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"پنجاب کے دریاؤں کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ مقام نہایت اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اسی مقامی اہمیت کے باعث یہ قصبہ ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنتا رہا۔ یہ ایک بہت بڑی منڈی اور سیاحوں اور حج پہ جانے والوں کے لئے ایک بندرگاہ کا درجہ

رکھتا تھا۔

تحفۃ الکرام میں جو ۱۱۸۱ھ میں معرضِ تحریر میں آئی۔ اوچ کو ملتان کے صوبہ کے ماتحت علاقہ بتایا گیا ہے۔ مولوی علی شیر قانع ٹھٹھوی لکھتے ہیں۔

"اوچ خطۂ نامی وبقعہ گرامی از قدیم توابع ملتان است ارضش از جملہ شش اکنہ است کہ رائے ساہسی بن سیہرس قلعہ جات آں را بر رعایا عوض محصول حکم انباشتن خاک فرمودہ بود[1]"

ترجمہ:۔ اوچ ایک معزز مقام اور بابرکت سرزمین ہے اور عرصۂ دراز سے ملتان کے ماتحت ہے۔ یہ بستی ان چھ مقامات میں سے ہے جن کے قلعوں کو رائے ساہسی بن سیہرس نے لگان کے عوض اپنی رعایا کو مٹی سے بھرنے کا حکم دیا تھا"

سندھ کی قدیم تاریخ کے مؤلف، مرزا قلیچ بیگ لکھتے ہیں۔

"ملتان کے پرگنوں میں اوچ بھی ایک بڑا شہر ہے . . . . . سندھ کی پرانی تاریخوں میں اوچ اور ملتان کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں قلعے ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ہندو راجاؤں کے زمانہ میں یہ شہر سات بڑے قلعے والے شہروں میں سے تھا۔ یہاں ایک علیحدہ حاکم متعین تھا۔ عربوں کی فتح کے بعد بھی یہاں ایک علیحدہ حکمران رہتا تھا۔ یہ آبادی زمین کی سطح سے بلندی پر ہے اس لئے اس کو اوچ کہتے ہیں[2]"

سرچارلس میسن ایک مغربی سیاح نے ۱۸۲۶ء میں اپنے سفر نامہ میں اوچ

---

[1] تحفۃ الکرام ص ۳۶۳

[2] مرزا قلیچ بیگ کی یہ تاریخ سندھی زبان میں ہے اور اس کا نام ہے

"قدیم سندھ انجا مشہور شہر ماڑھو" یعنی قدیم سندھ اس کے مشہور شہر اور وہاں کے مشہور آدمی۔

کے محل وقوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

" اوچ غالباً اس ملک کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے جو اپنے بازاروں اور اچھی تجارت کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہ چونکہ دریائے گھارا کے کنارے پر واقع ہے اس لئے غلّہ سے بھری ہوئی کشتیاں یہاں سے سندھ کی طرف جاتی رہتی ہیں۔ یہ مقام اپنے قدیم کھنڈروں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے جو بہت وسیع ہیں۔ یہ علاقہ نہایت زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ احمد پور سے ۱۸ میل اور ملتان سے تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے"[1]

خزینۃ الاصفیہ کے مؤلف منشی غلام سرور لاہوری اپنی مشہور تاریخ "مخزن پنجاب"[2] میں لکھتے ہیں۔

اوچ سیدوں کا، بہاول پور کی ریاست سے متعلق یہ ایک پرانا شہر ہے۔ دریائے پنجند کے بائیں کنارے سے بفاصلہ چار میل آباد ہے۔ اوچ کی آبادی گنجان گلیاں تنگ، بازار کشادہ اور بڑے ہیں۔ برتن ہر ایک دھات کے عمدہ و خوبصورت بن کر یہاں سے اور ملکوں میں تحفہ بھیجے جاتے ہیں۔ تجارت بھی اگرچہ یہاں ہر قسم کی ہوتی ہے مگر برتنوں کی تجارت بہت ہی وافر ہے۔

مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ جو آٹھویں صدی ہجری میں یعنی ۷۳۴ھ میں اوچ پہنچا ہے اپنے سفرنامہ میں رقم طراز ہے۔

" بھکر سے چل کر ہم اوچ کے شہر میں پہنچے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے اور بڑا شہر ہے۔ بازار بہت عمدہ ہیں اور عمارتیں مضبوط ہیں"[3]

اوچ کا جغرافیائی محل وقوع شمال عرض بلد ۱۴-۲۹ اور مشرق طول بلد ۴-۱۰ ہے[4]

---

[2] یہ کتاب ۱۸۷۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی ہے [3] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد ۲ صفحہ ۱۹،۱۰
[4] مجم البلدان۔ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اوچ ایک قدیم تاریخی شہر ہے ۔ دریاؤں کے مقام اتصال پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ شہر بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ آبی گزرگاہ کا ایک اہم جنکشن اور بڑی معروف بندرگاہ تھی۔ بھکر اور ملتان کے دو اہم سیاسی مرکزوں کے بیچ میں واقع ہونے کی وجہ سے بھی یہ آمد و رفت کا بہت بڑا جنکشن تھا اور اپنے محل وقوع اپنی جغرافیائی اہمیت اور علاقہ کی سرسبزی و شادابی کے باعث حملہ آوروں، سیاحوں اور تاجر پیشہ لوگوں کے لئے زبردست کشش کا حامل تھا

باب دوم

اوچ مختلف تاریخی ادوار میں

آریائی دور سے پیشتر یعنی آج سے پانچ ہزار سال قبل سندھ میں دو قوموں کی آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ ایک جاٹ اور دوسری مید۔ زمانۂ قبل از تاریخ کی یہ دونوں وحشی قومیں دریائے سندھ کے کنارے آباد تھیں[1]۔ ان میں جب اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہوئی اور نوبت خون خرابہ تک پہنچی تو فریقین کے سمجھدار لوگوں نے دریودھن سے درخواست کی کہ وہ سندھ کی سرزمین کو اپنی عملداری میں لے کر یہاں کوئی حاکم مقرر کر دے۔ چنانچہ دریودھن نے اپنی بہن رانی دھسلا کو اس علاقہ کا حکمران بنا دیا۔ رانی دھسلا کے شوہر کا نام جیدرتھ تھا یہ واقعہ مہا بھارت کی جنگِ عظیم سے پہلے کا ہے[2]۔ راجہ جیدرتھ نے کوروؤں پانڈوؤں کی کش مکش اقتدار میں کوروؤں کی جانب سے اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا اور مارا گیا۔ راجہ جیدرتھ کا عہد بارھویں یا تیرھویں صدی قبل از مسیح[3] ہے۔ پانڈوں کی فتح کے بعد راجہ بھرت نے سندھ پر اپنے حریف قبیلہ کی اس رانی کی

---

[1] تاریخ سندھ مصنفہ ابوظفر ندوی مرحوم ص ۱۱

[2] مجمل التواریخ بحوالہ تاریخ ہند از ایلیٹ ص (Historians of Sind),

[3] جغرافیہ سندھ ص ۱

حکومت کو برقرار رکھا۔ رانی دھسلا کا پایۂ تخت "اسکالندا" تھا۔

رانی دھسلا ۲۴ برس تک اس علاقہ پر حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گئی اس کے بعد اس کا بیٹا سنجیورا تخت حکومت پر متمکن ہوا۔

سنجیورا کے جانشینوں میں راجہ پال کا نام ملتا ہے جس نے دارالحکومت اسکالندا کو از سر نو تعمیر کرایا اور اسے ایک خوبصورت شہر بنانے میں ذاتی طور پر دلچسپی لی اور کئی نئے شہر بھی بسائے۔ اس کے عہدِ حکومت میں ٹیکسٹائل انڈسٹری بڑے عروج پر تھی اور دارالحکومت میں جو کپڑا تیار ہوتا تھا وہ دساور بھیجا جاتا تھا اور عمدہ کوالٹی کے لئے دور دور تک مشہور تھا۔ اس کپڑے کی برآمد کے لئے ضروری تھا کہ اس پر بادشاہ کے پاؤں کا زعفرانی رنگ کا نشان ثبت ہو۔ رانی دھسلا کے خاندان کے مزید کسی حکمران کے بارے میں تاریخ سے کوئی سراغ نہیں[1] ملتا۔

دہلی میں قطب مینار کے پاس قوت الاسلام مسجد کے صحن میں لوہے کی جو لاٹھ نصب ہے اور جس کا زمانۂ تعمیر ۸۹۵ ق۔م[2] ہے۔ اس لاٹھ پر سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط میں تین اشلوک کندہ ہیں جن کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ :-

" والئ سندھ نے فوج جمع کی تھی تاکہ راجہ دھاوا پر حملہ کرے۔ راجہ دھاوا جو اس لاٹھ کا بانی ہے۔ اس کا اصل نام میدھاوی تھا اور وہ راجہ سونی کا بیٹا تھا جس نے سونی پت کا شہر بسایا۔ راجہ میدھاوی عرف راجہ دھاوا جدھشٹر کی اولاد میں سے انیسواں راجہ تھا۔ راجہ دھاوا نے سندھ کے راجہ سے لڑائی لڑی۔ اپنے طاقت ور حریف کو شکست دی اور سندھ کو فتح کر لیا۔ اس فتح کی خوشی میں اس نے بطور یادگار یہ لاٹھ نصب کروائی[3]" اس لاٹھ پر کندہ عبارت کا پہلا پیراگراف یہ ہے۔

---

[1] مقتبس از مجمل التواریخ (Historians of Sind by H. M. Elliot).

[2] بعض کتابوں میں اس لاٹھ کا سن تعمیر ۵۰۹ ق م درج ہے (آثار الصنادید)

[3] یہ تمام معلومات آثار الصنادید مصنفہ سر سید احمد خاں سے ماخوذ ہیں۔

"اس شخص نے کہ جس نے یہ خبر سنی کہ میرے دشمن اچھے سپاہ اور رفیقوں کے ساتھ مجھ سے لڑائی اور مورچہ بندی کی تیاری کرتے ہیں۔ ایک آلہ شہرت کا کھدوایا جس طرح کہ اس کی تلوار کے زخم اعضائے دشمناں پر۔ جو شخص کہ مالک سات سلطنت کا تھا اس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے سندھیوں میں دھلیبہ کو دبا لیا۔ اس کی باقاعدہ فوج اور اس کی گھاتیں جو بطرف جنوب اس دریا کے تھیں۔ اس زمانہ میں بھی پاکیزگی کے ساتھ یاد ہیں[1]۔"

ہندوستان میں سکندر اعظم کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے سندھ پر کفند نامی ایک راجہ حکمران تھا۔ کفند کے حسب و نسب کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ تاہم وہ ہندو نہیں تھا۔ ظن غالب یہ ہے کہ وہ بدھ مت کا پجاری تھا۔ بہرحال وہ ایک عادل اور انصاف پسند حکمران تھا اور اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہاں کے لوگوں کو رام کر لیا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی غالب اکثریت یعنی ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنے بھائی سامد کو حکم دیا کہ بہمن آباد میں آتش کدوں کی بجائے بت خانے بنائے جائیں اور ایرانیوں کے گورنر مہرا یا مہران کو وہاں سے نکال باہر کیا جائے۔[2]

متذکرہ بالا اقتباس سے جو ایلیٹ نے مجمل التواریخ کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں جب سندھ پر ایرانی اثر و نفوذ قائم تھا۔ یہاں جا بجا

---

[1] دھلیبہ یا دھلیبہ یا دسیلو غالباً وہی قوم ہے جس کا ذکر سکندر اعظم کے حملہ کے دوران قدیم تذکروں میں کہیں کہیں ملتا ہے (دیکھئے نوٹ)۔ اسی سے ملتا جلتا لفظ داہیہ بھی ہے۔ جو راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔ "کارنامہ راجپوتاں" مؤلفہ مولوی نجم الغنی میں اس قوم کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے: "یہ قدیم قوم ہے اور اس کی بود و باش لب دریائے سندھ جہاں اس کا شعبہ سے نقصان ہوا ہے تھی۔ اگرچہ اس قوم کے لوگ دو کلون ہیں سمجھے جاتے ہیں مگر اب ان کا کچھ پتہ و نشان نہیں ہے۔" صفحہ ۳۶

[2] سامد نے ہندوستان کے راجاؤں کی مدد سے مہرا کے خلاف محاذ قائم کیا۔   [3] آثار الصنادید صفحہ ۹

آتشکدے قائم کئے گئے اور اس علاقہ کو زرتشا کی مقدس آگ کا پجاری بنانے کی باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ [1]

کفند کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا آیند تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ اسکی سلطنت چار صوبوں میں تقسیم تھی جن میں سے ایک صوبہ کا صدر مقام اسکلند ادسا تھا۔ [2]

راجہ دھادا کی حکومت اس علاقہ پر کب تک قائم رہی اور اس کے جانشین کون لوگ ہوئے۔ اس کے بارے میں مزید کوئی روشنی نہیں ملتی جس سے سندھ پر اس کے غلبہ و اقتدار کے عرصہ اور اس کی مدت کا تعین کیا جا سکے لیکن اتنا معلوم ہے کہ ... ق م میں یہاں سوناگھ کا خاندان حکمران تھا۔ [3]

سوناگھ (Sunagh)، ایک پروہت کا چیلا تھا اور نہایت عادل اور انصاف منش حکمران ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس کے خاندان میں پندرہ پشتوں تک اقتدار کا سلسلہ قائم رہا۔ [4]

سوناگھ خاندان کے زوال کے دور میں جو غالباً ساتویں صدی قبل از مسیح میں شروع

صہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا اور تین برس تک وہاں محصور رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ کامیابی کی امید نہیں ہے تو اس نے ایک سرنگ کھدوائی اور اس کے راستے بھاگ نکلا اور کیاٹسا کے مقام پر جا پہنچا۔ بھن آباد سے روانگی سے قبل صہ نے اپنے حریفوں کو دھوکا دینے کی ایک انوکھی چال چلی۔ اس نے قلعہ کی چھت پر ہتھیاروں کو اس انداز سے سجایا کہ دور سے یوں معلوم ہوتا جیسے مسلح سپاہی ہتھیار لئے ہوئے حملہ کے لئے تیار بیٹھے ہیں جس سے ساھد وغیرہ کو اس کی روانگی اور سرنگ کے راستے بچ کر نکل بھاگنے کی متعلق خبر نہ ہو سکی۔ چند روز بعد جب کوے ان ہتھیاروں پر آکر بیٹھے تو ساھد کو اس کی چال کا علم ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہر حال قلعہ پر ساھد کا قبضہ ہو گیا اور یوں سندھ سے ایرانی اثرات کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔
(تاریخ ہند از ایلیٹ صفحہ ۱)

[1] ایلیٹ بحوالہ مجمل التواریخ صفحہ ۱۰۹ [2] ایضاً

[3] ایلیٹ بحوالہ مجمل التواریخ صفحہ ... ایضاً

[4] مقدمہ تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۲۶

ہوا۔ ایران کا ایک نامور بادشاہ فریدون سندھ کے علاقہ پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ بعض روایتوں میں یہ بات ملتی ہے کہ فریدون کے عہد سے پنجاب ہمیشہ شاہان عجم کے تصرف میں رہا ہے اور گرشب کی اولاد یعنی رستم اور اس کے آباؤ اجداد ہمیشہ کابل، زابل، سندھ اور نیمروز پر بطور جاگیردار کے قابض و متصرف رہے۔ [1]

پھر جب سام بن نریمان کی موت سے منوچہر کی سلطنت کمزور ہوئی اور شاہان ایران کے قدیم دشمن افراسیاب نے ایران پر غلبہ حاصل کیا تو زال بن سام کے عمال کو پنجاب اور سندھ سے نکالنے میں افراسیاب کی مدد کی گئی لیکن رستم بن زال نے سندھ، ملتان اور پنجاب کو فتح کر لیا۔ [2]

سندھ، ملتان اور پنجاب پر ایرانی تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اوچ کا خطہ بھی ایران کے زیر انتداب تھا لیکن ان ادوار کی تفصیلی تاریخ موجود نہیں ہے اس لئے قطعیت کے ساتھ کوئی حتمی اور یقینی بات نہیں کہی جا سکتی البتہ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ایران کے بادشاہ گشتاسپ کے حکم سے ایرانی سپہ سالار بہمن نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کے پورے علاقے کو مسخر کر لیا۔ اس نے سندھ میں اپنے نام پر ایک شہر بسایا جس کا نام "بہمن آباد" رکھا۔ بہمن کی حکومت ترکستان کی سرحد تک جا پہنچی جہاں اس نے اپنی ماں کی یاد میں جو ایک ترک عورت تھی ایک دوسرا شہر بسایا۔ جس کا نام "قندابیل" رکھا۔ [3]

چھٹی صدی قبل از مسیح کا دور ہندوستان کی تاریخ میں مذہبی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ دور تھا جب کپل وستو (نیپال) کے ایک حسین اور مقدس شاہزادے [4] نے آریاؤں کے برہمنی تصورات کے خلاف بغاوت کی، ہندوؤں کے

---

[1] مقدمہ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۷ و ص ۲۹ [3] ایلیٹ بحوالہ مجمل التواریخ

[4] یہ مہاتما بدھ تھے جنہوں نے ہندومت کے ذات پات اور چھوت چھات کے نظریہ کو غیر انسانی اور ناقابل عمل قرار دیا اور تمام بنی نوع انسان بلکہ تمام جاندار اشیا کے معاملہ میں رحم اور شفقت کے برتاؤ کی تلقین کی۔

سماجی نظریات کا طلسم توڑا اور ایک نئے فکری و عملی نظریہ کی داغ بیل ڈالی۔

اسی دور کے لگ بھگ ایک دوسرے ریفارمر مہاویر نے جین مت کی مذہبی تحریک کا آغاز کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب وادیٔ سندھ پر غیر ملکی حملہ آوروں کی یلغار کا سلسلہ قائم ہوا اور سندھ کا علاقہ مملکت ایران کا بیسواں صوبہ قرار پایا۔ [1]

اگرچہ سو برس پہلے بھی ایران کے ایک نامور فرمانروا فریدون کے عہد میں سندھ ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا مگر اس قبضہ و تسلط کی مدت کچھ زیادہ طویل نہ تھی۔

چھٹی صدی ق.م کے نصف اول میں "سائرس اعظم" نے جسے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن مقدس کا "ذوالقرنین" ثابت کیا ہے۔ [2] وادیٔ سندھ پر حملہ کے لئے ایک لشکر جرار بھیجا مگر اسے بھی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔

چھٹی صدی ق م کے آخری سالوں میں ایران کے عظیم الشان فرمانروا دارا گشتاسپ (Darius) نے جو سائرس (Cyrus) کا جانشین تھا سندھ کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

دارا گشتاسپ کا عہد حکومت ۵۲۱ ق م سے ۴۸۵ ق م تک ہے۔ اس نے ۵۱۰ ق م میں اپنا ایک معتمد جرنیل سکائی لیکس کو ہندوستان کی مہم پر بھیجا اور اس قابل سپہ سالار نے وادیٔ سندھ کا علاقہ مسخر کر لیا۔

وی۔اے اسمتھ نے اپنی کتاب "قدیم تاریخ ہند" [3] کے باب دوم صفحہ ۳۶ میں اس ایرانی حملہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"دارا ایک نہایت قابل بادشاہ تھا اس نے اپنے افسروں کو مختلف مہموں پر

---

[1] قدیم تاریخ ہند از وی اے سمتھ ص۳۶

[2] ترجمان القرآن سورہ کہف ج ۲ از مولانا آزاد

[3] کتاب انگریزی میں ہے اور اس کا نام ہے (Early History of India) حیدرآباد دکن سے اس کا اردو ترجمہ "قدیم تاریخ ہند" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

روانہ کیا اور ایشیا کے ایک بہت بڑے حصے کو چھان ڈالا۔ ان ہی میں سے ایک مہم ۵۱۶ ق م کے بعد روانہ کی گئی تاکہ دریائے سندھ کے دہانے اور ایران کے درمیان بحری راستہ دریافت کرے۔ دارا کے امیر البحر سکائیلیکس نے جو کیریا کے ایک قصبہ کریندا کا رہنے والا تھا۔ گندھار کے علاقے میں پنجاب کے دریاؤں پر جہازوں کا ایک بیڑا تیار کرایا اور وہاں سے بحر ہند کو عبور کرتا ہوا تیسرے مہینے بحر قلزم میں داخل ہوا۔

اس عجیب وغریب سفر کے تمام حالات بالکل ضائع ہو گئے ہیں[1] مگر یہ معلوم ہے کہ اس امیر البحر نے جو خبریں اثناء سفر میں جمع کیں وہ ایسی تھیں جن پر عمل کر کے دارا نے دریائے سندھ کے میدانوں پر قبضہ کر لیا اور اپنے جہاز بحر ہند تک پہنچا دیئے چنانچہ دارا کی فوج میں ہندی تیر اندازوں کا دستہ سب سے زیادہ مستعد سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ پلاٹیا کے مقام پر مارڈونس کی شکست میں شریک تھا۔

ہندی ستراپی

ہندوستان کا مفتوحہ حصہ ایک علیحدہ بیسویں ستراپی یا صوبہ بنایا گیا اور وہ تمام ایرانی سلطنت میں سب سے زیادہ دولت مند اور آباد صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا خراج تین سو ساٹھ ٹیلنٹ سونا یا ایک سو پچاسی ہنڈر ویٹ تھا۔ جو انگریزی سکہ کے ایک ملین کے برابر ہوتا ہے۔

یہ خراج ایرانی سلطنت کے تمام ایشیائی صوبوں کے خراج کا ایک تہائی حصہ تھا۔ اگرچہ اس صوبہ کے صحیح حدود کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ مگر ہم کو یہ معلوم ہے کہ وہ "ایریا" (ہرات) اراکوسیا (قندھار) اور گندھیریا شمال مغربی پنجاب کے علاقے نہ تھے اور اس لئے وہ دریائے سندھ کے گرد کا علاقہ ہو گا یعنی کالا باغ سے سمندر تک کی تمام زمین جس میں تمام سندھ اور شاید دریائے سندھ کے مشرق میں پنجاب کا ایک بڑا

---

[1] اس کی یادداشت کے تمام مسودے سمندر کی لہروں کی نذر ہو گئے (قدیم تاریخ ہند)

حصہ تھا لیکن اس زمانہ کے دو سو برس بعد جب سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دریائے سندھ ہندوستان اور سلطنت ایران کے درمیان حد فاصل تھا اور سندھ اور پنجاب پر بیشمار ہندی راجہ حکمران تھے۔

زمانہ قدیم میں دریاؤں کے راستے آجکل کے راستوں سے بالکل مختلف تھے اور پنجاب اور سندھ کے وہ وسیع قطعے جو آجکل ویران اور غیر آباد پڑے ہیں۔ کسی زمانہ میں سرسبز و شاداب تھے۔

یہی بات اس خراج کی عظیم تعداد کو سمجھانے کے لئے کافی ہے جو سلطنت ایران کو اپنے بیسویں صوبہ سے وصول ہوتا تھا۔ [1]

داریوس اول کی قبر پر جو سنگی کتبہ نصب ہے اور اس میں باجگزار صوبوں کی جو فہرست درج ہے ان میں صوبہ سندھ بھی شامل ہے۔ [2]

۳۲۶ ق م سکندر رومی ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور تمام حکومتوں کو مسخر کرتا اور تمام علاقوں کو روندتا اور ایک ایک حریف کو [illegible] کرتا ہوا اس مقام پر آ پہنچا جہاں پنجاب کے پانچ دریاؤں کا دریائے سندھ سے ملاپ ہوتا ہے۔

مشہور یونانی مورخ ایرین اور دیگر قدیم یونانی اور چینی مورخوں اور سیاحوں کی قابل اعتماد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پانچ دریاؤں کے سنگم کے علاقہ پر سکندر اعظم نے خصوصی توجہ مبذول کی اور اس مقام کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیش نظر یہاں ایک شہر کی تعمیر و ترقی میں ذاتی دلچسپی لی اور اسے ایک خوبصورت اور ہمیشہ آباد رہنے والے شہر کی حیثیت میں دیکھنے کی تمنا کی۔ [3] وی۔ اے اسمتھ لکھتا ہے۔

---

[1] قدیم تاریخ ہند

[2] ویدک ہند

[3] قدیم تاریخ ہند اور قدیم جغرافیہ ہند از کننگھم

"فلپوس کو مفتوحہ اقوام کا گورنر مقرر کرنے کے بعد بڑا اس سنگم سے گزر کر جہاں دریائے بیاس بڑے دریا سے ملتا ہے چوتھے سنگم کی طرف بڑھا جہاں دریائے جہلم، دریائے راوی، دریائے چناب اور دریائے بیاس اس دریا سے ملتے ہیں جسے قدیم مورخ "انڈس" لکھتے ہیں لیکن غالباً اس زمانہ میں سندھ کا گم شدہ دریا ہاکڑا ویہندہ موجود تھا اور پنجاب کے تمام دریا دریائے سندھ سمیت اس میں جا ملتے تھے اور اس طرح یہ ایک عظیم الشان دریا بن جاتا تھا جو بعد میں دریائے مہران کے نام سے مشہور ہوا۔"[1]

اسکندر رومی کے عہد میں ملتان اور سندھ پر جو قومیں حکمران تھیں اور جو قبائل خود مختار تھے ایرین کی تحقیق کے مطابق ان کے نام ایبسٹنوئی .(ABASTANOI) زنتھروئی یا اکسنھروئی ,(Xathori) تھے۔ ان قبائل نے یا تو از خود اطاعت قبول کر لی یا پھر انہیں زیر کر لیا گیا۔[2]

سکندر اعظم کے عہد میں سندھ اور ملتان شمالی پنجاب کا تمام علاقہ یونانی انتداب کے زیر اثر آ گیا۔ اسکندر نے مفتوحہ علاقوں میں یونانی وائسرائے مقرر کئے۔ فلپوس(Philippos) کو دریائے چناب اور دریائے سندھ کے سنگم کے علاقہ کا حکمران بنایا گیا اور سیلیوکس (Seleukos), کو جو اسکندر کا معتمد جرنیل تھا۔ باقی تمام علاقوں پر حاکم مقرر کیا گیا لیکن سکندر رومی کی واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان میں یونانی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا اور اس کا مقررہ کیا ہوا نائب فلپوس قتل کر دیا گیا اور سائلوکس کو چندر گپتا موریا کے زبردست اقتدار کا باجگزار بننا پڑا۔

سائلوکس نے اظہار نیاز مندی کے طور پر اپنی بیٹی چندر گپتا موریا کے عقد میں دے دی اور یوں اس کا برائے نام اقتدار قائم رہا۔

---

[1] قدیم تاریخ ہند [2] قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور قدیم تاریخ ہند

[3] چندر گپتا موریا کی سندھ پر براہ راست حکومت قائم نہیں ہو سکی۔ چندر گپتا کے بعد اس کا بیٹا بندوسار بھی سندھ سے لاتعلق رہا۔ البتہ بندوسار کے بعد جب اس کا بیٹا اشوک حکمران بنا تو اس نے اس علاقہ کو بھی زیر کر لیا۔

۲۷۳ ق م میں چندر گپتا موریا کا نامور پوتا اشوک اعظم تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ وہ ایک تارک الدنیا بھکشو بھی تھا اور عظیم الشان فرمانروا بھی۔ اس کی حدود سلطنت سری نگر سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بلوچستان، سندھ، پنجاب اور افغانستان کا تمام علاقہ اس کی قلمرو میں شامل تھا۔ اشوک بدھ مت کا زبردست مبلغ اور پُر جوش پیروکار تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سندھ میں بدھ مت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ لہ

چوں کہ سندھ میں غیر آریائی قومیں موجود تھیں جنہیں ہندوؤں نے ذات پات کی طبقاتی تقسیم کے ذریعے شودر بنا دیا تھا اور بدھ مت اس امتیاز کا قائل نہ تھا اس لئے یہ علاقے اس مذہب کی تعلیمات سے بہت کچھ متاثر ہوئے۔ سندھ میں بدھ مت کے اثرات ساتویں صدی عیسوی تک محسوس کئے جاتے رہے۔ اشوک کی موت کے بعد موریا سلطنت میں وہ اتحاد قائم نہ رہ سکا جو اشوک کی زبردست اور عہد آفریں شخصیت کے دم سے قائم تھا چنانچہ سلطنت کے دور افتادہ علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں اور پنجاب اور سندھ کے علاقے خود مختار ہو گئے

اشوک کے ایک بیٹے کا نام جلوک تھا جو اپنے عظیم باپ کے مرنے کے بعد سندھ، پنجاب، کشمیر اور قنوج کے علاقوں کا حکمران بنا۔ یہ اپنے باپ کے برعکس بدھ مت کا مخالف تھا۔

چندر گپتا موریا کے خسر اور اسکندر رومی کے معتمد جرنیل سائلوکس کے انتقال کے بعد ۲۶۱ ق م میں سائلوکس کا پوتا انٹیوکس (ANTIOCHOS)، حکمران بنا۔ یہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اس لئے اس کے نام کے ساتھ تھیوس (THEOS) کا لفظ بھی لکھا جاتا تھا جس کے معنی ہیں "خدا"۔

لہ مہاتما بدھ کا شمالی ہندوستان بالخصوص سندھ کے خطہ میں آنا تاریخی طور پر ثابت ہے۔ رحیم یار خاں کے اطراف میں ایک قدیم آبادی کے نشان ملتے ہیں جسے پتن منارا کہتے ہیں۔ اس کے متعلق بعض مورخین کی رائے یہ ہے کہ وہاں مہاتما بدھ نے ایک درسگاہ قائم کی تھی۔

لیکن اس خود ساختہ نہ کے خلاف باختر (BACTRIA) کے ڈیوڈوس نامی ایک شخص نے بغاوت کر دی جو اول الذکر کی جانب سے اس علاقہ کا گورنر تھا۔ انٹیوکس تھیوس ۲۶۴ ق م میں مر جس کے بعد ڈیوڈوس باختر کا بادشاہ بن گیا لیکن ایک سال کے بعد وہ چل بسا۔ ڈیوڈوس کے بعد اس کا بیٹا ڈیوڈوس ثانی کے نام سے ۲۴۵ ق م میں تخت نشیں ہوا۔ ۲۳۰ ق م میں مکنیسیا کے ایک شخص یوتھی ڈیمس نے بغاوت کر دی اور باختر کے علاقہ پر قابض ہوگیا۔ یوتھی ڈیمس کے خلاف شام کے بادشاہ انٹی اکس اعظم (ANTIOCHOS The Great) نے اعلان جنگ کر دیا۔ ایک عرصہ تک یہ جنگ برپا رہی۔ بالآخر ۲۰۸ ق م میں دونوں کے درمیان ایک معاہدۂ صلح طے پاگیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۲۰۶ ق م میں انٹی اکس اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا اور ہندوستانی راجہ سوبھاگ سین کو جو وادی کابل میں حکمران تھا اس بات پر مجبور کرے کہ وہ خراج ادا کرے۔ [1]

یوتھی ڈیمس (EUTHYDEMOS) کے بیٹے اور انٹی اکس کے داماد ڈیمیٹریس (DEMETRIUS), نے تقریباً ۱۹۰ ق م میں اپنے خسر کے مرنے کے بعد اس کے مفتوحہ علاقوں پر تسلط جمایا اور شمالی ہند کے مزید علاقوں کو زیر تصرف لے آیا۔ ڈیمیٹریس کی حدود سلطنت میں کابل اور پنجاب کے علاوہ سندھ کا علاقہ بھی شامل تھا۔

۱۷۵ ق م یوکریٹے ٹائڈیز نامی ایک شخص نے بغاوت کی جو باختر کا باشندہ تھا۔ باختر پر قبضہ جمانے کے بعد یوکریٹے ٹائڈیز نے ڈیمیٹریس کے ہندوستانی مقبوضات پر حملہ کیا اور شدید کش مکش کے بعد اپنے حریف پر غالب آگیا۔ سندھ کا علاقہ پنجاب اور سرحد سمیت اس کے زیر تصرف تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کو اپنے زیر نگین کر لیا تھا اور ایک مرتبہ وہ پانچ ماہ تک

---

[1] یہ تمام معلومات وی۔ اے سمتھ کی کتاب قدیم تاریخ ہند؛
(Early History of India by V. A Smith)
سے ماخوذ و مقتبس ہیں۔

صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ ایک قلعہ میں محصور رہا مگر پھر بھی اس نے ڈیمیٹریس کے ۶۰ ہزار آدمیوں کو شکست دی۔

ان زبردست فتوحات کے بعد جب یوکرے ٹائڈیز ۱۵۶ ق م میں وطن واپس جا رہا تھا تو راستے میں اس کے بڑے بیٹے "اپالوڈوٹس" نے جو اس کا ولی عہد تھا نہایت سنگ دلی سے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور اس جرم پر ندامت کی بجائے مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے باپ کے خون میں سے اپنی رتھ کو گزارا اور اس کی لاش کی اس حد تک بے حرمتی کی کہ اسے بے گور و کفن چھوڑ دیا۔

یوکرے ٹائڈیز کے اس عبرتناک انجام کے بعد اس کا دوسرا بیٹا ہیلیوکلیز (HELIOKLES)، جس نے اپنا لقب 'عادل' رکھا تھا۔ اپنے باپ کی مسند پر بیٹھا۔ اس کے زمانہ میں پنجاب اور سندھ پر اس کا ایک قریبی رشتہ دار مسٹریٹو اوّل وائسرائے تھا۔

۱۵۵ ق میں منندر (MENANDAR) نے جو کابل کا حکمران تھا، سندھ پر حملہ کیا۔ وہ ایک زبردست عالم اور بدھ مت کا پیروکار اور مبلغ تھا۔ اس نے دریائے بیاس کو عبور کر کے بہت سے ایسے علاقے بھی فتح کر لئے جو سکندر رومی کے عہد میں سر نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کی مہماتی پیش قدمی میں ایک مقام کا نام "اساس" بھی آتا ہے جو غالباً دریائے گھاگھرا کا پرانا یونانی نام ہے۔

یُو۔چی اور ساکا (YEU-CHI- SAKA).

یو۔چی۔ ایک خانہ بدوش قوم تھی جس کا مستقر چین کا شمال مغربی علاقہ تھا۔ ۱۷۰ ق۔م میں اس قوم کو کسی طاقت ور حکمران کے ہاتھوں ترک وطن کی مصیبت اٹھانی پڑی اس ہجرت کے دوران یو۔چی کا ٹکراؤ ایک دوسرے خانہ بدوش قبیلہ ساکا سے ہوا جو دریائے سیحوںؔ[1] کے شمالی علاقوں میں آباد تھا۔ ساکا قبیلے کے لوگ یو۔چی کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہوتے ہوئے کوہ ہندوکش کے شمالی علاقہ میں آ گھسے۔

ہیلیو کلیز آخری یونانی باختری بادشاہ جو اس علاقہ کا حکمران تھا اس قوم کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا گیا اور اس طرح یونانی باختری سلطنت کا ہندوستان کے شمال مغربی علاقے سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا[2]۔ اس وحشی قوم نے پنجاب میں ٹیکسلا کے مقام پر اور دریائے جمنا کے کنارے متھرا کے قریب اپنی بستیاں بسائیں۔ پنجاب سے متھرا کی طرف یہ لوگ حدود سندھ میں سے گزر کر گئے اور اس بناء پر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وادئ سندھ بالخصوص بالائے سندھ کا علاقہ ان کی قلمرو میں شامل تھا[3]۔ سندھ پر ان کے قبضہ کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ صحرائے سندھ کے اس پار کا علاقہ جسے سوراشٹر یا کاٹھیا وار کہتے ہیں۔ اس قوم کی عملداری میں داخل تھا[4]۔

یُو۔چی۔ پاکستان

پہلی صدی عیسوی کے آغاز میں یو۔چی قوم نے جس کا مختصر ذکر پہلے آ چکا ہے

---

[1] ترکستان کا ایک دریا۔ بعض قدیم نوشتوں میں دریائے سندھ کو بھی اس نام سے پکارا گیا ہے۔

[2] "قدیم تاریخ ہند" از وی۔ اے سمتھ

[3] قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ از ڈاکٹر ہیم چندرا [4] قدیم تاریخ ہند

ہندوستان پر حملہ آور ہوئی۔ ان کا پہلا نامور بادشاہ کڈ فائس اول (KADPHISES I) تھا جو غالباً ۱۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت ایران سے لے کر دریائے سندھ بلکہ دریائے جہلم تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۴۵ء میں اسی برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کی مسند پر اس کا بیٹا کڈ فائس دوم بیٹھا۔ [1]

زیریں سندھ کا علاقہ جس میں اوچ بھی شامل ہے، اس کے زیر تصرف تھا۔ کڈ فائس دوم کم و بیش ۳۳ برس (۴۵ - ۷۸ء) تک داد حکومت دیتا رہا۔ [2]

۷۸ء میں یو۔ چی قوم کا عظیم الشان فرمانروا کنشکا (KANISHKA)، جو کڈ فائس دوم کا قرابت دار تھا تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ سندھ کا علاقہ اس کی مملکت میں شامل تھا۔ [3]

اوچ کے قریب بہاول پور کے علاقہ میں سوئی وہار یا سوئیجار (SUEVIHAR) کے گاؤں سے کنشکا کے عہد کا جو کتبہ دستیاب ہوا ہے وہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اس علاقہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ یہاں سے کنشکا عہد کے بعض سکے بھی ملے ہیں جو ٹیکسلا سے برآمد شدہ اس عہد کے سکوں سے پوری طرح مشابہ ہیں۔ [4]

[1،2] قدیم تاریخ ہند [3] قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ

[4] سوئی وہار کا فاصلہ بہاول پور سے سترہ میل ہے اور یہ اس راستہ پر واقع ہے جو بہاول پور سے اوچ کی طرف جاتا ہے۔

[5] تاریخ اوچ کے مولف مولوی حفیظ الرحمن صاحب لکھتے ہیں کہ گزشتہ سے پیوستہ سال (تاریخ اوچ ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی ہے۔ اس حساب سے گویا ۱۹۳۸ء میں) راقم کے والد ماجد مولوی حاجی محمد عزیز الرحمان صاحب کو جو جدید انہار (ستلج ویلی پراجیکٹ) کے سپیشل جوڈیشل آفیسر کی حیثیت سے قائم پور کے قریب مقیم تھے۔ "نہر بہاول کینال" کے قریب کئی ایک سکے ملے تھے جو سونے اور چاندی کے مخلوط بنے ہوئے تھے۔ ان سکوں کی نسبت سرکار دولت مدار بہاولپور نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ سکے راجہ کنشکا کے عہد کے ہیں جن کو اب تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ (تاریخ اوچ صفحہ ۴۷، ۴۸)

کنشکا بدھ مت کا سچا پیرو اور اشوک کے بعد اس مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا علم بردار تھا۔ کنشکا کے عہد میں سندھ میں بدھ مت کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی اور کئی ایسے تبلیغی مراکز قائم کئے گئے جن کے اثرات عرصہ دراز تک اس علاقہ میں محسوس کئے جاتے رہے۔ اس علاقہ پر یو۔چی قبیلہ کی حکمرانی کا سراغ پانچویں صدی کے وسط تک ملتا ہے جس کے بعد سندھ کا علاقہ خود مختار ہو گیا [1]

کنشکا کی اولاد میں باسودیو (VASUDEVA) پہلا بادشاہ ہے جس نے بدھ مت کا قلادہ گلے میں سے اتار پھینکا اور شیو [2] کا پجاری بن گیا۔ لیکن کنشکا جس مذہب کی بنیادوں کو مضبوط کر گیا تھا وہ اس قدر جلد متزلزل ہونے والی نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یو۔چی قوم کے زوال کے بعد سندھ پر جو خاندان حکمران ہوا وہ ذات کا شودر اور بدھ مت کا مقلد تھا۔ [3]

رائے خاندان

۵۰۰ عیسوی میں سندھ پر رائے خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس خاندان کا بانی رائے دیواجی تھا۔ یہ لوگ راجپوت کہلاتے تھے۔ ذات کے اعتبار سے "شودر" (اچھوت) اور مذہبی طور پر بدھ مت کے حلقہ بگوش [4] تھے۔ رائے خاندان سندھ پر ایک سو تیس برس تک حکمران رہا۔ ۶۳۱ء میں حکومت ان کے خاندان سے چچ کی طرف منتقل ہو گئی جو برہمن تھا۔ رائے خاندان کا دارالحکومت الور تھا جو دریائے

---

[1] قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ ص۲۵۶ (Political History of Ancient India
by Dr. Hemchandra Roy Chaudhuri

[2] ایضاً

[3] تاریخ ہند از ای۔ رسیڈن

[4] قدیم تاریخ ہند از وی۔ اے سمتھ باب ۱۳ ص۵۳

سندھ کے کنارے ایک خوب صورت اور بڑا شہر تھا۔ "چچ نامہ" میں رائے خاندان کی حدود سلطنت کا حسب ذیل نقشہ دیا گیا ہے

راویانِ احادیث و مصنفانِ تواریخ چناں آوردہ اند کہ شہر الور دارالملک ہند و سندھ است شہرے بود معظم۔ آراستہ بہ انواع قصر و راغ دریا حسین و باغ وحیاض و انہار و ریاض و ازہار بر آب سیحون کہ آں را مہران گویند و ایں شہر با نزہت را "رائے" بود با خزائن وافر و دفائن متواتر عدل اور در عالم منتشر و سخاوت او در جہان مشتہر، حدود ممالک و مسالک او از جانب مشرقی تا حد کشمیر و از طرف غربی تا حد مکران و از جنوبی تا لب آب دریائے محیط و دیبل و از شمالی تا کوہ کروان و از کیکانان و در ممالک خود چہار ملک را نصب کردہ بود۔ یکے را بہ برہمن آباد و از حصار نیرون و دیبل و لوہانہ و لاکھ وسمہ و دریا در اہتمام او فرمودہ و دوم را بقصبہ سیوستان و بودھیہ رجنکان و کوہ پایہ ورد جہان تا حد مکران در عہدہ او کردہ و سیوم را در حصار اسکلندہ و باتیہ کہ تلوارہ و چچ پور۔ می خوانند و مضافات آں تا حدود دیپو دھنور در ضبط او فرمودہ و چہارم را بقصبہ معظم ملتان و سکہ و برہم پور و کردر اشہار و کنبہ تا حد کشمیر بتصرف او باز گذاشت و خود بدارالملک الور بنشست و کروان و کیکانان و برہاس در تحت فرمان خود داشت۔ [۲]

ترجمہ:-

واقعات کے راوی اور تاریخ کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ شہر الور ہندوستان اور سندھ کا دارالحکومت تھا جہاں عالی شان عمارات، محلات، چشمے،

---

[۱] اصل کتاب عربی میں تھی اور اس کا نام "الہند و السند ومنہاج المالک" تھا۔ قاضی اسماعیل بن علی ثقفی کی تصنیف ہے جسے علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں فارسی جامہ پہنایا اور "چچ نامہ" سے اس کی شہرت ہوئی۔ سندھ کے حالات پر یہ قدیم ترین تاریخی کتاب ہے جس میں چھٹی صدی عیسوی تک کے حالات ملتے ہیں۔

[۲] چچ نامہ ص ۱۵

سرسبز و شاداب کھیت اور انواع واقسام کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور نہریں اور باغ تھے۔ یہ سیحون کے کنارے واقع تھا جسے دریائے مہران کہتے ہیں۔ اس پُر بہار شہر کا ایک راجہ تھا جو بڑا دولت مند تھا۔ بے شمار خزانوں کا مالک تھا۔ عدل وسخاوت میں مشہور تھا۔ اس کی سلطنت کی حدود مشرق کی طرف کشمیر، مغرب کی طرف مکران، جنوب کی طرف بحر ہند اور شمال کی طرف کرون اور اور کیکاناں کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے ملک کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا اور ہر صوبہ پر ایک وائسرائے مقرر کیا ہوا تھا۔ ایک صوبہ برہمن آباد، نیرون، دیبل، لوہانہ لاکھ، سمہ اور دریا کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے صوبہ میں سیوستان، بودھیہ، جنکان، کوہ پایہ، رودجھان سے لے کر مکران کی حدود تک کا علاقہ شامل تھا۔ تیسرے صوبہ میں اسکندہ کا قلعہ، باتیہ جسے تلوارہ اور بچ پورہ کہتے ہیں اور اس کے اطراف ونواحی کا علاقہ دیلو اور ہنور تک تھا۔ چوتھا صوبہ ملتان، سکہ، برہم پور کرور، اشہار اور کنبہ سے کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ پایۂ تخت الور میں خود راجہ رہتا تھا اور کردان، کیکاناں اور برہاس کے پہاڑی علاقے براہِ راست اس کے ماتحت تھے۔"

رائے خاندان پانچ پشتوں تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس خاندان کا پہلا باقاعدہ حکمران رائے سہراس تھا۔ [1] جیسا کہ "بچ نامہ" کے بیان سے واضح ہوتا ہے رائے خاندان کی حدود مملکت مشرق میں قنوج وکشمیر تک، مغرب میں مکران اور ساحل بحر عرب تک، جنوب میں سورت کی بندرگاہ اور شمال میں قندھار، سیستان، اور کوہ سلیمان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ [2]

---

[1] یہ شودر ذات کا راجہ دیوجی کا بیٹا سہرس رائے تھا جس کا بیٹا ساہسی اس کا جانشین ہوا۔
(قدیم تاریخ ہند ص ۵۳۵)

[2] تاریخ سندھ مصنفہ ابوظفر ندوی مرحوم

رائے ساہراس کے بعد اس کا بیٹا رائے ساہسی تخت نشین ہوا۔ رائے ساہسی کے مرنے پر حکومت اس کے بیٹے سہراس رائے کو ملی۔ سہراس رائے کے زمانہ میں مکران پر عربوں کا پہلا حملہ ہوا جس میں راجہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

سیہرس رائے کی موت کے بعد رائے ساہسی دوم برسر اقتدار آیا جو نہایت عادل و منصف اور فیاض بادشاہ تھا۔ اس نے ملکی انتظامات کو نئی شکل دی اور رعایا کے لئے چار ضابطے مقرر کئے۔ اس کے کمال عدل کی ایک مثال یہ ہے کہ اس نے نقد و جنس کی شکل میں مالیہ وصول کرنے کی بجائے رعایا کو حکم دیا کہ وہ اس کے عوض الور، سیستان، اوچ، مانتیلہ، مئو اور سورائی کے چھ قلعے مٹی سے تیار کر دیں۔ چنانچہ رعایا نے بخوشی تعمیل کی۔ ان میں سے اکثر قلعے آج تک قائم ہیں۔

رائے ساہسی ثانی بن سیہرس رائے کے زمانہ میں مکران کے علاقے پر عربوں نے دوبارہ حملہ کیا جس میں یہ راجہ بھی مارا گیا۔ اس راجہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ طبعی موت مرا۔

رائے ساہسی کا معتمد وزیر رام تھا جو اس کے باپ سیہرس رائے کے زمانہ سے تمام امور سلطنت کا نگران اور ذمہ دار تھا۔ ایک مرتبہ اس کی ملاقات ایک نوجوان برہمن چچ سے ہوئی جو نہایت وجیہہ و شکیل، عقلمند، مدبّر اور پڑھا لکھا شخص تھا۔ جلد ہی اس نے رام کے دل میں گھر کیا اور رام وزیر نے اسے اپنا نائب بنا لیا۔ چچ ایک پروہت سیلائچ کا بیٹا تھا جو الور کے مندر کا بڑا پجاری تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی قابلیت کے جوہر کھلنے لگے اور بادشاہ بھی اس کی لیاقت اور علم و فضل سے بڑا متاثر ہوا۔ چنانچہ رام کے مرنے کے بعد چچ کو وزیر مقرر کیا گیا۔ جب رائے ساہسی دوم مرا تو چچ اپنے آقا کی موت کے بعد رائے ساہسی دوم کی رانی سوندھی کی مدد سے حکومت و اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

چچ کو اپنی حکومت سے ابتدائی چند سالوں میں رائے خاندان کی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے اپنی حکمت عملی سے بہ تدریج تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔

رائے ساہسی دوم کے عہد میں مشہور چینی سیاح ونگ ۔ ہیون ۔ تسے سندھ آیا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں سندھ کے حکمران خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ذات کا شو۔ تو۔ لو تھا جس کا مفہوم غالباً شودر ہے[۱]۔

ہیون سانگ کے سفر کا زمانہ ۶۲۹ء سے ۶۴۵ء تک کا ہے[۲]۔ یہ رائے خاندان کے عہد اقتدار کے آخری ایام تھے۔ ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں دریائے سندھ کے کونی علاقہ کو او۔ تین ۔ پو۔ چی ۔ لو لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی خطہ تھا جہاں اوچ واقع ہے۔

چینی سیاح کے سفرنامہ کے بموجب یہ مملکت سندھ کا ایک اہم صوبہ تھا اور یہاں بدھ مت اپنے پورے عروج پر تھا جیسا کہ وی۔ اے سمتھ نے لکھا ہے

"اس وقت سندھ میں عجیب و غریب بات یہ تھی کہ وہاں کا راجہ ذات کا شودر اور بدھ مذہب کا پیرو تھا اور بھکشوؤں کی زبردست تعداد تھی جن کو ملک کی طرف سے مدد پہنچتی تھی۔ یہ تعداد تخمینہ ....۱ ہزار تھی مگر جتنی تعداد تھی ویسے ان کے صفات نہ تھے۔ کیوں کہ ان دس ہزار بڑی تعداد کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ کاہل الوجود، عیاش اور عشرت پسند تھے۔ دریائے سندھ کا کونی علاقہ جس کو ونگ ۔ ہیون ۔ تسے چینی سیاح او ۔ تین ۔ پو ۔ چی ۔ لو کہتا ہے۔ سندھ ہی کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔"[۵]

---

[۱] Early History of India by V. A. Smith.

[۲] ہیون سانگ اور ونگ ہیون تسے ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں [۳] ایلیٹ تاریخ سندھ ج ۲ ص ۔

[۴] ڈاسن (Dowson) کی تشریحات بر تاریخ سندھ از ایلیٹ

[۵] قدیم تاریخ ہند از وی۔ اے۔ سمتھ۔ باب ۱۳ ص ۳۴۲

چچ کا وزیر بدھی مان تھا۔ چچ نے اس کے مشورے سے پابیہ پر فوج کشی کی جو دریائے بیاس کے کنارے واقع تھا۔ وہاں کے راجہ نے جو خاندان کی طرف سے یہاں کا حاکم تھا۔ چچ کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ کچھ عرصہ تک قلعہ بند ہو کر بیٹھا رہا مگر جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو چپکے سے یہاں سے بھاگ کر اسکندرہ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ اسکندرہ کا قلعہ پابیہ کے قلعہ سے زیادہ مضبوط تھا۔ جب چچ کو پتہ چلا کہ دشمن یہاں سے فرار ہو کر اسکندرہ کے قلعہ میں چلا گیا تو اس نے پابیہ میں ایک جانشین مقرر کر کے خود اسکندرہ کا رخ کیا۔

اسکندرہ میں چچ کا ایک قابل اعتماد دوست رہتا تھا۔ چچ نے اس کو پیغام بھجوایا کہ اگر تم راجہ چیت رائے والئ پابیہ کو زندہ یا مردہ گرفتار کر لو تو یہ دونوں قلعے تمہارے انتظام و انصرام کے تحت کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ چچ کے دوست نے موقع پا کر راجہ چیت کو قتل کر دیا۔ چچ نے اپنے دوست کی وفاداری سے خوش ہو کر اس کو بہت انعام و اکرام دیا اور حسبِ وعدہ یہ دونوں قلعے بھی اس کی تحویل میں دے دیئے۔ چچ کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں چچ کی بیوی اور راجہ ساہسی کی بیوہ رانی سونڈھی کی کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا۔ چچ کے عہد حکومت میں اس کے زیر اقتدار علاقے پانچ حصوں میں تقسیم تھے۔

۱۔ برہمن آباد، اس میں مندرجہ ذیل اضلاع شامل تھے۔

نیرون، دیبل، لوہانہ، لکھا، سمہ

۲۔ سیوستان۔ جس میں بودھیہ جھنکان، روجہان تا سرحد مکران۔

۳۔ اسکندرہ (اوچ) ذیل کے اضلاع پر مشتمل تھا۔ پابیہ، ٹلوارہ، چچ پور اور بودھ پور

۴۔ ملتان ان اضلاع پر مشتمل تھا۔ سکہ، برہا پور، کرور اشتہار، کمبھ تا حد کشمیر

۵۔ الور دارالحکومت تھا اور اس کے تحت کروان، قیقان اور نیرہاس کے اضلاع تھے گویا چچ ان تمام علاقوں پر متصرف ہونے میں کامیاب ہو گیا جو اس کے پیشرو کے قبضہ و تصرف میں تھے۔ چالیس برس تک داد حکومت دینے کے بعد چچ مر گیا۔ اس کے بعد

اس کا بھائی چندر اور چندر کے بعد چچ کا لڑکا راجہ داہر بر سر اقتدار آیا۔ اسی راجہ داہر کے زمانہ میں عربوں نے نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر حملہ کیا اور راجہ کو قتل کرنے کے بعد اس تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا جس پر چچ خاندان کی حکمرانی تھی۔[1]

چچ کا بھائی چندر بن سلائج آٹھ برس تک حکمران رہا۔ ازاں بعد راجہ داہر بن چچ کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ اس کی مدت حکومت ۳۲ برس کے لگ بھگ ہے۔ اس طرح برہمن خاندان کا اقتدار سندھ کے علاقہ پر ۸۱ برس تک قائم رہا۔[2]

چچ ذات کا برہمن تھا مگر یہ بات یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ وہ ہندو مت کا پیرو کار تھا یا بدھ مت کا۔ البتہ چچ نامہ نے چچ کے بھائی چندر کے بارے میں تصریح کی ہے کہ وہ بدھ مت کا پیرو کار تھا۔[3]

راجہ داہر کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی سوتیلی بہن "بائی" سے شادی کی تھی جس پر اس کے بڑے بھائی داہر سیہ اور اس کے درمیان شدید اختلافات رو نما ہو گئے جو بالآخر جنگ پر منتج ہوئے۔ اس جنگ میں راجہ داہر کامیاب ہوا۔ تاہم بعد میں دونوں بھائیوں میں مصالحت ہو گئی لیکن داہر سیہ اسی صلح کے دو تین روز بعد مرگیا اور اقتدار پوری طرح راجہ داہر کے قبضہ میں آگیا۔[4]

راجہ داہر کا اپنی بہن کے ساتھ شادی کا یہ منصوبہ محض ایک جوتشی کی پیشینگوئی کی بنا پر عمل میں آیا جس نے یہ خبر دی تھی کہ بائی کی شادی جس مرد سے ہو گی وہ سندھ کا حکمران بنے گا۔ راجہ داہر نے اس اندیشہ سے کہ کہیں سلطنت اس کے قبضہ سے نکل کر کسی دوسرے کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ بائی کے ساتھ عقد کر لیا تاہم ان میں جنسی تعلقات قائم نہیں ہوئے۔[5]

---

[1] چچ نامہ — [2] ایلیٹ کی تاریخ سندھ صفحہ ۱ ج ۲

[3] چچ نامہ اردو ترجمہ از نوری حنیف الرحمان صفحہ ۴۷ و ایلیٹ کی تاریخ سندھ

[4] چچ نامہ — [5] چچ نامہ

اسلامی عہد

بطحا کی سنگلاخ چٹانوں سے رشد و ہدایت کا جو سرچشمہ پھوٹا اس کی فیض رسانیوں سے روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جو سیراب نہ ہوا ہو۔ برِصغیر پاک و ہند کی خوش نصیبی ہے کہ وہ بھی اس چشمہ زلال صافی سے محروم نہیں رہا۔

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں سندھ کے لوگوں کے تعلقات سرزمین حجاز سے باقاعدہ استوار تھے[1]۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک خاص شکل و صورت کے لوگوں کو دیکھا تھا جن کی نسبت ابن مسعود نے بتایا کہ ان کے چہرے جاٹوں کی طرح تھے[2]۔ جاٹ جس کا عربی تلفظ "زط" ہے۔ سندھ کی ایک مشہور قوم تھی[3]۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بابرکت عہد میں اسلام کی آواز ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک پہنچ چکی تھی اور حضرت عمر ابن خطاب کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کا پہلا بحری دستہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔[4]

حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۵ ہجری ۶۳۶ عیسوی[5] میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر فرمایا۔ عثمان نے اس علاقہ کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائی حکم کو ہدایت کی کہ وہ ہندوستان پر بحری راستہ سے فوج کشی کریں۔ چنانچہ انہوں نے

---

[1] عرب ہند تعلقات از سید سلیمان ندوی

[2] ترمذی ابواب الامثال

[3] تاریخ سندھ مصنفہ ابوظفر ندوی مرحوم ص۱۱

[4] تاریخ سندھ اور تاریخ گجرات از ابوظفر ندوی مرحوم بحوالہ بلاذری

[5] چچ نامہ میں غلطی سے ۱۰ ہجری لکھا گیا ہے۔

تھانہ کے علاقہ پر حملہ کیا جو موجودہ زمانہ میں بمبئی سے متصل صوبہ مہاراشٹرا کا ایک ضلع ہے اور عہد قدیم میں ہندوستان کی آباد اور پُر رونق بندرگاہ تھی۔ تھانہ پر حملہ کے کچھ عرصہ بعد دوسرا حملہ گجرات کے مشہور تاریخی شہر بھروچ پر ہوا۔ اس فوجی مہم کی قیادت بھی حکم نے کی۔ انہی دنوں عثمان ثقفی کے چھوٹے بھائی مغیرہ کی سرکردگی میں ایک اور بحری فوج نے سندھ کی اہم بندرگاہ دیبل پر حملہ کیا۔ اس زمانہ میں یہاں چچ کی جانب سے دیواجی کا لڑکا "سمبا" گورنر تھا۔[۱]

حضرت عثمان بن عفان کے عہدِ خلافت میں ایک سیاسی مہم سندھ کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجی گئی۔[۲] تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت عثمان نے عبداللہ ابن عامر کو حکم دیا کہ وہ حکم بن جبلہ کو ہند و سندھ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجے۔ عبداللہ بن عامر اس زمانہ میں بصرہ کے گورنر تھے۔ جب حکم واپس لوٹا تو عبداللہ بن عامر نے اسے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت عثمانؓ نے اس سے سفر کی روداد معلوم کی۔ حکم بن جبلہ نے کہا امیرالمومنین! وہاں کا پانی تاریک ہے، وہاں کا پھل تلخ اور بدمزہ ہے۔ علاقہ پتھریلا اور زمین نمکین ہے۔ چھوٹی سی فوج ہو تو فناہ ہو جائے۔ اور بڑا لشکر ہو تو بھوک پیاس سے ہلاک ہو جائے۔[۳]

اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس عہد میں حکم بن جبلہ حدود سندھ میں نہیں آیا بلکہ بلوچستان اور مکران کے علاقہ کے حالات ہی معلوم کر سکا اور اسی کے بارے میں اپنے تاثرات اس نے پیش کر دیئے۔

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عہد خلافت خانہ جنگی اور زبردست اندرونی خلفشار کا عہد تھا اس لئے ان کے زمانۂ ہمایوں میں ہندوستان کی

---

[۱] ایلیٹ کی تاریخ سندھ بحوالہ چچ نامہ و بلاذری

[۲] چچ نامہ صفحہ ۷۰

[۳] بلاذری و چچ نامہ صفحہ ۷۲

طرف کوئی فوجی مہم روانہ نہیں کی جا سکی[۱]۔ البتہ صغیر بن داؤد کی سرکردگی میں ایک جماعت سندھ پر حملہ آور ہوئی اور کیکاناں (قلات) کی حدود تک پہنچی۔ ابھی جنگ کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچی تھی کہ حضرت علی ابن ابی طالب کی شہادت کی خبر ان تک پہنچی اور صغیر بن داؤد کو اپنی پوری جمعیت کے ساتھ واپس لوٹنا پڑا[۲]۔ صغیر بن داؤد جب مکران پہنچا تو اسے معاویہ بن ابی سفیان کے بر سر اقتدار آنے کی اطلاع ملی[۳]۔

محمد بن قاسم کی فتوحات[۴]

اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کئی عرب حملہ آوروں نے سندھ پر یلغار کی مگر انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ البتہ امیر معاویہ کے عہد حکومت میں عبدالرحمان پہلا شخص تھا جس نے سندھ کے صوبہ مکران کا کچھ علاقہ فتح کیا[۵]۔ تا آں کہ ولید بن عبدالملک کے دور حکمرانی میں عراق کے نائب السلطنت حجاج بن یوسف ثقفی نے ایک خاص واقعہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو تسخیر سندھ کی مہم پر روانہ کیا اور اسلام کے اس نامور سپوت نے ۹۲ ہجری میں سندھ کا تمام علاقہ زیر کر لیا اور یہاں کے ہندو حکمران راجہ داہر بن چچ کو عبرتناک شکست دی۔ راجہ داہر اپنے پایۂ تخت "الور" میں ایک بہادر عرب شاہسوار کے ہاتھوں قتل ہوا۔ [۶]

---

[۱] چچ نامہ ص ۶۲ — [۲] ایلیٹ کی تاریخ سندھ

[۳] چچ نامہ — [۴] ایلیٹ کی تاریخ سندھ بحوالہ چچ نامہ

[۵] ایضاً۔ "سراندیپ سے ایک جہاز بصرہ جا رہا تھا۔ سمندری طوفان نے اس کا رخ دیبل کی طرف موڑ دیا۔ یہاں بحری قزاقوں نے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ اس میں کچھ مسلمان عورتیں بھی تھیں۔ ایک عورت نے حجاج کے نام کی دہائی دی۔ حجاج کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے فوراً ایک لشکر جرار کو دیبل پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس لشکر کا سپہ سالار خود اس کا بھتیجا محمد بن قاسم تھا۔ کرنل ٹاڈ نے ۶۵ ہجری میں مروان کے عہد حکومت کی ایک فوجی مہم کا ذکر کیا ہے۔ جس نے سندھ کے راجپوتانہ پر حملہ کیا اور چتوڑ کو راجہ مانک رائے اور اس کا بیٹا عرب ول، کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۹۴ ہجری کے اوائل میں داہر کے بیٹے بہادروں کی ایک جمعیت کے ساتھ اسکندرہ کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ یہ قلعہ بیحد مضبوط تھا۔ اس قلعہ میں اپنی قوت کو مجتمع کرنے کے بعد راجہ داہر کے بیٹوں نے محمد بن قاسم کے خلاف شورش برپا کی۔ یہ اطلاع پا کر محمد بن قاسم اس طرف روانہ ہوا اور اس قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اسکندہ پر محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت یہاں کا راجہ سنگھ رائے تھا جو ملتان کے راجہ بجے رائے کا بھتیجا تھا۔ اس نے جان توڑ کر مقابلہ کیا مگر سات روز کے محاصرہ کے بعد فرار ہونے ہی میں عافیت دیکھی۔ چنانچہ سنگھ رائے یہاں سے بھاگ کر سکہ کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ شہر والوں نے جب دیکھا کہ حاکم بھاگ نکلا ہے تو کوئی چارہ کار نہ پا کر اطاعت پر آمادگی ظاہر کی اور ایک قاصد کو محمد بن قاسم کی خدمت میں بھیج کر امان کے طلب گار ہوئے۔ محمد بن قاسم نے اپنی روایتی فراخدلی سے کام لے کر تمام شہریوں کو جان و مال کے تحفظ کا یقین دلایا لیکن قلعہ کے اندر محصور فوجیوں کو جن کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ تھی قتل کروا دیا اور ان کے اہل و عیال گرفتار کر لئے گئے۔

اسکندرہ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے یہاں کا شہری نظم و نسق عتبہ بن سلمی تمیمی کے سپرد کیا۔ یہ شخص اوچ کا پہلا مسلمان حکمران تھا۔ فرشتہ کی روایت کے مطابق اوچ ہی کے قلعہ سے راجہ داہر کی دو بیٹیاں گرفتار ہو کر خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس بہ طور تحفہ ارسال کی گئی تھیں۔ [۱]

محمد بن قاسم کی آمد سے قبل سندھ میں ایک عرب خاندان کا سراغ ملتا ہے جو علافی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ لوگ حجاج بن یوسف ثقفی کے جابرانہ رویہ سے تنگ آ کر سندھ آئے تھے اور یہاں راجہ داہر نے ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا اور ان سے حسن سلوک سے پیش آیا۔

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۲ صفحہ ۳۰۲-۳۰۳

ان کی بغاوت کا پس منظر یہ واقعہ ہے کہ جب حجاج بن یوسف ثقفی عراق کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے مکران کا علاقہ سعید بن مسلان کلبی کے سپرد کیا۔ سعید کے ہاتھوں صفاوی بن لام الحمامی ایک شخص قتل ہو گیا جو محمد بن علافی کا قرابت دار اور اسی کے علاقے کا باشندہ تھا۔ محمد بن حارث علافی نے اس کے بدلے میں موقع پا کر سعید کو قتل کر دیا اور خود مکران کا حکمران بن بیٹھا۔ حجاج نے سعید کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے علافی خاندان کے ایک سردار سلیمان کو پکڑ کر قتل کر دیا اور اس کا سر سعید کے خاندان والوں کے پاس بھجوا دیا اور مجاعہ بن سر تمیمی کو حکم دیا کہ وہ علافی کی سرکوبی کرے۔ مجاعہ نے عبدالرحمان بن اشعث کو اس علاقہ میں بھیجا مگر وہ بھی علافیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ان پے در پے واقعات نے حجاج کو برہم کر دیا۔ چنانچہ مجاعہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ علافیوں کی سرکوبی کے لئے مکران پہنچا۔ محمد بن حارث علافی مقابلہ کی تاب نہ لا کر راجہ داہر کے پاس آ گیا۔

مکران پر مجاعہ بن سر التمیمی کا قبضہ ہو گیا مگر وہ ایک برس سے زیادہ زندہ نہیں رہا۔ یہ واقعہ عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت کا ہے۔ ازاں بعد جب ولید بن عبدالملک حکمران بنا تو اس کے عہد میں محمد بن ہارون کو مکران کا حاکم مقرر کیا گیا، اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ علافیوں کی گرفتاری کے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔

محمد بن حارث علافی کا راجہ داہر کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ تھا اور وہ راجہ کا معتمد خاص تھا۔ حتیٰ کہ سکوں پر ایک طرف راجہ داہر کا نام کندہ ہوتا تھا اور دوسری طرف محمد بن حارث علافی کا۔ تاہم جب محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور ہوا تو محمد بن حارث علافی نے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف صف آراء ہونے سے انکار کر دیا۔ [1]

ولید بن عبدالملک کے بعد ۹۶ھ/ ۷۱۵ عیسوی میں جب سلیمان بن عبدالملک

---

[1] ؟ یت کی تاریخ سندھ ار ن ار ت . یزد

تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے محمد بن قاسم کی بجائے یزید کو سندھ کا علاقہ تفویض کیا لیکن یزید سندھ آنے کے بعد صرف ۱۸ دن زندہ رہا۔ اس کی موت کے بعد حبیب ابن مہلب کو یہ علاقہ سونپا گیا۔ حبیب نے دریائے سندھ کے کنارے قیام کیا اور یہاں کی ایک شورش پسند جماعت کا قلع قمع کیا۔ یہ غالباً داہر کی فوج کے بچے کھچے لوگ تھے۔ حبیب بن مہلب کے بعد عمرو بن عبداللہ کو سندھ کا گورنر بنایا گیا۔

۹۹ ہجری/۷۱۷ عیسوی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ان کا عہد حکومت مثالی تھا۔ اور وہ خلافت راشدہ کے اس اسلوب پر کاربند تھے جو اسلام کا مطمح نظر ہے۔ آپ نے تمام مفتوحہ علاقوں کے سابقہ حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی اور سندھ کا گورنر عمرو بن مسلم الباہلی کو بنایا۔ اس کی کوششوں سے اور خود خلیفہ وقت کی پارسائی اور پاکبازی سے متاثر ہو کر راجہ داہر کا بیٹا جے سیہ (جے سنگھ) اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جے سیہ کو دریائے سندھ کے کنارے کے تمام علاقہ پر حکمران تسلیم کر لیا[1]۔ عمرو بن مسلم باہلی نے اپنی کامیاب حکمت عملی سے ہندوستان کے کئی دیگر علاقے بھی مسخر کئے۔

۱۰۱ ہجری/۷۲۰ عیسوی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد زمام اختیار یزید بن عبدالملک کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے عمرو بن مسلم باہلی کو گورنری کے عہدے پر بحال رکھا۔ اس کے بعد ۱۰۵ ہجری/۷۲۴ عیسوی میں ہشام بن عبدالملک حکمران ہوا۔ اس نے عمرو بن مسلم باہلی کے مشورے اور ایماء سے جنید بن عبدالرحمان مرّی کو سندھ کا گورنر بنایا۔ جنید بن عبدالرحمان نے اپنی گورنری کے دور میں راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ کے علاقے میں دخل در معقولات کا سلسلہ

---

[1] دریائے سندھ کے ساحل علاقہ میں اوچ بھی شامل ہے اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ اوچ اس زمانہ میں جے سیہ بن داہر کے زیر تصرف ہوگا۔

شروع کیا۔ جے سیہ نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ مجھے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس علاقہ کی عملداری سونپی تھی اور میں مسلمان ہو چکا ہوں اس لئے مجھ سے تعرض مت کرو۔ لیکن جنید نے جے سیہ کو قید کر لیا اور پھر اسے قتل کروا دیا۔ اس پر جے سیہ کا بھائی چچ (ساسہ[1]) جنید کے طرز عمل کی شکایت لے کر عراق پہنچا مگر جنید کے ایماء پر اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ جنید کے زمانہ میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے رقبہ میں بہت توسیع ہوئی۔ پورا سندھ اور گجرات (انڈیا) کا بیشتر علاقہ اس نے مسخر کر لیا۔

۱۰۷ ہجری میں جنید کی بجائے تمیم بن زید العتبی سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے عہد میں بھی تمیم سندھ میں بھیجا گیا تھا۔ تمیم کا دیبل کے قریب انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عراق کے نائب السلطنت خالد نے حاکم الکلابی کو تمیم کی جگہ سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ اس زمانہ میں سندھ میں اسلامی حدود سلطنت سمٹنی شروع ہوئیں۔ اور اس بنا پر اس کو ایک جھیل کے کنارے مسلمانوں کے لئے ایک الگ بستی بسانی پڑی جس کا نام اس نے "محفوظہ" رکھا۔ حاکم الکلابی نے محمد بن قاسم کے لڑکے عمرو کو ایک فوجی دستہ کا کمانڈر بنا کر اس ہمہ گیر بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بھیجا جو سندھ میں مسلمانوں کے خلاف برپا ہو چکی تھی۔ عمرو بن محمد بن قاسم کو اپنی اس فوجی مہم میں قدرے کامیابی نصیب ہوئی۔ اس اثنا میں مرکز سے اس کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ عمرو نے اس جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اس نے "منصورہ[2]" رکھا۔[3]

---

[1] اصل عربی عبارت میں ساسہ لکھا گیا ہے جو چچ کا معرب ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھئے ایلیٹ کی تاریخ سندھ۔

[2] روہڑی اور سکھر کے درمیان جو دریائے سندھ کے بیچ میں ایک جزیرہ واقع ہے۔ یہی "منصورہ" کی بستی ہے جو بعد میں بکھر کے نام سے مشہور ہوئی۔

[3] بلاذری۔ چچ نامہ۔ ایلیٹ کی تاریخ سندھ تحفۃ الکرام وغیرہ۔

تحفتہ الکرام کی روایت کے مطابق حاکم الکلابی کے بعد سلیمان بن ہشام بن عبدالملک بن مروان سندھ کا گورنر بنا اور بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان کے عہد میں ابوالخطاب نامی ایک شخص بھی سندھ کا گورنر بنایا گیا۔ ۱۳۲ ہجری/ ۷۵۰ عیسوی میں جب خاندان بنو عباس بر سر اقتدار آیا اس زمانہ میں سندھ پر بنی امیہ کی طرف سے منصور بن جمہور حاکم تھا۔

عہد بنی عباس

خاندان بنو عباسیہ کے پہلے حکمران ابوالعباس سفاح کے عہد حکومت میں ابو مسلم خراسانی نے جو سلطنت عباسیہ کا بانی تھا اور جس کی کوششوں سے یہ خاندان برسر اقتدار آیا تھا، عبدالرحمان نامی ایک شخص کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ افغانستان کے راستے سندھ پر حملہ آور ہوا لیکن منصور بن جمہور نے عبدالرحمان کو شکست دی اور وہ قتل کر دیا گیا۔

عبدالرحمان کے قتل کے بعد ابو مسلم خراسانی نے موسیٰ بن کعب تمیمی کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ منصور بن جمہور کی فوجیں دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر تھیں اور وہ تعداد میں بھی زیادہ تھیں تاہم موسیٰ بن کعب تمیمی نے منصور کی فوجوں کو زبردست شکست دی۔ منصور کا بھائی مارا گیا اور خود منصور ریگستانی علاقہ کی طرف بھاگ نکلا جہاں پیاس نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور یوں سندھ پر اموی اقتدار کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

۱۳۶ ہجری / ۷۵۴ عیسوی میں ابو جعفر منصور بر سر اقتدار آیا۔ اس نے ایک شخص ہشام کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ ہشام نے ہندوستان کے کئی علاقے فتح کئے۔ پھر اس نے ایک شخص عمرو بن جمل کو ایک بحری بیڑہ دے کر ساحلی علاقوں کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اسی دور میں ایک اور فوجی مہم پہاڑی علاقوں کی طرف بھیجی گئی جس نے وادی کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ ملتان کا پورا صوبہ بھی مسخر ہو گیا۔

ہشام کے بعد سندھ کی حکومت عمر بن حفص بن عثمان اسفرائنی کے سپرد کی گئی ۔ یہ "ہزار مرد" کے لقب سے مشہور تھا اور غالباً ۱۵۱ ہجری سے قبل سندھ کا گورنر بنا کیوں کہ ۱۵۱ ہجری میں ہزار مرد افریقہ کا گورنر بنایا گیا جہاں وہ ۱۵۴ ہجری میں قتل ہو گیا ۔

۱۵۲ ہجری / ۷۷۱ عیسوی میں روح بن حاتم یا روح بن مزید مہلبی سندھ کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے بعد داؤد بن یزید مہلبی سندھ کا گورنر بنا ۔

ہارون الرشید کے عہد سلطنت ۱۷۰ ہجری / ۷۸۶ عیسوی میں ابو تراب یا حاجی ترابی سندھ کا گورنر تھا ۔ حاجی ترابی کا مزار ٹھٹھہ کے جنوب مغرب میں ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ لوحِ مزار پر ۱۷۱ ہجری / ۷۸۷ عیسوی درج ہے ۔

حاجی ترابی کے بعد ہارون کے زمانہ میں ابوالعباس نامی ایک شخص بھی گورنر سندھ کے عہدے پر فائز رہا ۔ ۱۹۸ ہجری / ۸۱۳ عیسوی میں مامون الرشید سلطنت عباسیہ کا فرمانروا بنا ۔ اس کے عہد میں بشر بن داؤد سندھ کا گورنر مقرر ہوا ۔ بشر بن داؤد کے بعد غسان بن عباد جو خراسان ، سجستان اور کرمان کا گورنر تھا ۔ سندھ کا حاکم بنایا گیا ۔ غسان کے عہد میں موسیٰ بن یحییٰ برمکی کو فوجی خدمات کی سرانجام دہی کے لئے مقرر کیا گیا ۔ اس کے بعد علی بن عیسیٰ بن ہامان کو موسیٰ بن یحییٰ برمکی کی بجائے فوجی کمانڈر بنا دیا گیا ۔

غسان بن عباد سے پہلے طاہر بن حسین کا نام ملتا ہے ۔ جو سندھ میں تقریباً دو سال تک گورنر رہا ۔ اس زمانہ میں سندھ کا علاقہ خراسان سے ملحق تھا ۔ ۲۱۸ ھ ، ۸۳۳ عیسوی میں معتصم باللہ بر سر اقتدار آیا ۔ اس نے موسیٰ بن یحییٰ برمکی کے لڑکے عمران کو سندھ کا صوبیدار مقرر کیا ۔ اس کے عہد میں قلات کے علاقہ پر جاٹوں کی حکومت تھی ۔ اس نے جاٹوں کو مغلوب کیا اور ایک شہر " البیضا " کی بنیاد رکھی ۔

سندھ کی قدیم قوم " میڈ " کا بھی اس زمانہ میں سندھ کے بڑے حصہ میں

اقتدار قائم تھا۔ عمران بن موسیٰ بن یحییٰ برمکی نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوجی دستہ روانہ کیا جس نے مید قوم کے تین ہزار افراد کو تہ تیغ کیا۔ یہ لوگ دریائے "الرُّور"[۲] کے کنارے آباد تھے۔ مید قوم کی سرکوبی کے لئے اس نے اس قوم کے پرانے حریف[۳] جاٹ برادری سے بھی امداد لی اور انہیں مید کے خلاف استعمال کیا۔

---

[۱] جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔ سندھ کی قدیم ترین قومیں جن کا سراغ آریائی دور سے قبل بھی ملتا ہے اور جو سندھ کے قدیم ترین باشندے ہونے کا امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ مید اور جاٹ تھے۔ یہی لوگ ہندوستان کے اصل باشندے تھے۔ دریودھن کے عہد حکومت میں جو کوروؤں کا عظیم بادشاہ تھا۔ مید اور جاٹ قوموں کی باہمی کشمکش اپنے عروج پر تھی اور ان دونوں کی منازعت سے فائدہ اٹھا کر دریودھن نے اپنی بہن رانی دھسلا اور اپنے بہنوئی راجہ جیدرتھ کو سندھ کا حکمران مقرر کیا تھا۔ عمران بن موسیٰ بن یحییٰ برمکی کی مذکورہ بالا فوجی مہم سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوم نویں صدی عیسوی تک سندھ میں سیاسی اہمیت کی حامل تھی اور بعض علاقے اس کے زیرنگین تھے۔

[۲] الرور دریا کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ ایچ۔ایم۔ایلیٹ نے اسے ایک مصنوعی دریا قرار دیا ہے۔ جو جھیل مانچھر سے نکالا گیا تھا اور دریائے سندھ میں گرتا تھا اور غالباً ٹھٹھہ کے قرب و جوار میں بہتا تھا۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ وہی دریائے گھاگھرا ہے جو اوچ کے قریب بہتا ہے۔ اوچ کا ایک نام جیسا کہ ہم نے ثابت کیا ہے الرور بھی ہے۔

[۳] جاٹ قوم بھی سندھ کی قدیم ترین قوم ہے۔ ایلیٹ نے ان کا آبائی وطن باختریا کے علاقے میں دریائے "زوطل" کے کنارے کی سرزمین بتائی ہے۔ اسی نسبت سے اسے "زط" کہا جاتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ بگڑ کر جاٹ بن گیا۔

جاٹ قوم اب بھی سندھ میں موجود ہے۔ جب کہ مید قوم کا نویں صدی عیسوی کے بعد سندھ میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ خیال یہ ہے کہ یہ لوگ ترک وطن کر کے مدراس یا جنوبی ہند کے علاقے میں چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔

سندھ کی دو خود مختار حکومتیں

۲۵۷ھ/۸۷۱ء میں خلیفہ معتمد علی اللہ نے یعقوب بن لیث صفاری کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ یعقوب بن لیث صفاری کا انتقال ۲۶۵ ہجری/۸۷۹ عیسوی میں ہوا۔ اس کے بعد یہاں سامانی خاندان حکمران ہوا مگر اسے بہت جلد اس علاقے سے ہاتھ دھونے پڑے اور سندھ کا طویل و عریض خطہ کئی ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ ان میں دو ریاستیں نسبتاً بڑی تھیں۔ ایک منصورہ کی اور دوسری ملتان کی۔

ملتان پر سامہ بن لوی بن غالب کا قبیلہ حکمران ہوا جو قبل ازیں عمان میں برسر اقتدار تھا۔ عمان میں ان لوگوں کا غلبہ و اقتدار بعثت نبویؐ اور ظہورِ اسلام سے بہت پہلے سے قائم تھا۔

سندھ میں اس خاندان کو معتضد باللہ کے زمانہ خلافت (۲۷۹ھ تا ۲۸۶ھ) میں عروج حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں اوچ منصورہ کی حدود ولایت میں شامل تھا بلکہ منصورہ کا حکمران اوچ ہی کا باشندہ تھا جس نے پہلے پہل منصورہ کی خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی۔

ہشام بن عبدالملک اموی کے عہد اقتدار میں (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) جب حکم بن عوانہ کلبی سندھ کی گورنری پر مامور ہوا تو اس کی معیت میں قبیلہ بنو اسد کا ایک

شخص منذر بھی تھا جس نے اوچ میں اقامت اختیار کی۔ عہد بنی عباس میں اسی منذر کے پوتے عمر بن عبدالعزیز بن منذر نے غالباً ۲۴۰ ہجری میں عباسی خلیفہ متوکل سے سندھ کی گورنری کے عہدہ کے لئے درخواست کی۔ خلیفہ نے اس کی درخواست کو اس کے خاندان کی سابقہ خدمات کے پیش نظر شرف پذیرائی بخشا۔ عمر بن عبدالعزیز بن منذر منصورہ کا پہلا خود مختار گورنر بنا۔ یہ شخص "باتیہ[1]" کا رہنے والا تھا جیسا کہ ابن حوقل نے اشکال البلاد (ذکر السند) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔[2]

تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں مسعودی سندھ آیا ہے۔ اس زمانے میں ملتان پر ابواللباب ابن منبہ کا خاندان تھا جو سامہ بن لوی بن غالب کی نسل میں سے قریشی الاصل تھا اور منصورہ پر ہبار بن اسود کے قبیلہ کے لوگ برسر اقتدار تھے۔ وہ لکھتا ہے۔[3]

وکان دخولی الی بلاد ملتان بعد الثلاثمائة والملك بها ابواللباب المنبه بن اسد القرشی وکذلك کان دخولی الی بلاد المنصورة فی هذا الوقت والملك علیها ابو المنذر عمر بن عبد الله ورایت بها وزیره رباجا وابنیه محمد او علیا ورایت بها رجلا سیدا من العرب وملکا من ملوکهم وهو المعروف بحمزة وبها خلق من ولد علی ابن ابی طالب ثم من ولد عمر بن علی وولد محمد بن علی۔

---

[1] باتیہ کے متعلق ہم پہلے ہی اوچ کے ناموں کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ یہ اوچ اور اس کے مضافات میں بولا جاتا تھا بھٹی قوم کی جانے سکونت ہونے کی بنا پر اس علاقہ کو بھاٹیہ کہا جاتا تھا۔ عربی میں یہی لفظ باتیہ بن گیا۔

[2] ماخوذ از "ہسٹوریز آف سندھ" مصنفہ ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ۔

[3] مروج الذہب للمسعودی صفحہ ۱۶۱ مطبوعہ بیروت۔

ترجمہ :-

ملتان میں میری آمد ۳۰۰ ہجری کے بعد ہوئی۔ یہاں کا بادشاہ ابو اللباب المنبہ بن اسد قرشی ہے۔ اسی زمانہ میں منصورہ بھی میرا جانا ہوا وہاں کا حکمران ابو المنذر عمر بن عبداللہ ہے۔ وہیں میری ملاقات اس کے وزیر" رباح" اور اس کے دونوں لڑکوں محمد اور علی سے ہوئی۔

منصورہ میں میں نے ایک عرب سردار اور ایک بڑے امیر سے بھی ملاقات کی جو حمزہ کے نام سے معروف تھا۔ اس بستی میں حضرت علی ابن ابی طالب[1] اور عمر بن علی اور محمد بن علی کی اولاد کے بہت سے لوگ بھی آباد ہیں۔

وبین ملوک المنصورہ وآل ابی الشوارب القاضی قرابۃ وصلۃ ونسب وذالک ان ملوک المنصورۃ الذین فیہم الملک فی وقتنا ھذا من ولد ھبار بن الاسود و یعرفون ببنی عمر بن عبدالعزیز القرشی ولیس ھو عمر بن عبدالعزیز بن مروان الاموی ۔

ترجمہ :-

شاہان منصورہ اور قاضی ابوالشوارب کے خاندان کے مابین رشتہ داری کا تعلق اور نسبی قرابت قائم ہے کیونکہ منصورہ کے حکمران ہمارے اس دور میں ہبار بن الاسود کی اولاد میں سے ہیں اور بنی عمر بن عبدالعزیز قرشی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں لیکن یہ ان عمر بن عبدالعزیز سے مختلف شخصیت ہیں

---

[1] حضرت علی ابن علی طالب کی اولاد میں سے جو لوگ سندھ میں آکر آباد ہوئے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض حضرات اس علاقہ میں شیعیت کے فروغ کا باعث بنے ہوں اور انہی کی تبلیغی مساعی سے یہاں پر قرامطہ کا اثر و رسوخ قائم ہوا ہو۔ افسوس کہ مسعودی نے کسی معروف شخصیت کا نام نہیں لیا جس سے حضرت علی کی اولاد کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہوسکتیں۔

جو خاندان بنی امیہ کے خلیفہ گزرے ہیں اور جو مروان کے پوتے تھے۔

ؔ ہبار بن الاسود کے بارے میں مورخین میں اختلاف رائے ہے مسعودی نے ہبار بن الاسود لکھا ہے اور اسے قریشی الاصل قرار دیا ہے وہ لکھتا ہے " ہبار حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی تھا اس نے شروع میں اسلام کی مخالفت کی مگر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گیا"۔ لیکن انوار غوثیہ میں " ہبار بن اسد بن ہاشم بن عبد مناف" درج ہے۔ "خلافۃ العارفین" نامی ایک قلمی کتاب میں بھی ہبار بن اسد کے ہاشمی ہونے کا تذکرہ ملتا ہے لیکن یہ روایت غلط نظر آتی ہے۔ البتہ عین الدین بیجاپوری نے اس کا شجرہ نسب لکھا ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے یعنی ہبار بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزٰی بن قصیٰ بن کلاب بن مرہ بن کعب اور یہ وہی ہبار بن الاسود ہے جس کے خون کو فتح مکہ کے موقعہ پر رائیگاں کر دیا گیا تھا مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سنگین جرم کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ جاؤ آج تم پر کوئی الزام نہیں ہے تم آزاد ہو۔ ہبار بن الاسود کا جرم یہ تھا کہ اس نے حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینب کے پیٹ میں نیزہ مارا جس سے اسقاطِ حمل ہو گیا اور اسی صدمہ سے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہبار کے دو لڑکے تھے۔ عبدالرحمان اور مالک عبدالرحمٰن کے ایک لڑکے کا نام زبیر تھا۔ زبیر کا لڑکا منذر تھا جو پہلے محمد بن مروان کلبی کے ساتھ ۱۰۰ھ میں سندھ آیا۔

اوچ اور ملتان پر قرامطہ کا تسلّط

چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کے شروع میں اوچ اور ملتان پر قرامطہ برسر اقتدار آ گئے۔ یہ شیعی مکتب فکر کے انتہا پسندوں کا گروہ تھا۔ ایک ایرانی عبداللہ بن میمون اس گروہ کا مؤسس اوّل تھا۔ اس کے معتقدین میں ایک ذہین شخص حمدان بن الاشعث تھا جو بعد میں قرمط کے نام سے مشہور ہوا۔ ۲۷۸ ہجری میں اس نے اپنے عقائد کی کھلم کھلا تبلیغ کا آغاز کیا اور مسلک قرامطہ اسی کی دماغی کاوشوں کا رہینِ منت ہے۔[1]

قرمط کے معنی عربی میں خط کے باریک اور تنگ لکھنے کے ہیں اور کام کو نزدیک رکھ کر سرانجام دینا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ احمد کا نام قرمط اس لئے

---

[1] قرامطہ فرقہ باطنیہ ہی کی ایک شاخ تھی جس کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا نام کا ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان تھا مگر بباطن اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی شورش انگیزیوں نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان کے خلاف لوگوں کو ابھارا، اس کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا مقصد اسلام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ قرامطہ کی زشتکاریوں کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے معتضد باللہ عباسی خلیفہ کے عہد حکومت میں حرم کعبہ سے حجر اسود کو چرا کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں نصب کر دیا۔ قرامطہ کا ہیڈ کوارٹر کوفہ کے نواح میں ایک بستی تھی جس کا نام انہوں نے "دارالہجرۃ" رکھا ہوا تھا۔ یہیں سے ان کی جماعتیں قتل و غارتگری کے منظم منصوبوں کو

بڑا کہ وہ اپنے قریبی حلقہ اثر کے لوگوں میں خفیہ طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا تھا۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں بحرین، خلیج فارس اور آخر عراق میں قرامطہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

۲۹۶ ہجری میں قرامطہ سے ملتا جلتا ایک اور فرقہ "اسماعیلیہ" افریقہ میں ظاہر ہوا اور ۳۵۶ ہجری میں مصر پر ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ بغداد کے عباسی خلفاء کے مقابلہ میں یہ لوگ فاطمیین مصر کے نام سے مشہور ہوئے اور عالم اسلامی کی ہمدردیاں جو پہلے صرف بغداد کو حاصل تھیں دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔

اسلامی مملکت کا ایک بڑا حصہ تو بغداد ہی سے وابستہ رہا مگر جہاں جہاں عجمی اثرات کا غلبہ تھا وہ علاقے فاطمیین مصر سے منسلق ہو گئے اور خطبوں میں مصر کے اسماعیلی خلفا کا نام لیا جانے لگا۔

ملتان اور اوچ میں قرامطہ کا تغلب اس عام دستور کے مطابق ہوا کہ مذہب کے غیر سرکاری فرقے عموماً اپنا اثر و رسوخ اور اپنا سیاسی تغلب مملکت کے دور دراز حصوں میں جا کر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ پہلے پہل قرامطہ عمان و مستعد کے علاقہ میں ظاہر ہوئے اور ۳۱۷ ہجری میں ابو طاہر قرمطی نے اس تحریک کو یہاں فروغ بخشا۔ چونکہ عمان اور سندھ کے درمیان دریائی آمد و رفت اور بحری تجارت کا سلسلہ عرصہ دراز سے قائم تھا اور فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے ان لوگوں نے سندھ کو بھی اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا نشانہ بنایا چنانچہ چوتھی صدی کے نصف اول ہی میں سندھ پر قرامطہ کے اثرات کا پرتو پڑنا شروع ہوا اور کچھ ہی عرصہ کے اندر اندر زیریں سندھ کا غالب حصہ ان کے زیر تصرف آ گیا۔

عملی جامہ پہنانے کے لئے نکلیں اور سلطنت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کو تاخت و تاراج کریں۔ بالآخر آپس کی پھوٹ کا شکار ہو کر حمدان قرمط کہیں بھاگ گیا اور روپوش ہو گیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اسے اس کے گروہ نے قتل کر دیا (الدولۃ العربیۃ، الجزء محمود کامل المحامی صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱)

بشاری مقدسی جو ۳۷۵ھ میں سندھ آیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:۔

" ملتان والے شیعیہ ہیں۔ اذان میں " حی علی خیر العمل " کہتے ہیں اور اقامت میں دو دفعہ تکبیر کہتے ہیں۔ ملتان میں خطبہ مصر کے فاطمی خلیفہ کا پڑھتے ہیں اور اسی کے حکم سے یہاں کا بند و بست ہوتا ہے۔ اور یہاں سے تحائف مصر بھیجے جاتے ہیں "[1]

نامور فلسفی اور مورخ ابو ریحان البیرونی ۴۲۴ ہجری میں ملتان آیا ہے۔ اس نے ملتان پر قرامطہ کے تسلط کا زمانہ اپنی آمد سے سو برس پیشتر کا لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے ربع اول ہی میں اس علاقہ پر قرامطہ کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔[2]

البیرونی نے پہلے قرامطی حکمران کا نام جلم بن شیبان لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے "جب قرمطی (اسماعیلیہ) ملتان پر قابض ہوئے تو جلم بن شیبان نے جو اس علاقہ پر غالب آگیا تھا۔ محمد بن قاسم کی مسجد کو بنی امیہ کے دور کی یادگار سمجھ کر توڑ ڈالا اور یہاں کے مشہور بت خانہ کو گرا کر اس میں مسجد بنائی"۔[3]

لیکن بعض تاریخی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو سامہ بن لوی کا خاندان قرمطی تحریک سے متاثر ہوا اور جلم بن شیبان اس خاندان کے بعد برسر اقتدار آیا۔[4]

قرامطہ کے مذہبی اور سیاسی عقائد و نظریات سے نپٹنے کے لئے خاندان بنو عباس کے خلفا نے اپنے زیر اثر ریاستوں کے حکمرانوں کو اس فتنہ کے استیصال پر ابھارا۔

---

[1] احسن التقاسیم بشاری مقدسی صفحہ ۴۸۱، ۴۰۵

[2] کتاب الہند لابی ریحان البیرونی صفحہ ۵۰۱

[3] کتاب الہند لابی ریحان البیرونی صفحہ ۵۰۱

[4] عرب ہند تعلقات از سلیمان ندوی

چنانچہ ۳۹۲ ہجری میں محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔[1] اس کا بڑا مقصد بھی قرامطہ کا استیصال تھا۔ اس نے سب سے پہلے سیستان یا سیوستان پر حملہ کیا اور اس علاقہ کے قرمطی حکمران حنیف کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنین لے گیا۔ پھر دوبارہ ۳۹۵ ہجری میں محمود غزنوی نے قرمطہ کے ایک بڑے مرکز بھاطیہ پر لشکر کشی کی جہاں ایک مضبوط قلعہ تھا اور قلعہ کے اردگرد بڑی گہری خندق تھی۔[2]

بھاطیہ[3] کی مہم سر کرنے کے بعد ۳۹۶ ہجری میں محمود غزنوی ملتان پر حملہ آور ہوا اور وہاں قرمطی حکمران داؤد بن نصر کو شکست فاش دے کر اس فتنہ کا سر کچل دیا جو اسلامی تاریخ کا انتہائی خطرناک فتنہ اور دشمن اسلام تحریک تھی۔

زین الاخبار کی روایت کے مطابق سلطان محمود ۳۹۶ ہجری میں جے پال کے بیٹے انند پال کو شکست دے کر ہندوستان کے راستے ملتان آیا تھا اور سات دن تک شہر کو محاصرہ میں لئے رکھا تھا۔ بالآخر اس شرط پر صلح ہوئی کہ صوبہ ملتان سے سال میں بیس مرتبہ ہزار ہزار درہم خراج ادا کیا جاتا رہے گا لیکن قرامطہ کی شورش پسند طبیعت اس معاہدے کی دیگر شرائط پر پوری نہ اتری۔ چنانچہ

---

[1] محمود غزنوی خاندان بنو عباسیہ کے زیر اثر حکمرانوں میں سے تھا۔ اس زمانہ میں اگرچہ کئی خود مختار ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ تاہم سیاسی بالاتری ابھی تک خلفائے بغداد کو حاصل تھی اور ان کی رسمی منظوری لینا ہر بادشاہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ محمود غزنوی کو خلیفہ عباسی القادر باللہ کی طرف سے سلطان کا خطاب مرحمت ہوا تھا۔

[2] تاریخ یمینی اور کتاب الہند سے ماخوذ

[3] بھاطیہ کے بارے میں میجر راورٹی کی رائے یہ ہے کہ یہ اوچ کا قدیم نام ہے۔ تاریخ فرشتہ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ دیگر تمام کتب تاریخ میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ بھاطیہ اور اوچ ایک ہی بستی کے دو نام ہیں۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے پوری ریاست بہاولپور کو جس میں اوچ بھی شامل ہے، بھاطیہ قرار دیا ہے۔

[4] جے پال کی حکومت گندھارا (شمالی سرحدی صوبہ) مغربی پنجاب اور لاہور کے بہت بڑے علاقہ پر تھی۔

۱۰۱۳ھ میں محمود غزنوی نے دوبارہ ملتان کا رخ کیا اور ملتان کو مکمل طور پر فتح کر کے وہاں کے قرامطہ کو گرفتار کر کے انہیں قتل کرا دیا۔ [1]

بھاطیہ میں سلطان محمود غزنوی کے عہد میں راجہ بجے راؤ حکمران تھا اور چونکہ بھاطیہ ملتان کے زیر اثر علاقوں میں سے تھا۔ اس لئے راجہ بجے راؤ نے قرامطہ کو یہاں پر خصوصی مراعات دے رکھی تھیں۔ چنانچہ اس نے ملتان کے ساتھ ساتھ بھاطیہ کی سرکوبی بھی ضروری سمجھی۔ [2]

محمود غزنوی کے خاندان کے زوال کے بعد سندھ پر بھٹی راجپوتوں کے ایک قبیلہ سومرہ کا اقتدار قائم ہو گیا یہ لوگ قرامطہ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی تہذیب و ثقافت ہندوانہ تھی۔ ان کے نام بھی ہندوؤں سے ملتے جلتے تھے۔ مصر کے اسماعیلی خلیفہ "الحاکم بامر اللہ" نے شام میں ایک نیا فرقہ پیدا کیا تھا۔ جس کا مشہور نام "دروز" ہے اور جو اب تک اسی پرانے نام سے موجود ہے۔ دروز فرقہ ۳۸۶ھ تا ۴۱۱ھ کے بین بین پیدا ہوا۔ بنیادی طور پر یہ فرقہ بھی قرامطہ کا ہم مسلک و ہمنوا تھا۔ اس فرقہ کے پیشواؤں اور مذہبی رہنماؤں کا سومرہ خاندان سے گہرا روحانی رابطہ تھا جیسا کہ ان کے ایک خط سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

سرنامہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"ملتان اور ہندوستان کے اہل توحید کے نام عموماً اور شیخ ابن سومر راجہ پال کے نام خصوصاً" اس کے بعد خط کی عبارت شروع ہوتی ہے۔

"اے معزز راجہ بل! اپنے خاندان کو اٹھا موحدین کو اور داؤد اصغر کو سچے

---

[1] معجم البلدان۔ طبقات ناصری

[2] تاریخ یمینی۔ کتاب الہند ابوریحان البیرونی

[3] عرب ہند تعلقات

دین میں واپس لا کر مسعودؒ نے جو اسے حال ہی میں قید اور غلامی سے آزاد کیا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ تو اس فرض کو انجام دے سکے جو تجھ کو اس کے بھانجے عبداللہ اور ملتان کے تمام باشندوں کے برخلاف انجام دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ تقدیس اور توحیدؒ کے ماننے والے جہالت ضد اور سرکشی و بغاوت والی جماعت سے ممتاز ہو جائیں"۔

محمود غزنوی کے حملہ سے ملتان کی جو تباہی ہوئی تھی اس نے اوچ کی اہمیت کو بڑھا دیا اور اوچ کی حیثیت سومروں کے عہد اقتدار میں ایک مرکزی مقام کی سی ہو گئی اور انہوں نے اوچ کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔

مرآت مسعودی میں لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ملتان کو تباہ اور ویران کر ڈالا۔ اس لئے اس جگہ کے لوگ اوچ آ گئے اور اس شہر کو دارالحکومت کے طور پر آباد کیا۔ [۳]

پانچویں صدی ہجری کے وسط میں قرامطہ پھر ملتان، اوچ اور سندھ کے دیگر علاقوں پر چھا گئے۔ اور ۴۸۴ ہجری / ۱۰۹۱ عیسوی میں جب حسن بن صباح نے

---

[۱] داؤد اصغر سے مراد غالباً داؤد بن نصر قرمطی کا لڑکا ہے جسے سلطان محمود غزنوی نے گرفتار کر لیا تھا اور جسے بعد میں محمود غزنوی کے لڑکے سلطان مسعود نے رہا کر دیا تھا۔ سومرہ خاندان انہی کے زیر اثر تھا اور انہی لوگوں کی کوششوں سے سومرہ قبیلہ مسلک قرامطہ کا ہم نوا بنا تھا۔

[۲] قرامطہ خود کو عام مسلمانوں سے تمیز کرنے کے لئے اپنے آپ کو موحدین کہا کرتے تھے۔

[۳] مرآت مسعود قلمی ص ۳۷

[۴] تاریخ ہند میں گورو ناز کا اللہؒ نے قرامطہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"محمود غزنوی نے اس فرقہ کا ملتان سے منہ کالا کیا مگر وہ یہاں سے بالکل خارج نہیں ہوئے تھے۔ دیہات میں ان کا ہمہ گیر اثر موجود تھا بلکہ ان کے نقیب دوامی مقرر تھے۔ جو لوگوں میں کفر و الحاد کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلاطین غزنوی کمزور ہو چکے تھے اور کوٹ کبرور کی ریاست بھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ

ایک دہشت پسند تحریک کے ذریعے قرمطہ کو مزید تقویت، ہم پہنچائی تو اس کے اثرات بھی سندھ پر پڑے اور یوں سندھ بالخصوص اوچ اور ملتان دوبارہ ان باطنی تحریکات کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس زمانہ میں سندھ کے تین بڑے شہر خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ سندھ کے شمال میں ملتان اور اوچ اور جنوب میں دیبل۔ ؎

وہ اس سیلاب کا مقابلہ کر سکی: مسلمان بالکل اقلیت میں تھے۔ ان ملحدوں نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ وہ بیچارے خانہ بدوشی کی حالت میں مارے مارے پھرتے تھے لیکن انہیں کہیں امان نہ ملتی تھی۔

؎ تحفۃ الکرام ج سوم ص ۱ مترجمہ مخدوم شریف تالیف ٹھٹوی

شہاب الدینؒ غوری کی لشکر کشی

۵۷۱ھ میں شہاب الدین غوری نے اپنے بھائی سلطان غیاث الدین شاہ غزنین کے حکم سے ملتان پر لشکر کشی کی، ملتان اور اس کے نواح کو قرامطہ کے قبضہ سے نکال کر شہاب الدین غوری نے اوچ پر حملہ کیا اور حسنِ تدبیر سے کام لے کر اوچ کے مضبوط قلعہ کو فتح کر کے اوچ اور ملتان کی حکومت اپنے ایک معتمد جرنیل علی کرماخ کے سپرد کی۔ شہاب الدین محمد غوری نے اوچ کا علاقہ سومرہ قبیلہ سے چھینا تھا۔ مفتوحہ علاقوں کا قرار واقعی انتظام کرنے کے بعد شہاب الدین محمد غوری واپس غزنی چلا گیا لیکن ۵۷۴ ہجری میں وہ پھر ملتان اور اوچ آیا اور اس راستہ سے ہوتا ہوا گجرات کے دارالحکومت انہل واڑہ (پٹن) پر حملہ آور ہوا۔ فخرالدین مرورودی جو شہاب الدین غوری کے عہد کا مؤرخ ہے اور جس کا سن وفات ۱۲۰۶ء ہے۔ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

در سنہ احدی و سبعین و خمسمائۃ سمت اوچ بھاطیہ و ملتان لشکر کشید طائفہ[1] بھاتیہ در حصار اوچہ محصر شدہ با سلطان محاربہ کردند بعد مدتے بعون اللہ

---

[1] طائفہ بھاتیہ سے

تعالیٰ حصار اوچہ فتح شد انتزاع ملتان و اوچ میر سپہ سالار علی کرماخ را دادہ ۔ خود طرف دارالملک غزنین مراجعت فرمود ۔

ترجمہ: ۵۷۱ ہجری میں اوچ ' بھاٹیہ اور ملتان پر لشکر کشی کی ۔ بھٹی قوم اوچ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر سلطان (شہاب الدین غوری) سے آمادہ پیکار ہوئے ۔ کچھ مدت کے بعد اوچ کا قلعہ فتح ہو گیا ۔ سلطان نے ملتان اور اوچ کا علاقہ سپہ سالار علی کرماخ کے سپرد کیا اور خود دارالسلطنت غزنین واپس لوٹ گیا"۔ بعض دوسری تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا ۔ ملتان اور اوچ پر قرامطہ کا مکمل استیلاؔ تھا ۔ چنانچہ طبقات اکبری میں ہے ۔

" بعد از یک سال یعنی در سنہ ۵۷۱ ہجری لشکر بجانب اوچ بردہ ملتان را از دست قرامطہ بر آوردہ متصرف شد و طائفہ بھاٹیہ در حصار اوچ متحصن شدہ چند روز محاربہ کردند آخر فتح شد و ملتان نیز مسخر گشت و اوچ و ملتان حوالۂ علی کرماخ نمودہ بجانب غزنین مراجعت نمود "۔ [۱]

ترجمہ:۔ (اپنے بھائی کی تخت نشینی کے) ایک سال بعد یعنی ۵۷۱ ہجری میں شہاب الدین غوری نے اوچ پر لشکر کشی کی اور ملتان کو دوبارہ قرامطہ کے ہاتھ سے چھین کر اس پر قبضہ کیا اور بھٹی قبیلہ کے لوگ اوچ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر چند روز تک بر سر پیکار رہے ۔ اوچ بھی آخر کار فتح ہو گیا ، اور ملتان بھی پوری طرح زیر ہو گیا ۔ شہاب الدین غوری نے اوچ اور ملتان کا علاقہ

مراد یقیناً یہی سومرہ قبیلہ ہے جس کے بارے میں مغربی مورخوں کی رائے یہ ہے کہ وہ نسلاً راجپوت ہیں اور اسی سے ان عرب مورخوں کی تردید ہو جاتی ہے جنہوں نے انہیں عربی النسل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

[۱] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۶

علی کرماخ کے سپرد کر کے خود غزنین کی طرف مراجعت کی۔" ملا عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے۔ لہ

"سلطان شہاب الدین نے اپنے برادر کلاں کی نیابت کے پہلے سال کے دوران ۵۷۰ ہجری میں گردیز کو فتح کر لیا اور پھر اوچ اور ملتان پہ قبضہ کر لیا اور قرامطہ کے طائفہ کو وہاں سے نکال دیا۔ قبیلہ "بھتیہ" نے اپنے آپ کو قلعہ بند کر رکھا تھا ان کا بھی قلع قمع کیا اور اس کے بعد یہ پورا علاقہ علی کرماخی کے سپرد کر کے واپس غزنی لوٹ گیا۔"

تاریخ فرشتہ میں شہاب الدین غوری کے قلعہ اوچ کو فتح کرنے کا تفصیلی حال مذکور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ٹہ

"۵۷۲ ہجری میں شہاب الدین غوری نے اپنے بھائی (غیاث الدین) کے حکم سے ملتان پہ لشکر کشی کی اور اس کے نواح کو قرامطہ کے قبضہ سے نکال کر شہاب الدین نے اوچہ پر حملہ کیا۔ اوچہ کا راجہ شہاب الدین کی آمد کی خبر سن کر قلعہ بند ہو گیا۔ شہاب الدین نے قلعہ کے گرد خیمے نصب کرائے اور دو چار روز تو قلعہ کی فتح کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ عرصہ کے بعد شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ لڑائی اور محاصرہ سے قلعہ اور صاحب قلعہ پر غالب آنا محال ہے اور تا وقتیکہ کوئی چال نہ چلی جائے یہ مہم کار آمد نہ ہو گی۔ شہاب الدین غوری نے ایک قاصد راجہ کی بی بی کے پاس بھیجا اور اسے پیغام دیا کہ اگر تیری کوشش سے قلعہ فتح ہو جائے۔ تو میں اس کے صلہ میں تجھ کو ملکہ بناؤں گا۔ رانی پہلے ہی شہاب الدین کے نام سے کانپتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس لڑائی کا نتیجہ شہاب الدین کی فتح ہو گی۔ رانی اوچہ شہاب الدین غوری کے دام مکر میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے قاصد سے کہا کہ میرا سن و سال اب ملکہ

لہ منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی ص ۳۴ ٹہ تاریخ فرشتہ مترجمہ حیدرآباد دکن

بننے کا نہیں ہے۔ میری بیٹی البتہ اس قابل ہے کہ ایسے اولوالعزم بادشاہ کی ملکہ بنے ، میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کروں گی اور اس کے صلہ میں بادشاہ میری بیٹی کو ملکہ بنائے۔ اور قلعہ پر قابض ہو کر میرے مال و متاع سے کچھ تعرض نہ کرے شہاب الدین نے رانی کی تمام شرطیں قبول کر لیں۔ رانی نے دو ایک دن میں شوہر کا کام تمام کر کے شہر کو شہاب الدین کے حوالے کر دیا۔ شہاب الدین غوری نے راجہ کی بیٹی کو مسلمان کر کے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ شہاب الدین نے ماں اور بیٹی کو غزنی بھیج دیا۔ [1]

سلطان معزالدین ابوالمظفر محمد بن سام شہاب الدین غوری کے غلاموں میں سے چار سر بر آوردہ اشخاص سریر آرائے سلطنت ہوئے۔

قطب الدین ایبک ——— جو دہلی کا بادشاہ بنا۔

شمس الدین التمش ——— یہ بھی دہلی کا حکمران بنا۔

تاج الدین ایلدوز ——— یہ لاہور اور اس کے اطراف و نواح کا حاکم تھا۔

ناصرالدین قباچہ ——— جس نے سندھ ملتان اور اوچ پر حکومت کی۔ اس کا پایۂ تخت اوچ تھا۔

علامہ منہاج سراج [2] نے طبقات ناصری میں ہندوستان کی چار علیحدہ علیحدہ ریاستوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] شہاب الدین غوری ان ماں بیٹی کو غزنی ساتھ تو لے گیا مگر وہ دل سے ان دونوں عورتوں کے سخت خلاف تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ جنہوں نے اپنے سابقہ ولی نعمت کے ساتھ وفا نہیں کی وہ اس کے ساتھ کیا وفا کرینگی۔ شہاب الدین کی سرد مہری سے اوچ کی رانی دل شکستہ ہو کر چند ہی روز میں مر گئی (ایضاً)

[2] علامہ منہاج سراج ناصرالدین قباچہ کے عہد کا مشہور مورخ ہے اور اس کے عہد حکومت میں اوچ کے مدرسہ فیروزیہ کا صدر نشین رہا۔

"آرام شاہ بن قطب الدین ایبک را قضائے اجل در رسید ممالک ہندوستان چہار قسم شد مملکت سندھ ناصر الدین قباچہ در تصرف آورد و مملکت دہلی بر سلطان سعید شمس الدین مضاف شد و مملکت لکھنوتی ملوک و سلاطین خلج در ضبط آوردند و مملکت لاہور گاہے ملک تاج الدین و گاہے ملک ناصر الدین قباچہ و گاہے سلطان شمس الدین بتفاوت احوال ضبط می کردند۔ [1]"

"(قطب الدین ایبک کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ حکمران ہوا) جب آرام شاہ مرا تو ہندوستان کی سلطنت چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ سندھ کی مملکت ناصر الدین قباچہ کے زیر تصرف آ گئی۔ دہلی کی سلطنت نیک بخت بادشاہ شمس الدین التمش کو مل گئی۔ لکھنوتی کا علاقہ خلجی حکمرانوں کے ماتحت ہو گیا۔ لاہور کی حکومت کبھی ملک تاج الدین یلدوز اور گاہے ناصر الدین قباچہ کے زیر اقتدار رہی اور کبھی شمس الدین التمش نے اس پر قبضہ جما لیا۔

---

[1] طبقات ناصری ص۲۸۸

ناصر الدین قباچہ کا عہد حکومت

ناصر الدین قباچہ شہاب الدین غوری کے معتمد علیہ غلاموں میں سے تھا۔ اس نے اپنے آقا کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا وہ شہاب الدین غوری کے دشمنوں کے استیصال میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔ اس کی ان گراں قدر خدمات کے صلہ میں شہاب الدین غوری نے اسے سندھ کا علاقہ تفویض کیا۔ اس نے ایک طرف سمندر تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا اور دوسری طرف لاہور کو بھی اپنے زیر تصرف لے آیا۔ قباچہ بڑا اچھا منتظم اور بہت خوبیوں کا انسان تھا۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اس کی طبیعت کا خاصا تھا۔ وہ انصاف پسند، علم دوست اور رحمدل بادشاہ تھا۔

جلال الدین منگبرنی خوارزم شاہ نے جب سندھ پر حملہ کیا اور اوچ پہنچ کر لوگوں کو زیر فرمان لانا چاہا تو اگرچہ اس وقت ناصر الدین قباچہ دارالحکومت میں موجود نہیں تھا۔ تاہم یہ اس کے حسن سلوک کا کرشمہ تھا کہ اوچ کے لوگوں نے خوارزم شاہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خوارزم شاہ نے شہر

لہ بادشاہ نے اوچ کا ملک ناصر الدین قباچہ کو عنایت کیا۔ تاریخ فرشتہ ج ۲، صفحہ ۰۰

کو آگ لگانے کا حکم دیا جس سے اوچ کا شہر ویران ہو گیا۔[1] ناصر الدین قباچہ کو جب خوارزم شاہ کی اس شرارت کی خبر ملی تو اس نے خوارزم شاہ کا تعاقب کیا اور اسے زبردست شکست دی۔ یہ ۶۱۱ ہجری کا واقعہ ہے۔ ۶۲۳ ھ میں چنگیزی سردار خلج خاں نے سندھ پر چڑھائی کی لیکن وہ بھی قباچہ کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوا۔ اس سے پہلے ۶۱۴ ھ میں وہ اپنے خسر تاج الدین یلدوز کو لاہور کے معرکے میں شکست دے کر لاہور اور اس کے گرد و پیش علاقہ پر قابض ہو چکا تھا۔[2] یوں اس کی حدود سلطنت پنجاب کے بیشتر علاقہ اور تقریباً پورے سندھ پر محیط تھیں۔[3]

ناصر الدین قباچہ سلطان قطب الدین ایبک سلطان دہلی کا داماد تھا۔ یکے بعد دیگرے سلطان کی دو بیٹیاں اس کے عقد میں آئیں۔ تاج الدین یلدوز حاکم لاہور کی بیٹی سے بھی اس نے شادی کی۔ اس نے اپنے بیٹے علاؤالدین بہرام شاہ کو جو قطب الدین ایبک کا نواسہ تھا اپنا ولی عہد نامزد کیا۔

تمام تاریخی تذکرے اس امر پر متفق ہیں کہ ناصر الدین قباچہ بہترین حکمران تھا اس کا عہد حکومت مثالی تھا۔ اور اس کے زمانے میں اوچ علم و فضل کا گہوارہ اور شریعت و طریقت کا مرکز بن گیا تھا۔ نزہت الخواطر میں ہے۔

وکان من اجواد الدنیا اجتمع الیہ السادۃ والاشراف ووفد العلماء علیہ من العراق وخراسان والغور وعزنۃ وکان عصرہ احسن العصور وزمانہ انضر الازمان[4]

---

[1] تاریخ جہاں کشائے جوینی صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۸ ج ۲

[2] تاریخ فرشتہ صفحہ ۷۰۰ ج چہارم

[3] نزہتہ الخواطر ج ۱۔ طبقات ناصری

[4] نزہتہ الخواطر صفحہ ۲۲۳ ج ۱۔ تصنیف علامہ سید عبدالحی بن فخر الدین الحسنی المتوفی ۱۳۴۱ء

ترجمہ:۔

"ناصرالدین قباچہ دنیا کے فیاض ترین لوگوں میں سے تھا۔ بڑے نامی گرامی رؤسا و شرفاء اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور عراق و خراسان اور غور و غزنی کے اہل علم و فضل کا اس کے پاس اجتماع ہوگیا۔ اس کا دورِ حکومت بہترین اور اس کا عہد حکمرانی نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔"

ناصرالدین قباچہ کے دور میں اوچ کا "مدرسہ فیروزیہ" دور دور تک مشہور تھا اور اس کے اساتذہ اور صدر نشینان مسند تدریس میں بڑے نامور اہل فضل و کمال حضرات کے نام ملتے ہیں۔ ناصرالدین قباچہ کا وزیر اعظم عین الملک فخرالدین حسین بن ابی بکر اشعری بھی ایک ممتاز علمی شخصیت تھی۔

۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں شمس الدین التمش نے ملتان پر اور اوچ پر حملہ کیا۔ ملتان کی مہم سر کرنے کے بعد اس نے قباچہ کے پایہ تخت اوچ پر چڑھائی کی اور اوچ کا محاصرہ کر لیا۔ ناصرالدین قباچہ ان دنوں مروٹ[۱] کے قلعہ میں مقیم تھا جو اس زمانہ میں بہت بڑی فوجی چھاؤنی اور جنگی مرکز تھا۔ جب قباچہ کو اوچ کے محاصرہ کی خبر ملی تو اس نے اپنے وزیر عین الملک حسین اشعری کو ہدایت کی کہ تمام زر و جواہر اور خزانہ بھکر منتقل کر دیا جائے اور خود بھی کشتی میں بیٹھ کر بھکر جا پہنچا۔[۲]

اوچ کا قلعہ کافی مضبوط تھا اور یوں بھی دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اس کی فوجی اہمیت مسلّم تھی اس لئے التمش کو اوچ کا قلعہ سر کرنے میں پورے دو ماہ کا عرصہ لگا۔ ناصرالدین قباچہ نے بھکر پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ شمس الدین التمش سے مقابلہ بے سود ہے چنانچہ اس نے

---

[۱] مروٹ کا قلعہ ریاست بہاولپور کے قدیم ترین قلعوں میں سے ہے اس کا مفصل ذکر آئندہ اوراق میں ہوگا۔

[۲] طبقات ناصری ص۱۴۵

بہت سے تحفے تحائف دے کر اپنے بیٹے اور ولی عہد بہرام شاہ کو التمش کے پاس بھیجا۔ اس اثنا میں اوچ فتح ہو چکا تھا۔ اور شمس الدین کا وزیر اعظم نظام الملک قوام الدین محمد بن ابی سعید الجنیدی قباچہ کے تعاقب میں ایک لشکر جرار لے کر بھکر روانہ ہو چکا تھا اس لئے قباچہ کا مصالحتی مشن بھی ناکام رہا۔ نظام الملک نے بھکر کا محاصرہ کر لیا۔ ناصر الدین قباچہ جان بچا کر دریا کے راستے فرار ہوا مگر دریا کی طوفانی لہروں کی نذر ہو کر لقمۂ اجل بن گیا۔ یہ واقعہ ۱۹ر جمادی الآخر ۶۲۵ ہجری کا ہے۔[۲]

ناصر الدین قباچہ کا عہد حکومت ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء سے لے کر ۶۲۵ ہجری ۱۲۲۸ء تک ہے۔ اس پورے عرصہ میں اوچ اس کا پایہ تخت رہا۔ طبقات ناصری نے اس کی کل میعادِ حکومت ۲۲ برس لکھی ہے۔[۳]

"مدت ملک او در زمین سندھ و اوچہ و ملتان بست و دو سال بود۔"

ناصر الدین قباچہ کی شکست اوچ کے زوال کی تمہید ثابت ہوئی اور اس کی وہ سیاسی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی جو اسے ملتان اور سندھ کا دار الحکومت ہونے کے سبب سے حاصل تھی اور اب وہ ملتان کا ایک ذیلی علاقہ بن کر رہ گیا۔ شمس الدین التمش نے اپنے وزیر نظام الملک محمد بن اسعد کو اس علاقہ کے نظم و نسق کی نگرانی کا کام سپرد کیا اور خود دہلی واپس چلا گیا۔

---

[۱] طبقات ناصری صفحہ ۱۰۷ تا ۱۰۹

[۲] طبقات ناصری میں تاریخوں کی صحت کا بہت کم اہتمام کیا گیا ہے اس لئے اس سلسلہ میں تضاد بھی محسوس ہوتا ہے سنین میں تو سقم کم ہے البتہ مہینوں اور دنوں کے حساب میں کئی جگہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بعض جگہ قباچہ کی غرقابی کی تاریخ ۱۹ر جمادی الآخر درج ہے اور بعض دوسرے مقامات پر ۲۲ اور ۲۸ جمادی الآخر درج ہے۔

[۳] طبقات ناصری صفحہ ۱۰۹

طوائف الملوکی کا دور

نظام الملک کے بعد اوچ اور ملتان کے علاقہ پہ التمش کا ایک درباری امیر اعز الدین کبیر خانی گورنر مقرر ہوا۔ اسی دوران سلطان شمس الدین التمش ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ میں انتقال کر گیا۔ شمس الدین التمش کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ تخت نشین ہوا مگر امرائے دربار کی اندرونی کش مکش کے سبب بہت جلد تخت حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

رکن الدین فیروز شاہ کے بعد شمس الدین التمش کی جوان ہمت بیٹی شہزادی رضیہ سلطانہ سریر آرائے سلطنت ہوئی لیکن وہ بھی ساڑھے تین برس کی مدت کے اندر اندر درباری امراء کی سازشوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ۲۸ رمضان ۶۳۷ ہجری

ؔ شمس الدین التمش ایک متقی، پرہیزگار اور نہایت نیک فرمانروا تھا۔ اس کے بارے میں تمام تاریخی تذکرے اس امر پر متفق ہیں کہ شاہانہ کروفر کے باوجود وہ دراصل ایک مرد درویش تھا۔ التمش کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ چونکہ وہ چاند گرہن کی مدت کو پیدا ہوا تھا اس لئے اسے التمش کہا جانے لگا۔ ترکی میں التمش کے معنی ہراول دستہ کے بھی ہوتے ہیں۔ (غیاث اللغات) شمس الدین التمش کی مدت حکومت ۲۶ برس ہے۔ (ماخوذ از مرآۃ الاسرار تذکرۃ الاصفیا، مجمع کرامات فی آثار قیامت، سیر العارفین و طبقات ناصری)۔

کو معز الدین بہرام شاہ تخت حکومت پر متمکن ہوا مگر ۲ سال کی مختصر سی مدت کے بعد درباری امرا نے اسے بھی قتل کروا دیا۔

اوچ اور ملتان کا گورنر اعزالدین کبیر خانی جو ان سازشوں کا کرتا دھرتا تھا اعزالدین بلبن کے نام سے مسند حکومت پر فائز ہوا مگر رکن الدین فیروز شاہ کے بیٹے علاؤ الدین مسعود نے اسے ہٹا کر خود تاج و تخت سنبھالا اور اپنے ایک چچا جلال الدین کو قنوج کا اور دوسرے چچا ناصرالدین کو بہرائچ کا علاقہ سونپا۔

علاؤ الدین مسعود کو داد حکومت دیتے ہوئے چار سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ اسے اپنے چچا ناصرالدین[۱] محمود کے ہاتھوں تخت و تاج سے محروم ہونا پڑا۔

ناصرالدین محمود

۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو ناصرالدین تخت شاہی پر متمکن ہوا اور غیاث الدین[۲] بلبن کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ غیاث الدین بلبن نے اپنے چچا زاد بھائی شیر خاں کو اوچ اور ملتان کا گورنر مقرر کیا۔ شیر خاں ایک سلجھا ہوا منتظم اور بہادر سپہ سالار تھا۔

ادھر اعزالدین بلبن نے ناصرالدین بن التمش کی نرمدلی اور شرافت سے

---

[۱] ناصرالدین محمود شمس الدین التمش کا فرزند اور نہایت علم دوست اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ قاضی منہاج سراج نے تاریخ پر ایک مستند کتاب "طبقات ناصری" اسی نیک دل بادشاہ کی طرف معنون کی ہے۔

[۲] غیاث الدین بلبن بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا انسان تھا۔ وہ ایک بہترین منتظم اور ایک عالی دماغ مدبر تھا۔ ناصرالدین محمود نے تمام اختیارات اس کے سپرد کر دیئے۔ اور اسے حق تعالیٰ کے احکامات کی پابندی اور رعایا کی فلاح و بہبود کے بارے میں خاص طور پر فہمائش کی اور امور سلطنت کلی طور پر اس کی تحویل میں دے دیئے۔ ناصرالدین کی موت پر زمام حکومت اس کے ہاتھ آئی۔ وہ علما اور صوفیا کا عقیدت مند اور مذہب کا سچا پیرو تھا۔ اس نے حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے عقد میں اپنی بیٹی کر دے کر عقیدت و نیاز مندی کا اظہار کیا۔

فائدہ اٹھا کر ملتان اور اوچ کی گورنری کے لئے دوبارہ درخواست پیش کی اور سلطان نے روایتی فیاضی سے کام لے کر اسے ملتان، اوچ اور ناگور کے علاقہ کا از سر نو گورنر مقرر کیا۔

لیکن اعزالدین کبیر خانی کا باطن صاف نہیں تھا اس نے ۶۵۶ھ/۱۲۵۷ء میں منگلوں کو اوچ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ سلطان ناصرالدین کو جب اس کی غداری کا علم ہوا تو اس نے اعزالدین بلبن کو ہٹا کر اس کی جگہ دوبارہ شیر خاں کو ملتان اور اوچ کا گورنر مقرر کیا۔

۲۲ر شوال ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء بروز دوشنبہ سلطان ناصرالدین محمود نے ملک سنجر کو اوچ کا گورنر مقرر کیا۔ اوچ کے اطراف میں سنجر پور کی بستی اب تک اس گورنر کی یاد دلاتی ہے۔

۱۱ر جمادی الاول ۶۶۴ ہجری/۱۲۶۶ عیسوی کو سلطان ناصرالدین محمود انتقال کر گیا۔ وہ انتہائی نیک نفس، پرہیزگار، خدا ترس اور قانع و متوکل بادشاہ تھا۔ اور اس کی ذاتی زندگی تقوی و طہارت اور زہد و ورع کی زندگی تھی۔

غیاث الدین بلبن

ناصرالدین محمود کے بعد ۶۶۴ھ میں غیاث الدین بلبن برسر اقتدار آیا۔ وہ شمس الدین التمش کے چالیس معتمد غلاموں میں سے ایک تھا۔ اس نے لاہور، ملتان، اوچ اور سندھ کے علاقے اپنے سعادت مند بیٹے سلطان محمد کی عملداری میں دے دیئے۔ سلطان محمد حضرت بہاءالحق ذکریا ملتانی اور حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کا بڑا عقیدت مند تھا اور اپنے عہد کے تمام اہل اللہ سے اس کے مراسم نیاز مندانہ تھے۔ مشہور صوفی شاعر حضرت امیر خسروؒ اسی کے مصاحب خاص تھے۔ ۶۸۳ھ میں چنگیز خاں نے تیمور اور تملغ خاں کو ایک لشکر جرار دے کر ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس تاتاری یلغار کو

کو روکتے ہوئے شہزادہ محمد خاں قتل ہو گیا۔ تاہم غیاث الدین بلبن نے چنگیزی لشکر کو شکست فاش دی۔

غیاث الدین بلبن کو اپنے جواں سال فرزند کی موت کا بےحد صدمہ تھا اور وہ اسی غم میں ۶۸۵ھ میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ [1]

---

[1] غیاث الدین بلبن نے اپنے لخت جگر کے انتقال کے بعد اپنے پوتے یعنی شہزادہ محمد کے لڑکے کیخسرو کو اپنا ولی عہد نامزد کیا اور اوچ اور ملتان کا علاقہ اس کے زیر انصرام کر دیا۔ لیکن وزیر اعظم ملک فخرالدین نے بلبن کے انتقال کے بعد کیخسرو کی بجائے بلبن کے دوسرے پوتے کیقباد کو ایک خفیہ سازش کے ذریعے بادشاہ بنا دیا۔ اور کیخسرو اپنے ابن عم کی فوجوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

دورِ خلجی

جلال الدّین خلجی

غیاث الدین بلبن کے بعد اس کا ایک درباری ملازم جلال الدین خلجی بادشاہ بنا یہ شخص بڑا مدبّر اور آزمودہ کار حکمران ثابت ہوا۔ ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء میں دہلی میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

۶۹۳ھ میں سلطان جلال الدین خلجی نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کو ملتان اور اوچ کا حکمران بنا دیا۔ ارکلی خاں نہایت خوش طبع اور بہادر شخص تھا

علاؤالدین خلجی

۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء میں جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے اور داماد علاؤالدین خلجی نے قتل کرادیا اور خود سریر آرائے سلطنت ہوا۔ علاؤالدین خلجی نے سندھ اور ملتان کی مہم کو سب سے مقدم سمجھا۔ اپنے بھائی الغ خاں کو ۴۰ ہزار

لہ جلال الدین خلجی ۷۰ سال کی عمر میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ بڑا منکسرالمزاج، پابندِ شریعت اور بردبار تھا۔

سواروں کے ساتھ ملتان روانہ کیا۔ کیونکہ جلال الدین خلجی کا بیٹا ارکلی خاں اس علاقہ میں ابھی تک حکمران تھا۔

ارکلی خاں نے اپنی شکست کے آثار دیکھ کر ملتان کے مشہور بزرگ شخصیت شاہ رکن عالم کے توسط سے الغ خاں سے امان طلب کی جس کے بعد اسے جان بخشی کا پروانہ مل گیا اور وہ ملتان اور اوچ کا علاقہ چھوڑ کر چلا گیا۔

۶۹۶ھ میں سلطان علاؤالدین نے نصرت خاں کو جو پہلے جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں دیبل کا گورنر تھا۔ ملتان، اوچ، بھکر، سیستان اور ٹھٹھہ کے تمام علاقوں کا حکمران نامزد کیا۔

اپنی حکومت کے آخری ایام میں علاؤالدین خلجی نے تاتاریوں کے حملہ کی روک تھام کے لئے غازی خاں ملک نامی ایک سردار کو ۱۰ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیپال پور میں متعین کیا اور ملتان، اوچ اور سندھ کا علاقہ اسے بطور جاگیر مرحمت کیا۔

لے علاؤالدین خلجی بڑا صاحب عزم و ہمت حکمران تھا۔ شمالی ہند کے تمام علاقوں کو اس نے زیر کیا۔ یہ پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے جنوبی ہند کے بہت بڑے حصہ پر اپنا تسلط و اقتدار قائم کیا۔

دورِ تغلق

غیاث الدین تغلق

۹۔ شوال ۷۱۱ ہجری میں سلطان علاؤالدین خلجی کا انتقال ہو گیا اور اس کی نا خلف اولاد کے ہاتھ سے زمام حکومت نکل گئی اور ۷۲۰ ہجری میں ملتان، اوچ اور دیپال پور کا حاکم غازی ملک سلطان غیاث الدین تغلق شاہ[۱] کے نام سے بر سر اقتدار آ گیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد اقتدار میں سومرہ قبائل نے بغاوت کر کے ٹھٹھہ کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان مذکور نے ملک تاج الدین کو ملتان اور اوچ کا، خواجہ خطیر کو بکھر اور علی شیر کو سیوستان کا حاکم مقرر کیا۔ ۷۲۳ھ میں غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے محمد تغلق کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔

محمد تغلق

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات پر اس کا بیٹا فخرالدین جونا سلطان محمد تغلق کے

---

[۱] تغلق کے لغوی معنی پہاڑی کے ہیں اور وہ پشتو کے لفظ روہیلہ کا مترادف ہے۔ "تغلق" غیاث الدین بلبن کا غلام تھا

لقب سے ۷۲۵ ہجری میں مسند حکومت پر فائز ہوا۔

محمد تغلق نے ۷۲۷ھ میں کشلو خاں کو سندھ کا علاقہ سپرد کیا مگر اس نے کچھ عرصہ بعد بغاوت کر دی اور ملتان اور اوچ وغیرہ کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر شورش بپا کر دی۔ ۷۲۸ھ میں محمد تغلق باغیوں کی سرکوبی کے لئے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ملتان پہنچا، کشلو خاں قتل ہو گیا اور اس کے ساتھیوں کو حضرت شاہ رکن عالم کی سفارش پر عام معافی دے دی گئی۔

۷۵۱ھ میں سلطان محمد تغلق کے غلام طغی نے بغاوت کی۔ محمد تغلق نے اس کا تعاقب کیا۔ طغی بھاگ کر ٹھٹھہ جا پہنچا، محمد تغلق اس کا پیچھا کرتے ہوئے ٹھٹھہ گیا۔ جب وہ ٹھٹھہ سے ۱۴ میل کے فاصلے پر تھا اس دن عاشورہ محرم تھا۔ محمد تغلق نے روزہ رکھا اور مچھلی سے روزہ افطار کیا جس سے اچانک اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ آخر ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو ۱۱ روز بیمار رہ کر ۲۷ سال تک داد حکومت دینے کے بعد انتقال کر گیا۔

سلطان محمد تغلق کے دور حکومت میں مشہور سیاح ابن بطوطہ اوچ آیا ہے اوچ میں اس کی آمد ۷۳۴ھ میں ہوئی۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں ملتان کا صوبہ اوچ سے علیحدہ تھا۔ اوچ کا گورنر سید جلال الدین کیچی تھا جو شجاعت اور کرم میں مشہور تھا اور ملتان کا گورنر قطب الملک تھا جو بقول ابن بطوطہ بڑا عادل، فاضل اور امیر شخص تھا۔

فیروز شاہ تغلق

سلطان محمد تغلق کی وفات کے تیسرے روز یعنی ۲۴ محرم ۷۵۲ ہجری کو اس کا چچا زاد بھائی سلطان فیروز شاہ تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا۔

اس نے اپنے بیٹے کا نام بھی غیاث الدین رکھا اس کی والدہ پنجابی جاٹ قبیلہ کی تھی۔ (خلاصۃ التواریخ)

فیروز شاہ تغلق کے والد کا نام رجب تھا۔ رجب کے دو بھائی اور بھی تھے ایک سلطان غیاث الدین تغلق، دوسرے ابو بکر تغلق۔ یہ تینوں بھائی سلطان علاؤالدین کے عہد حکومت میں خراسان سے دہلی آئے۔ فیروز شاہ تغلق کا والد رجب سلطان علاؤالدین کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ رجب کے ہاں ۷۰۹ھ میں فیروز شاہ پیدا ہوا۔

فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ پر سمہ خاندان حکمران تھا۔ جام بابنیہ اور جام جونہ دو بھائیوں کی مشترکہ حکومت سندھ کے بعض علاقوں پر قائم تھی۔ جام بابنیہ سلطنت دہلی سے عناد رکھتا تھا۔ اور مغلوں کے ساتھ مل کر سندھ اور گجرات کے ان علاقوں پر دھاوا بولتا رہتا تھا جو دہلی کے زیر فرمان تھے۔ ایک دفعہ جام بابنیہ اوچ اور ملتان تک آ پہنچا۔ چنانچہ اس کی سرکوبی کے لئے فیروز شاہ نے ایک لشکر جرار لے کر ٹھٹھہ پر حملہ کیا۔ جام بابنیہ کو جب اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو اس نے ایک قاصد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دیں۔ حضرت موصوف کی سفارش پر جام بابنیہ کی جان بخشی ہوئی۔[1]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف (مقدمہ چہاردہم)

نواہوں حاکم اوچ

فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں اوچ کا حکمران ایک ہندو نواہوں تھا جو اپنی ایک سیاسی غلطی کی وجہ سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی حضرت صدر الدین راجو قتال کے عتاب کا شکار ہو کر قتل ہوا۔ فیروز شاہ

لہ تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص۳۳۳، ص۳۴۵ تاریخ معصومی، ص۵۲ نواہوں کے قتل کا قصہ یہ ہے کہ جن دنوں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ مرض الموت میں مبتلا تھے نواہوں ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا "جس طرح خدائے وحدہٗ لاشریک نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاءؑ بنایا اسی طرح آپ کو خاتم الاولیاء قرار دیا ہے۔ چونکہ اس کے اس بیان سے توحید و رسالت کا اقرار مترشح ہوتا تھا اس لئے مخدوم صدر الدین راجو قتال نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے ورنہ وہ مرتد قرار دے کر کیفر کردار کو پہنچے گا۔ نواہوں راتوں رات اوچ سے بھاگ نکلا اور دہلی پہنچ کر فیروز شاہ تغلق سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان فیروز شاہ چونکہ اس کا سرپرست ہے اس لئے اس معاملہ میں بھی وہ اس کی حمایت کرے گا لیکن سلطان فیروز شاہ تغلق کو آستانہ بخاریہ سے جو گہرا دلی لگاؤ تھا اس کے پیش نظر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ حضرت صدر الدین راجو قتال کے فیصلہ سے سرتابی کی جرأت کرتا۔ اس نے معذرت کر دی کہ اس سلسلہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ادھر حضرت صدر الدین راجو قتال کو جب نواہوں کے فرار ہو کر دہلی پہنچنے کا علم ہوا تو آپ بھی دہلی تشریف لے گئے۔

تغلق نہایت نیک نفس متدین، پابندِ شریعت اور عابد و زاہد بادشاہ تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے۔

"او پادشاہے بود فاضل، عادل، کریم و رحیم و حلیم رعیت و سپاہ ازو راضی بودند و ہیچ کس در عہد او یارائے ظلم نہ داشت"

"یہ نہایت فاضل، انصاف منش، فیاض، رحمدل، بردبار بادشاہ تھا۔ رعایا اور فوج اس سے بہت خوش تھی اور کسی کو اس کے عہد میں ظلم کرنے کی مجال نہیں تھی"

محمد تغلق کے انتقال کے بعد جب بادشاہت کے لئے قرعہ فال اس کے نام پڑا اور تمام امراء مشائخ اور علماء نے باہمی مشورے سے اس کو بادشاہ نامزد کیا تو اس نے بڑے تامل اور پس و پیش سے یہ ذمہ داری قبول کی۔ بادشاہت کا منصب قبول کرنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کی اور بارگاہِ خداوندی میں دعا کی کہ انتظام سلطنت اور انصرامِ حکومت میں حق تعالےٰ کی توفیق ہمیشہ اس کی دستگیری کرے۔ اپنے عہد کے تمام بزرگوں سے اس کے تعلقات انتہائی نیاز مندانہ تھے بالخصوص اوچ کے نامور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا بہت زیادہ عقیدت مند تھا۔

فیروز شاہ تغلق کے بعد یکے بعد دیگرے ایک ایک سال کی مدت کے لئے کئی ایک تغلقی حکمران آئے اور چلے گئے۔ بعد ازاں محمود تغلق کے زمانے میں جو اس خاندان کا آخری حکمران تھا اور جس کا عہد حکومت ۱۳۹۱ء سے ۱۴۱۲ء تک

اور نواہوں سے مطالبہ کیا کہ یا تو وہ اعلانیہ طور پر اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کرلے ورنہ ارتداد کی سزا اس پر لاگو ہوگی۔ نواہوں بھی ضد کا پکا ثابت ہوا اس نے حضرت مخدوم کے اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ سلطان فیروز شاہ نے نواہوں کو حضرت صدرالدین راجو قتال کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اسے ارتداد کا مجرم قرار دے کر قتل کر دیا اور واپس اوچ تشریف لے آئے۔

ہے۔ اوچ کا حاکم نصیرالملک تھا۔ اوچ کے علاوہ ملتان اور پنجاب کا بہت بڑا حصہ بھی اس کی عملداری میں شامل تھا۔ یہ نصیرالملک بعد میں خضر خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ نصیرالملک نے سارنگ خاں کو اوچ کا حاکم مقرر کیا۔ اسی سارنگ خاں کے زمانہ میں تیمور کا پوتا پیر محمد اوچ پر حملہ آور ہوا، سارنگ خاں کو شکست ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۳۹۸ء کا ہے۔ اس کے دو برس بعد خود تیمور گورگان اوچ کے راستے ملتان ہوتا ہوا دہلی پر حملہ آور ہوا۔

خضر خاں جو ملتان، اوچ اور دیپال پور کا وائسرائے تھا اس نے تیمور سے اظہار نیاز مندی کیا جس سے خوش ہو کر تیمور نے اس کے سابقہ علاقوں کے علاوہ پانی پت، بھٹنڈہ، میرٹھ، جموں اور لاہور کے علاقے بھی اس کے سپرد کر دیئے محمود تغلق کی حکومت کے خاتمہ پر حکومت و اقتدار پر خضر خاں نے قبضہ کر لیا اور ایک نئے حکمران خاندان "خاندانِ سادات" کا بانی ہوا۔

خاندان سادات

امیر تیمور گورگان نے جب سلطنت دہلی کا خاتمہ کیا۔ اس زمانہ میں خضر خان دیپال پور، ملتان اور اوچ کا گورنر تھا۔ لیکن اس نے اپنے تدبر اور دُور اندیشی سے امیر تیمور کی رائے کو اپنے حق میں کر لیا اور امیر تیمور جاتے وقت یہ تمام علاقے خضر خاں کے سپرد کر گیا۔ خاندان سادات کے دائرہ حکومت میں ملتان، اوچ، دہلی اور آگرہ کے علاقے شامل تھے۔ ۱۴۱۴ء میں وہ تخت دہلی پر متمکن ہوا اور اس نے اوچ کی حکومت ملک عبدالرحیم کے سپرد کی جو اس کے باپ کا منہ بولا بیٹا تھا۔

۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء میں خضر خاں رحلت کر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالفتح معزالدین مبارک شاہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس نے اپنے ایک معتمد سردار ملک محمود حسن کو اوچ اور ملتان کا گورنر مقرر کیا۔ ملک محمود نے اوچ میں ایک فوجی مرکز قائم کیا تاکہ سندھ، ملتان اور راجپوتانہ کے زیر اثر علاقوں میں سیاسی اور فوجی غلبہ قائم رکھا جا سکے۔ ملک محمود کی ان فوجی خدمات کے صلہ میں اسے عماد الملک کا خطاب دیا گیا۔ ازاں بعد ۸۲۵ھ میں عماد الملک کو واپس دہلی بلا لیا گیا۔ اس اثناء میں حسرت کھوکھر نے اوچ اور ملتان میں شورش

برپا کر دی۔ مبارک شاہ کھوکھروں کی اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے خود ملتان پہنچا۔ اوچ جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کسی فوری ضرورت سے واپس دہلی جانا پڑا اور ۸۳۸ھ / ۱۴۳۵ء میں اس کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مبارک شاہ کا بھتیجا محمد شاہ بن فرید خاں بن خضر خاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس نے بہلول لودھی[1] کو ملتان، اوچ اور سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ دس برس تک داد حکومت دینے کے بعد محمد شاہ ۱۴۴۵ء میں انتقال کر گیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے علاؤالدین محمد کے ہاتھ میں زمامِ اختیار آئی مگر وہ انتہائی کمزور حکمران ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں اوچ اور ملتان پر مغلوں نے تاخت و تاراج کی اور اوچ کا علاقہ سادات کے خاندان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۴۵۰ء میں علاؤالدین انتقال کر گیا اور سلطنت لودھی خاندان کے تصرف میں آ گئی۔

---

[1] بہلول لودھی سلطان شاہ کا بیٹا تھا جو خضر خاں کا مقرب اور معتمد غلام تھا۔ خضر خاں نے سلطان شاہ کو سرہند کا گورنر مقرر کیا تھا۔

شیخ محمد یوسف قریشیؒ

خاندانِ سادات کے آخری بادشاہ سلطان علاؤالدین محمد کی کمزوری اور بے تدبیری کے باعث ملتان اور اوچ پر بیرونی حملوں کے سلسلہ کا جو آغاز ہوا تھا اس کو دیکھ کر ملتان اور اوچ کے سمجھدار اور باشعور طبقہ نے ملتان کے مشہور سہروردی بزرگ حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے سجادہ نشین شیخ محمد یوسف قریشی کو اپنا بادشاہ نامزد کیا۔

تاریخ ہند میں مولانا ذکاؤاللہ دہلوی نے ان کا سنِ تخت نشینی ۸۴۷ھ لکھا ہے۔ تاریخ نظام الدین کی روایت ہے کہ "چوں در ۸۴۷ھ نوبت سلطنت و فرمانروائی دہلی بہ سلطان علاؤالدین بن محمد شاہ رسید امر حکمت و کار سلطنت مختل گشت و در ممالک محروسہ ہند طوائف بہم رسید ولایت ملتان بواسطہ تواتر صدمات قہر مغول از حاکم خالی ماند چوں بزرگی شیخ الطریقہ بہاؤالدین زکریا ملتانی قدس سرہ در قلوب اہل ملتان و جمہور زمینداراں صوبہ بنوع قرار گرفتہ بود کہ زیادہ بر آں متصور نہ باشد جمیع اہالی و اشراف و عموم سکنہ و جمہور متوطناں آں حدود شیخ محمد یوسف را کہ تولیت خانقاہ و حراستہ مجاورت روضہ رفیعہ شیخ بہاؤالدین زکریا با و متعلق بود سلطنت و پادشاہی برداشتہ بر منابر ملتان و اوچ وغیرہ بعضے قصبات

خطبہ بہ نام او خواندند و مشار الیہ نیز بہ انتظام مہام حکومت پرداختہ شروع در از دیادِ جمعیت و افزونئ لشکر نمودہ دل ہائے زمینداراں بخود رام ساخت و مہمات ملکی را رونقے و رواج داد۔"

مقصد یہ کہ جب تختِ دہلی پر سلطان علاؤالدین بن محمد شاہ متمکن ہوا تو نظام سلطنت درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ملتان کا علاقہ مغلوں کے پے در پے حملوں سے ویران ہو رہا تھا اس لئے یہاں کے سر برآوردہ لوگوں نے جو حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کے دلی عقیدت مند تھے۔ انہوں نے اس درگاہ کے سجادہ نشین شیخ محمد یوسف کو اپنا بادشاہ منتخب کیا اور ملتان، اوچ اور دیگر قصبات میں منبروں پر ان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ شیخ محمد یوسف نے بھی بڑی دلجمعی سے امورِ مملکت کو سرانجام دیا اور فوجوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور اس علاقہ کے تمام زمینداروں کو مطیع کر لیا اور نظم و نسق کی اچھی دیکھ بھال کی۔

لانگاہ خاندان

جب شیخ محمد یوسف قریشی کی حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی اور ملتان، اوچ اور دیگر اضلاع پر ان کا اقتدار مستحکم ہو گیا تو سیوی (سندھ) کا ایک سردار جو لانگاہ قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور ایک عرصہ سے ملتان اور اوچ پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک چال چلی اور شیخ محمد یوسف کے نام ایک مکتوب ارسال کیا جس میں اپنے نیاز مندی کے قدیم رابطوں کا بطور خاص ذکر کیا گیا تھا اور ساتھ ہی شیخ کے عقد میں اپنی صاحبزادی کی پیش کش کی تھی۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

" آباؤ اجداد ما را نسبت ارادت و اعتقاد بسلسلۂ ایشاں درست شدہ و مملکت دہلی از آشوب و فتنہ خالی نیست و می گویند کہ ملک بہلول لودھی دہلی را متصرف شدہ خطبہ بنام خود خواندہ اگر شیخ متوجہ احوال جماعۂ لنگاہان شود و ما را از جملہ لشکریاں خود دانند بر خدمتے و مہمے کہ روئے دہد در جاں سپاری خود

ے اس خاندان کے افراد نے علاقہ ملتان واپس پر ۱۴۳۰ء سے ۱۵۲۶ء تک تقریباً اسی سال تک حکومت کی۔ مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ یہ خاندان بلوچستان سے ہجرت کرکے یہاں آیا (مرقع ملتان صفحہ ۲۶۸)۔

را معاف نخواہم داشت و بالفعل بجہتہ استحکام ارادت و جانسپاری دختر خود را بہ شیخ می دہم و ایشاں را بہ دامادی خود قبول می کنم۔"

یعنی "ہم باپ دادا کے وقت سے آپ کے سلسلہ سے اعتقاد رکھتے چلے آئے ہیں۔ دہلی کی سلطنت فتنہ و خلل سے پر ہے اور اسی دوران میں بہلول لودھی افغان نے دہلی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ قوم لنگاہ کی خاطر داری کریں اور اسے اپنے لشکر میں شامل کریں تاکہ بوقت ضرورت وہ جان سپاری کا مظاہرہ کریں بالفعل عقیدت و نیاز مندی کے تعلق کو مضبوط کرنے کی غرض سے اپنی لڑکی کو آپ کے عقد میں دیتا ہوں۔"

شیخ محمد یوسف اس دسیسہ کاری سے قطعاً بیخبر تھے انہیں کیا علم تھا کہ اس سارے واقعہ کے پیچھے کونسی سازش کارفرما ہے۔ انہوں نے رائے سہرہ کی پیشکش کو بلا تامل قبول کر لیا اور رائے سہرہ کی لڑکی سے شادی کر کے اسے اپنے حرم میں داخل کیا۔ رائے سہرہ اپنی لڑکی سے ملنے کے بہانے اکثر ملتان آتا جاتا رہتا اور اس ذریعے اسے شیخ کی قوت اور ان کی جمعیت کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہتیں۔ بظاہر وہ شیخ کا بڑا عقیدت مند خود کو ظاہر کرتا تھا اور اس کے اس اظہار نیاز مندی کی بناء پر شیخ کا اس سے قلبی رابطہ استوار ہو چکا تھا اور خاصی بے تکلفی خسر اور داماد کے درمیان قائم ہو چکی تھی تاہم شیخ نے رائے سہرہ کی اس درخواست کو قبول کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا کہ اسے ملتان میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ دو سال سے زیادہ عرصہ شیخ کی حکومت کو نہیں گزرا تھا کہ رائے سہرا اپنے خواب کی تعبیر کے لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ کوشاں ہوا اور ایک مرتبہ اپنی بیٹی سے ملنے کے بہانے جب وہ ملتان پہنچا تو اس کے ساتھ جنگ آزما بلوچی جوانوں کی ایک جمعیت بھی ہم رکاب تھی۔ اپنی فوج کو ہمراہ لانے کا عذر اس نے یہ پیش کیا کہ میں اپنے بہادروں کو اپنے ساتھ اس لئے لایا ہوں کہ آپ اگر میرے ذمہ کوئی فوجی مہم لگائیں تو فوراً تعمیل ارشاد ہو سکے۔ شیخ نے اس کی اس حکمت عملی کو بھی اس کی

عقیدت ہی کا ایک مظاہرہ سمجھا اور فوجی جوانوں کے ساتھ اسے قلعہ میں آنے کی اجازت دے دی جہاں ان کے لئے خیمے نصب کر دیئے گئے۔ عشا کی نماز کے بعد رائے سہرو پہلے سے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اپنی لڑکی سے ملنے کے لئے شاہی حرم میں داخل ہوا۔ اپنے ملازم کو پہلے سے یہ پٹی پڑھا دی کہ جب میں محل میں پہنچ جاؤں تو بکری کے خون کا بھرا ہوا ایک پیالہ میرے لئے لیتے آنا۔[1] رائے سہرو جب لڑکی سے مل کر اپنی خوابگاہ میں پہنچا تو ملازم خون کا لبالب پیالہ لئے حاضر تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں اسے پی لیا اور پیتے ہی شور کرنے لگا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ پیٹ میں اس قدر شدید درد اٹھ رہا ہے کہ اب میرے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ شیخ کو جب اس کی فوری علالت کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے معتمد آدمیوں کو مزاج پرسی کے لئے بھیجا۔ رائے سہرہ نے ان کے سامنے خون کی قے کی اور چیخنے لگا کہ میرے ساتھیوں کو میرے پاس بلاؤ۔ میرا وقت آخر ہے۔ میں انہیں کچھ وصیتیں کرنا چاہتا ہوں۔ عمائد سلطنت نے جب رائے سہرو کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کے ساتھی جوانوں کو شاہی محل میں آنے کی اجازت دے دی۔ جب تمام شمشیر بند نوجوان اس کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ اس کے سارے آدمی محل کے اندر داخل ہو گئے ہیں تو فوراً اٹھ بیٹھا اور اپنے معتمد نوکروں کو حکم دیا کہ شاہی محل پر پہرہ لگا دیں۔ باہر سے کوئی آدمی اندر نہ گھسنے پائے۔ اس کے بعد وہ اپنے بہادروں کی جمعیت کے ساتھ شیخ کے خلوت کدہ خاص میں جا گھسا اور سوتے میں انہیں گرفتار کر لیا۔ اعیان سلطنت کو بہ نوکِ شمشیر قابو میں کر لیا گیا اور رائے سہرو سلطان قطب الدین کے نام سے ملتان اور اوچ کا خود مختار بادشاہ بن گیا۔

---

[1] و بخدمت گار قرار دادہ کہ در زمانیکہ بخانہ بزغالہ را بکار رسانیدہ و خون مسفوح گرم را در پیالہ انداختہ بیارد۔

(تاریخ نظام الدین)۔

شیخ کو چند روز تک تو جیل میں رکھا گیا۔ پھر جب دیکھا کہ اب کوئی ان کا نام لیوا نہیں رہا اور حکومت کی باگ ڈور پوری طرح اس کے قبضہ میں آ چکی ہے تو ایک روز رات کو انہیں خاموشی سے قلعہ کے شمالی دروازے سے باہر نکلنے اور دہلی چلے جانے کی اجازت دے دی۔ شیخ نے اسی کو غنیمت جانا اور ایک تیز رو گھوڑے پر سوار ہو کر دہلی کی طرف نکل گئے۔[1]

یہ زمانہ علاؤالدین بن محمد شاہ کے انحطاط کا تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ اس کی حکومت حدود دہلی میں سمٹ کر رہ گئی تھی اور عام طور پر یہ فقرہ زبان زد تھا کہ

" بادشاہئ شاہ عالم از دہلی تا پالم "[2]

بہلول لودھی جو تخت دہلی پر قابض ہونے کے لئے کسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے بڑی آسانی سے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ علاؤالدین ان دنوں بدایون میں تھا۔ اسے جب دلی کا تخت چھن جانے کا پیغام ملا تو راضی بہ رضا ہو کر رہ گیا۔ بلکہ بہلول لودھی کے نام پیغام بھیجا کہ تم میرے باپ کے منہ بولے بیٹے ہو اور اس رشتہ سے میرے بھائی ہوئے۔ دہلی کی سلطنت تمہارے حوالے کرتا ہوں اور خود بدایوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ چنانچہ بہلول لودھی ۸۵۵ھ میں دہلی کا حکمران بنا۔ سلطان بہلول لودھی سے شیخ محمد یوسف کے مراسم دوستانہ تھے۔ اس لئے وہ سید سے

---

[1] تاریخ نظام الدین میں ہے کہ شیخ محمد یوسف کو قلعہ کے شمالی دروازے سے جو خانقاہ غوث العالمین زکریا ملتانی کے قریب واقع تھا نکل جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر اس دروازہ کو پختہ اینٹوں سے چن دیا گیا۔ ۱۰۰۲ھ تک یہ دروازہ اسی طرح مسدود تھا۔

[2] تاریخ خان جہان خاں لودھی جس کا ایک نام مخزن افغانی بھی ہے۔ یہ اس کی روایت ہے اس کتاب کا مصنف خواجہ نعمت اللہ ہے جو دربار جہانگیر کا وقائع نویس تھا اس کا باپ خواجہ حبیب اللہ ہراتی ۳۵ برس تک اکبر کے دربار میں ملازم رہا تھا۔

یہ کتاب اس نے خان جہان لودھی کے حکم سے مرتب کی اور سامانہ کے حاکم ہیبت خاں بن سلیم خاں نے اس کی تالیف میں اس کی بڑی مدد کی۔ خواجہ نعمت اللہ نے یہ کتاب برہانپور میں ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں مکمل کی ہے۔

اس کے پاس پہنچے اور امداد طلب کی مگر بہلول لودھی نیا نیا بادشاہ بنا تھا اور کئی زیادہ اہم فوجی مہمات اس کے پیش نظر تھیں اس لئے وہ شیخ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

قطب الدین لنگاہ ۸۷۴ھ میں فوت ہوا اس کی قبر اوچ میں اپنے مرشد اور داماد بندگی شاہ محمد غوث کی خانقاہ کے احاطہ میں بنائی گئی۔

قطب الدین لنگاہ کے بعد اس کا بیٹا سلطان حسین لنگاہ حکمران ہوا۔ بڑا قابل علم دوست اور نیک سیرت بادشاہ تھا۔ علماء و مشائخ کا قدر دان تھا۔ اس نے توسیع سلطنت کے لئے کافی سرگرمی سے جد و جہد کی اور شور کوٹ اور دھنکوٹ تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

اسی دوران شیخ محمد یوسف قریشیؒ کے پیہم اصرار پر سلطان بہلول لودھی نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو تسخیر ملتان کی مہم پر روانہ کیا۔ سلطان حسین لنگاہ اس زمانہ میں اندرونی معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ کوٹ کروڑ میں اس کے حقیقی بھائی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر رکھا تھا اور سلطان شہاب الدین کے نام سے بادشاہت کا اعلان کر چکا تھا۔ سلطان حسین لنگاہ فوراً کوٹ کروڑ پہنچا۔ بھائی کو گرفتار کیا، واپس ملتان آیا تو باربک شاہ کی فوجوں کو ملتان کے گرد گھیرا ڈالے دیکھا۔ فوراً مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑی معرکہ کی لڑائی ہوئی اور باربک شاہ کو بری طرح شکست دی۔ انہی دنوں ملک سہراب خاں دودائی بلوچ اپنے قبائل کے ہمراہ کیچ مکران سے سلطان حسین کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفاداری کا اظہار کیا۔ سلطان نے اپنے علاقہ کے لوگوں کی عمدہ طریق پر پذیرائی کی اور انہیں سیتپور

لہ لودھی اور لنگاہ خاندان میں تصادم نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ اوچ کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد غوث گیلانی کی ذات گرامی تھی۔ آپ کا لانگاہوں سے رشتہ مصاہرت قائم تھا اور دوسری جانب سلطان سکندر لودھی آپ کا مرید تھا۔

سے دھنکوٹ تک کا علاقہ بطور جاگیر مرحمت کیا۔

۱۴۸۸ء میں سلطان بہلول لودھی وفات پا گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا لڑکا نظام شاہ سلطان سکندر لودھی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد کئی علاقوں میں شورش برپا ہوئی۔ سلطان حسین لنگاہ نے سلطان سکندر لودھی کو دشمن کے نرغہ میں گھرا ہوا دیکھا تو شکستہ تعلقات کی بحالی کے لئے موقعہ غنیمت جان کر اس کے بادشاہ بننے پر اس کو مبارک باد کا ایک خط لکھا اور ساتھ ہی بہت سے تحائف بھی اس کی نذر کروائے۔ سلطان سکندر لودھی نے سلطان حسین لنگاہ کے اس خط کا پُر تپاک شکریہ ادا کیا اور دونوں کے درمیان ایک معاہدہ صلح طے پا گیا جس کا نفسِ مضمون یہ تھا کہ

"دونوں بادشاہ ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے اور دونوں بادشاہوں کی فوجیں اپنی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کریں گی اور ایک دوسرے کی امداد و اعانت سے دریغ نہیں ہوگا۔"

دہلی کی طرف سے مطمئن ہو کر سلطان حسین لنگاہ نے داخلی نظم و نسق کی طرف توجہ مبذول کی۔ والئ گجرات سلطان مظفر خاں کی خوش ذوقی اور فنِ تعمیر سے اس کی دلچسپی کی عام شہرت تھی چنانچہ سلطان حسین لنگاہ نے قاضی محمد اوچوی کو گجرات بھیجا تاکہ وہاں کی عمارات کے نقشے تیار کروا کے لائیں۔ انہوں نے گجرات پہنچ کر احمد شاہ کی خدمت میں اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ احمد شاہ نے بڑی خوشی سے اس کی اجازت دی۔ ان دنوں احمد آباد نیا نیا بسایا گیا تھا۔ قاضی محمد نے ان تمام نو تعمیر شدہ محلات کے خاکے تیار کئے اور واپس ملتان پہنچ کر سلطان حسین لنگاہ کی خدمت میں پیش کئے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ

"اگر محصول تمام مملکت ملتان را بہ تعمیر یک قصر خرچ شود معلوم نیست کہ بہ اتمام رسد۔"

یعنی اگر سلطنت ملتان کا تمام محصول بھی خرچ کر ڈالیں تو بھی احمد آباد کے محلات جیسا ایک محل تعمیر نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ یہ سن کر ملول ہوا۔ وزیر اعظم عماد الملک کو بادشاہ کی افسردگی کی اطلاع ملی تو حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ اگرچہ گجرات، دکن، مالوہ اور بنگال بڑے زرخیز ملک ہیں اور ان کی وسیع آمدنی اور اسباب عیش و آرام کی فراوانی مسلّم ہے تاہم ملتان کی سرزمین بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے اور یہاں کے اہل فضل و کمال کی ہر جگہ پر عزت افزائی اور قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ وہ کون سا خطہ ہے جہاں حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانی کا نام احترام سے نہیں لیا جاتا اور وہ کون سا علاقہ ہے جہاں اوچ کے خانوادۂ بخاریہ کو عزت و تکریم کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا[1]۔ سلطان حسین لنگاہ اپنے وزیر کی یہ بات سن کر مطمئن ہو گیا

سلطان حسین لنگاہ کے عہد حکومت میں سندھ کے مشہور قبیلہ سمہ کے کچھ افراد ملتان پہنچے۔ یہ لوگ زیریں سندھ کے علاقہ پر حکمران قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔ ان کی شورش انگیزیوں کے سبب سے سلطان محمد تغلق اور اس کے بعد سلطان فیروز تغلق نے ٹھٹھہ پر جو ان کا دارالحکومت تھا، کئی بار حملہ کیا۔ جام بابنیہ اور جام تماچی نے اوچ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے توسط سے امان طلب کی، اور یوں سمہ قوم کی عملداری اوچ اور اس کے اطراف و نواحی پر قائم ہوئی۔

جام نظام الدین سمہ کے عہد حکومت میں اس قبیلہ کے کچھ سردار اپنے بادشاہ سے بعض سیاسی اختلافات کی بنا پر سلطان حسین لنگاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے زیر سایہ رہنے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے جام بایزید اور جام ابراہیم کو بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا اور ان کی وفادارانہ روش

---

[1] و ہم چنیں از طبقۂ بخاریہ چند کس در اوچہ و ملتان موجود اند (تاریخ نظام الدین)

سے متاثر ہو کر جام ابراہیم کو اوچ کا گورنر مقرر کر دیا۔

۹۰۸ھ میں سلطان حسین شاہ فوت ہو گیا اس نے اپنے مرحوم بیٹے فیروز شاہ کے لڑکے محمود شاہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ چنانچہ محمود شاہ تخت پر بیٹھا۔ یہ نہایت کمزور بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کے عہد میں اوچ کا علاقہ ملتان سے علیحدہ ہو گیا۔ محمود شاہ کی حکومت ملتان تک محدود ہو کر رہ گئی اور اوچ پر سمہ قوم کے سردار قابض ہو گئے۔ سمہ قوم کا پہلا حکمران جو اوچ پر متصرف ہوا وہ جام سنجر تھا۔

اوچ کے حکمران

سمّہ قوم کی حکمرانی

۹۰۸ھ سے ۹۲۸ھ تک یعنی تقریباً ۲۰ سال کا عرصہ اوچ پر سمہ قوم کی حکمرانی تھا۔ پہلا بادشاہ جام سنجر تھا۔ جام سنجر کے بعد اس کا بیٹا جام صلاح الدین سندھا حاکم ہوا۔ جام صلاح الدینؒ کے بعد جام فیروز سندھ کا حکمران بنا۔

لہ سومرو قبیلہ جس کا ذکر قرامطہ کے بارے میں کیا جا چکا ہے۔ ۴۲۴ھ سے ۷۵۲ھ تک سندھ کے زیریں حصہ پر قابض رہا۔ اس کے بعد سندھ کے راجپوتوں کا ایک دوسرا قبیلہ سمہ برسراقتدار آگیا۔ یہ لوگ آٹھویں صدی کے وسط سے دسویں صدی ہجری کے ربع اول تک برسراقتدار رہے۔ ان کا دارالحکومت ٹھٹھہ تھا۔ اور ان کے حکمرانوں کا لقب جام تھا۔ ان کی مدت حکومت کے بارے میں مورخین میں اختلافات ہیں۔ بیگ لارنامہ میں ۱۹۲ برس کی میعاد لکھی ہے۔ تاریخ طاہری نے ۱۸۳ برس اور تحفۃ الکرام میں ۱۶۵ سال درج ہے۔ یہ لوگ بھی زیریں سندھ کے علاقوں میں آباد تھے۔ ان کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ کرشن کے بیٹے سمبھ کی اولاد ہیں۔ کرشن کا ایک نام سیام یا شیام بھی ہے۔ ان کا آبائی وطن دریائے سندھ کے کنارے ایک شہر سامر نگر تھا جو غالباً موجودہ سیہوان کا پرانا نام ہے۔ اوچ پر سمہ قوم کی حکمرانی اس کے عہد اقتدار کے آخری ۲۰ سال میں ہوئی۔ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے وقت دیبل کا گورنر سمبا تھا جو اسی سمہ قبیلہ سے تعلق

ترخان حکمران

یہ خاندان قندھار پر حکمران تھا۔ جب مغلوں نے بابر کی سرکردگی میں قندھار پر حملہ کیا تو والیٔ قندھار شاہ بیگ ارغون[1] بابر سے شکست کھا کر سندھ بھاگ آیا اور اپنی حکمت عملی سے سندھ کو اس نے زیر کر لیا۔ اس نے سمہ قوم کے افراد کو حکومت سے برطرف کر کے اپنی بادشاہت کا سکہ چلایا۔ اس نے بکھر تک کا علاقہ فتح کر لیا اور ٹھٹھہ کی بجائے بکھر کو اپنا دارالحکومت مقرر کیا۔

شاہ بیگ ارغون دو سال کے بعد انتقال کر گیا اور ۹۳۰ھ میں اس کا بیٹا سلطان حسین ارغون اس کی جگہ حکمران ہوا۔ ۹۳۲ھ میں سلطان حسین ارغون نے اوچ پر حملہ کیا اور اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بستی کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد تمام ساز و سامان لوٹ کر کشتیوں کے ذریعے بکھر لے گیا۔

اس زمانے میں اوچ کے آستانۂ بخاریہ کے سجادہ نشین شیخ محمد کیمیا نظر تھے۔ وہ اوچ کی اس تباہی اور ویرانی سے دل برداشتہ ہو کر اوچ سے ترک وطن فرما گئے۔

اوچ پر قبضہ جمانے کے بعد سلطان حسین ارغون نے ملتان کا رُخ کیا۔ ملتان ابھی تک سلطان محمود لنگاہ کے زیر اقتدار تھا۔ حسین ارغون نے لنگاہ خاندان کی

رکھتا تھا۔ سندھ پر سے اس قوم کی بالادستی کو سلطان حسین ارغون نے ۹۳۰ھ میں ختم کر دیا۔

[1] ارغون خاں ترخان ہلاکو کا پوتا تھا۔ اس کی اولاد ارغون اور ترخان کے القاب سے مشہور ہوئی۔ ترخان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ ایک توجیہہ یہ ہے کہ ترخان دراصل "تر اور خون" دو لفظوں سے مرکب ہے جس کا مطلب ہے دشمنوں کے خون سے تر رہنے والا۔ ایک روایت یہ ہے کہ ترخان ایک اعزازی خطاب ہے اور یہ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جنہوں نے اہم فوجی خدمات سرانجام دی ہوں۔ تیمور لنگ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کو ترخان کے اعزاز سے نوازا تھا۔

حکومت کا ملتان سے بھی مکمل خاتمہ کر دیا اور اپنے ایک معتمد سردار خواجہ شمس الدین کو ملک ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا اور خود ٹھٹھہ واپس چلا گیا۔ خواجہ شمس الدین کو اس کے ایک وزیر لنگر خاں نے گورنری کے عہدہ سے خفیہ سازش کے ذریعے برطرف کر دیا اور ملتان اور اوچ کا خود مختار حکمران بن بیٹھا۔

اس زمانہ میں دہلی کی حکومت پر مغل قابض ہو چکے تھے اور بابر داد حکمرانی دے رہا تھا۔ اسے ملتان اور اوچ کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہ مل سکی اور وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد انتقال کر گیا۔ [۱]

۹۳۶ھ میں جب بابر کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس نے پنجاب کا علاقہ اپنے بھائی مرزا کامران کے سپرد کیا۔ مرزا کامران کی حدود سلطنت میں پنجاب اور زیریں سندھ کے علاوہ کابل اور قندھار تک کا علاقہ بھی شامل تھا۔

مرزا کامران نے لاہور پہنچ کر ملتان اور اوچ کے والی وزیر لنگر خاں کو اپنے حضور طلب کیا اور اسے ملتان اور اوچ کی بجائے ماہل کا علاقہ بطور جاگیر مرحمت کیا اور ملتان و اوچ پر اپنے معتمد ملازموں کو صوبہ دار مقرر کیا۔

دیگر حکمران

مرزا کامران جب کابل چلا گیا تو اوچ پر مرزا سلطان مرزا الغ خاں کا تقرر ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اوچ کا صوبہ دار ہیبت خاں کو بنایا گیا۔ ہیبت خاں

---

[۱] بابر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی ہوا۔ وہ تیمور لنگ کے خاندان میں سے اس کی چوتھی پشت میں سے تھا۔ اس نے ۱۵۲۶ء میں سلطان ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ہندوستان کی حکومت پر قبضہ کیا۔ بڑا اولوالعزم اور طاقت ور بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے حسن تدبر سے بہت مختصر عرصہ میں ہندوستان کے وسیع علاقہ پر اپنا تسلط جما لیا۔ بابر نہایت فیاض اور بڑا رحم دل فرمانروا تھا۔

اعظم ہمایوں کے لقب سے مشہور تھا۔ اسی اثنا میں شیر شاہ سوری نے ہمایوں کے خلاف کامیاب بغاوت کی اور ہمایوں کو ملک چھوڑ کر ایران میں پناہ لینی پڑی۔ ہمایوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر حسین ارغون نے دوبارہ اوچ پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر لیا۔ مرزا کامران کی جب اپنے بھائی ہمایوں سے ان بن ہوئی اور وہ بھاگ کر حسین ارغون کے پاس ٹھٹھہ پہنچا تو حسین ارغون نے نہ صرف مرزا کامران کی دلجوئی کی بلکہ اپنی لڑکی بھی اس کے عقد میں دے دی۔

پندرہ برس کی جلاوطنی اور بادیہ پیمائی کے بعد ہمایوں دوبارہ اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اس نے پنجاب کا گورنر ابوالمعالی کو نامزد کیا اور اوچ کا خطہ بھی اسی کے زیر تصرف رہا۔[1]

اکبر کے عہد سلطنت میں اوچ اور ملتان کا گورنر بہادر خاں تھا۔ پھر جب بیرم خاں خان خاناں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اوچ پر بھی قابض ہو گیا۔ اکبر نے شمس الدین محمد اتگہ کو بیرم خاں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ بیرم خاں شکست کھا کر گجرات بھاگ گیا اور وہیں راستے میں حج کو جاتے ہوئے انتقال کر گیا۔

اوچ اور ملتان کے انتظام و انصرام کی نگرانی شمس الدین اتگہ کی سپردداری میں دے دی گئی۔ ۹۷۰ھ میں شمس الدین اتگہ[2] انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ملتان اور اوچ کا گورنر محمد قلی[3] خاں کو بنایا گیا۔ ۱۰۰۲ھ میں قندھار کے حکمران مرزا

---

[1] دسویں صدی ہجری کے ربع آخر میں اقتدار پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد ہمایوں اوچ آیا۔

[2] شمس الدین اتگہ کا مقبرہ قطب صاحب (دہلی) میں ہے۔

[3] اوچ کی آبادی تین علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم ہے۔ اوچ بخاری جو حضرت سید جلال سرخ بخاری سے منسوب ہے۔ اوچ گیلانی جو حضرت سید محمد غوث گیلانی کی نسبت سے مشہور ہوئی اور اوچ موغلہ جسے اوچ جمالی بھی کہتے

رستم بن بہرام شاہ اسماعیل علوی نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی۔ اس پر اوچ کا علاقہ اسے بہ طور جاگیر دے دیا گیا۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں اوچ اور ملتان کے گورنر بالترتیب شیخ خاں نواب جان محمد خان بن موسیٰ پاک شہید اور سید موسیٰ بن نواب جان محمد خاں ہوئے۔

اس دور میں اوچ ملتان کے ماتحت تھا اور ملتان کا گورنر ہی اس کے نظم و نسق کا انچارج تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اوچ کا حاکم تربیت خاں تھا۔ ۱۰۶۹ھ میں تربیت خاں کو ایران کا سفیر مقرر کیا گیا اور اس کی جگہ ملتان کے صوبہ دار نجابت خاں کو اوچ کا حاکم مقرر کیا گیا۔

۱۰۶۸ھ میں اوچ اور ملتان کے علاقے لاہور کے گورنر عزت خاں کی تحویل میں دے دیئے گئے۔ اس سال بادشاہ کے بھائی دارا شکوہ نے اوچ میں قدم رنجہ فرمایا اور مزارات پر حاضری دی۔ ۱۱۱۹ھ میں اورنگ زیب محمد معز الدین ملتان اور اوچ کا گورنر مقرر ہوا۔ یہی شاہزادہ اپنے باپ۔ شاہ عالم اول کے بعد جہاں دار شاہ کے لقب سے سلطنت مغلیہ کا وارث تخت ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت مغلیہ زوال و انحطاط کا شکار ہو گئی اور عالمگیر کے جانشین اس عظیم سلطنت کی حدود کی حفاظت میں ناکام ہو کر رہ گئے۔ اس سے طوائف الملوکی اور انتشار کے اثرات پھیلنے لگے اور علاقائی سرداروں کو اپنی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کرنے کا موقع مل گیا۔

معز الدین جہاں دار شاہ سے لے کر رفیع الدولہ تک چار حکمران صرف سات سال کے عرصہ میں تخت نشینی اور تخت سے محرومی کے تمام مراحل طے

ہیں۔ اوچ موغلہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ چونکہ اس بستی میں مغل سردار رہائش پذیر تھے اور مغلیہ دور کے حکام یہاں سکونت اختیار کرتے تھے اس لئے اسے اوچ موغلہ کہا جانے لگا۔

کر گئے۔ اس کے بعد ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ تخت نشین ہوا جو کم و بیش انتیس برس تک داد حکومت دیتا رہا۔ مگر بیرونی حملہ آوروں نے اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ محمد شاہ کے عہد حکومت میں اوچ اور ملتان کی حکومت نواب حیات اللہ خاں کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ درانی نے سندھ پر حملہ کیا تو اوچ اور مضافات کا علاقہ سردار طہماسپ خاں کی عملداری میں چلا گیا۔ محمد شاہ کے بعد اس کا لڑکا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ احمد شاہ کے زمانہ میں اوچ سلاطین مغلیہ کے زیر تصرف تھا اور اس کا ثبوت وہ توقیعات و فرامین ہیں جو آج بھی مخادیم بخاری کے ہاں دستیاب ہیں اور جن پر احمد شاہ کی مہر ثبت ہے اور اس پر ۱۱۶۱ھ کا سن درج ہے۔ احمد شاہ کے زمانہ میں ملتان اور اوچ کا حاکم ایک ہندو دیوان کوڑا مل تھا۔

نادر شاہ درانی ہندوستان سے واپسی پر تمام مفتوحہ علاقے محمد شاہ کے سپرد کر گیا تھا۔ انہی میں سندھ، ملتان اور اوچ کا خطہ بھی شامل تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادر شاہ کے مرنے کے بعد اس کے جانشین احمد شاہ درانی نے سندھ پر اپنا اثر و اقتدار دوبارہ قائم کر لیا اور اوچ اور اس کے مضافات ایک مقامی امیر نواب صادق محمد خاں عباسی اول کی عملداری میں دے دیئے گئے[1]

مخادیم بخاریہ کی لائبریری میں بعض ایسے فرامین موجود ہیں جن پر احمد شاہ درانی کی مہر اور ۱۱۸۵ھ ثبت ہے۔ گویا اس زمانہ میں اوچ براہِ راست سلطنت ایران سے متعلق تھا۔

محمد شاہ (رنگیلا) کے عہد حکومت میں عباسی خاندان کے امیر صادق محمد خاں عباسی اول نے ملتان کے گورنر نواب حیات اللہ سے

---

[1] ان فرامین کی رو سے جو احمد شاہ درانی کی جانب سے نوادرہ بخاریہ کے سجادہ نشین مخدوم ناصر الدین کے نام تحریر ہیں۔

چودھری کا علاقہ بطور جاگیر حاصل کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی عقلمندی اور حکمت عملی سے ریاست بہاول پور کے وسیع علاقہ پر قابض ہو گیا اور شاہان دہلی اور شاہان ایران سے خوشگوار تعلقات کی بناء پر اپنی چھوٹی سی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اوچ عباسی حکمرانوں کے عہد میں

بغداد میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں خاندانؔ عباسیہ کا اقتدار ختم ہوا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ خاندان مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مصر میں اس خاندان کا پہلا حکمران ابوالقاسم احمد ہوا جو ۶۵۹ھ سے ۶۶۰ تک حکمرانؔ

ؔ خاندان بنو عباسیہ کے آخری فرمانروا مستعصم باللہ کے عہد حکومت کے پندرھویں سال تاتاری حکمران چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو نے سلطنت اسلامیہ کے اندرونی خلفشار کو دیکھ کر بغداد پر حملہ کیا اور سلطنت عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ تاریخ اسلامی کا المناک حادثہ ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں رونما ہوا۔ سعدی نے اس موقعہ پر پُر از درد مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ تھا

آسماں را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیرالمومنین

ہلاکو نے بغداد پر حملہ میں نہ صرف مسلمانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا بلکہ خلیفہ اور اس کا پورا خاندان بھی ہلاکو کی خون آشام شمشیر کی بھینٹ چڑھ گیا اور اس طرح خلافت عباسیہ کا تسلط بغداد سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا

ؔ مستعصم باللہ کا چچا ابوالقاسم احمد بن الظاہر بامراللہ ہلاکو کے ہنگامہ دار و گیر سے بچ کر مصر پہنچا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہندوستان پر خاندان تغلق کا اقتدار قائم ہوا جن کے مراسم مصر کے عباسی فرمانرواؤں سے بہت اچھے تھے چنانچہ محمد تغلق کے دور حکومت میں امیر سلطان احمد ثانی وارد سندھ ہوئے

رہا۔ اس کی پانچویں پشت میں امیر سلطان احمد ثانی تھا جو مصر سے افقار کی مختصر سی جمیعت کے ساتھ سندھ میں پہنچا۔ سندھ میں امیر کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ سندھ میں اس کی آمد ۷۰۰ھ ہجری میں ہوئی۔ اس زمانہ میں سندھ پر سمہ قوم حکمران تھی۔ امیر کی شادی اس خاندان کی کسی شہزادی سے ہوئی اور اس طرح سندھ میں امیر کے قدم جم گئے اور اس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس کی اولاد میں امیر چنی[1] خاں نے اپنی عقلمندی، فراست اور ہردلعزیزی سے سلطنت مغلیہ کے عہد میں پنجہزاری کا منصب اور وسیع جاگیر حاصل کی اوباڑہ سے لدھکڑی بندر تک کا سارا علاقہ اس کی جاگیر میں شامل تھا اور مالیہ کی وصولی کا حق بھی اسی کو دے دیا گیا تھا۔

امیر چنی خاں کے دو لڑکے تھے۔ داؤد خاں اور محمد مہندی خاں۔ داؤد خاں کی اولاد داؤد پوترہ کہلائی۔ مہندی خاں کا ایک لڑکا کلہوڑہ کے لقب سے مشہور ہوا اور اس کی اولاد کلہوڑہ کے نام سے متعارف ہوئی۔ داؤد پوترہ اور کلہوڑہ خاندان میں باہمی رقابت اور شکر رنجی پیدا ہونے کے بعد امیر صادق محمد خاں نے سندھ کی وہ تمام جاگیر جو مغلیہ عہد سلطنت میں انہیں ملی تھی۔ چھوڑ دی اور اوچ کے قریب ۱۱۴۰ھ میں چودھری کا علاقہ ملتان کے گورنر

یہ گویا بہاولپور کے عباسی حکمرانوں کے مورث اعلیٰ تھے۔

[1] امیر چنی خاں امیر سلطان احمد ثانی کی پشت میں چھٹے نمبر پر تھا اس کے والد امیر بہاء اللہ خاں بن فتح اللہ بن سکندر بن عبدالقاہر بن ابوالنصر بن سلطان احمد تھے۔ امیر بہاء اللہ کا نام بگڑ کر بعد میں بہاول خاں ہو گیا۔ بہاول خاں کا لقب اس خاندان میں نسلاً بعد نسل بطور تبرک استعمال ہوتا رہا۔ امیر چنی خاں اکبر اعظم کا ہمعصر تھا۔ اکبر کے بیٹے شہزادہ محمد مراد نے چنی خاں کو سندھ میں سیوستان اور مضافات کا علاقہ بطور جاگیر مرحمت کیا۔ اس کی اولاد بعد میں دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کلہوڑہ کہلائی اور دوسری داؤد پوترہ بہاول پور کے عباسی حکمران موخر الذکر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

نواب حیات اللہ کی طرف سے بطور جاگیر انہیں مرحمت ہوا۔ اس زمانہ میں اوچ صوبہ ملتان کا ایک حصہ تھا اور کابل کے حکمران کے زیر تصرف تھا۔

نواب صادق محمد خاں اول کو مسند حکومت پر متمکن کرنے میں اوچ کے خانوادۂ گیلانیہ کے سجادہ نشین مخدوم شیخ عبدالقادر خامس کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ انہی کی سفارش پر ملتان کے گورنر نواب حیات اللہ خاں نے چودھری کا علاقہ انہیں بطور جاگیر مرحمت کیا تھا۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جب نواب صاحب کے حریف نور محمد کلہوڑہ نے پے در پے حملوں کے ذریعے انہیں شکار پور سے نقل مکانی پر مجبور کر دیا تو آپ خانپور کے قلعہ میں فروکش ہوئے مگر دشمن نے یہاں بھی ان کو تنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ آپ کو خانپور بھی چھوڑنا پڑا۔ اس پریشان حالی کے عالم میں اوچ کے گیلانی سجادہ نشین کی دعوت پر آپ اوچ پہنچے اور چونکہ اوچ کی روحانی عظمت ہر بادشاہ کے دل میں تھی اس لئے سجادہ نشین کی سفارش کام آئی اور انہیں ایک وسیع جاگیر دے دی گئی۔ نواب صاحب نے اس علاقہ میں ایک شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اللہ آباد رکھا گیا۔

۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں نواب صادق محمد خاں عباسی اوّل ایک معرکہ میں زخمی ہو کر مارے گئے اور ان کی جگہ ان کے لڑکے امیر محمد بہاول خاں اول اس علاقہ کے جاگیر دار بنے۔ ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء میں امیر بہاول خاں اول نے دریائے ستلج سے تین میل کے فاصلے پر ایک شہر بسایا، جس کا نام اپنے نام پر بہاول پور رکھا۔ یہی شہر بعد میں اس ریاست کا دارالحکومت بنا۔ ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۸ء اوچ کے خانوادہ بخاریہ کے مخدوم شیخ راجو نے جو ولیعہد پوترہ خاندان کے خلاف تھے۔ نواب صاحب کے خلاف شورش برپا کی۔ سیت پور کے حاکم نواب جاں نثار خاں نے بھی مخدوم شیخ راجو کے ایما پر علم بغاوت بلند کیا۔ ان دنوں ملتان کا گورنر دیوان کوڑا مل تھا۔ اس نے

نواب صاحب کی حمایت کی جس سے وہ اس معرکہ میں کامیاب رہے۔

۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں نواب بہاول خاں انتقال کر گئے اور ان کی جگہ ان کا چھوٹا بھائی محمد مبارک خاں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں احمد شاہ درانی شاہ ایران کے حکم سے جہان خاں نے امیر مبارک خاں پر حملہ کیا۔ ان دنوں ملتان کا گورنر جاں نثار خاں تھا۔ وہ اگرچہ دلی طور پر امیر مبارک خاں کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا مگر بادشاہ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی اس لئے اپنی پوری جمعیت کے ساتھ امیر مبارک خاں کے علاقہ پر حملہ کیا اور اوچ تک پہنچ گیا۔ امیر مبارک خاں نے مقابلہ کی تاب نہ لاکر جہان خاں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔

امیر محمد مبارک خاں کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا جعفر خاں بہاول خاں ثانی کے لقب سے مسند نشین ہوا۔ یہ دور انتہائی شورش اور آشوب کا دور تھا۔ ایک طرف مرہٹوں کی فتنہ انگیزیوں نے ملکی امن و امان کو تباہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف سکھوں کی شورش برپا تھی۔ اس افراتفری اور ہنگامہ کے عالم میں تیمور شاہ والیٔ کابل نے سندھ پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور بہاولپور پر بھی فوج کشی کی۔ تیمور شاہ نے ریاست بہاولپور کو اپنی ترکتازیوں سے کافی نقصان پہنچایا اور جاتے وقت بہاول خاں ثانی والی ریاست کے جوان سال لڑکے مبارک خاں کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ واقعہ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء کا ہے۔

اوچ کے بخاری خاندان کے قدیم نوشتوں میں تیمور شاہ والیٔ کابل کے دستخط شدہ فرامین بھی موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اوچ پر بھی تیمور شاہ نے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

امیر بہاول خاں ثانی کے عہد میں اوچ کے گیلانی سجادہ نشین مخدوم حامد محمد گنج بخش ثالث نے جن کا اصل نام سید فضل علی تھا اور جو غلام شاہ

کلہوڑہ والیٔ سندھ کے ہم زلف تھے۔ نواب بہاول خاں عباسی کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اوچ میں ایک قلعہ تعمیر کروا کے عباسی حکمران سے مقابلہ کی ٹھانی۔ اس قلعہ کے آثار میں ایک دروازہ آج بھی موجود ہے جو ہاتھی دروازہ کہلاتا ہے۔

سیّد فضل علی حامد گنج بخش ثالث کے انتقال کے بعد سیّد حسن بخش حامد گنج بخش رابع نے اپنی سجادگی کے دور میں والیٔ ریاست بہاول خاں عباسی سے باقاعدہ ٹکر لی۔ فریقین میں اوچ کے مقام پر زبردست معرکہ بپا ہوا جس میں مخدوم حامد گنج بخش رابع شکست کھا گئے اور اوچ خاندان عباسی کی عملداری میں شامل ہو گیا۔ بہاول خاں ثانی نے اوچ کے قلعہ کی فصیل کو مسمار کرا دیا۔ گیلانی سجادہ نشین کو اوچ چھوڑنا پڑا اور وہ سندھ کے مقام گھوٹکی میں جا کر آباد ہوئے جہاں ۱۲۲۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۰ء میں اوچ عباسی اقتدار کے تحت آ گیا۔

۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں نواب بہاول خاں کو دہلی کے مغلیہ تاجدار شاہ عالم ثانی کی جانب سے نواب اور "رکن الدولہ نصرت جنگ مخلص الدولہ حافظ الملک" کے خطابات سے نوازا گیا۔ یہ خطابات اس کے بعد بہاول پور کے ہر عباسی فرمانروا کے نام کے ساتھ استعمال کئے جاتے رہے۔ دورِ انگلش میں بھی ان خطابات کو برقرار رکھا گیا۔

نواب بہاول خاں ثانی نے یکم رجب ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں انتقال کیا اور ان کے بعد ان کا دوسرا لڑکا عبداللہ خاں صادق محمّد خاں عباسی ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

صادق محمد خاں ثانی کے عہد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے (۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء) میں ریاست بہاول پور کی ان حدود پر حملہ کیا جو دریائے ستلج کے پار تھیں۔

۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۵ء میں صادق محمد خاں ثانی انتقال کر گئے اور ان کی جگہ ان کا بڑا لڑکا رحیم یار خاں بہاول خاں ثالث کے لقب سے مسند نشین حکومت ہوا۔ اس نواب کے عہد میں ریاست بہاولپور برطانوی انتداب کے زیر اثر آ گئی اور ایک معاہدہ کے ذریعہ نواب بہاولپور سرکار انگلشیہ کے مطیع فرمان ہو گئے۔ بہاول خاں ثالث نے اپنے عہد اقتدار میں ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں اوچ کی مشہور خانقاہ حضرت سید جلال سرخ بخاری کے مزار پر ایک پختہ عمارت تعمیر کروائی اور مقبرہ کے احاطہ میں ایک کنواں اور تالاب بھی کھدوایا۔ برطانوی تسلط کے ابتدائی عہد میں ملتان پر دیوان ساون مل کا لڑکا دیوان مولراج گورنر تھا۔ اس نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور ملتان کے علاوہ اطراف کے کئی علاقوں پر متصرف ہو گیا اور اوچ کا علاقہ بھی اس کے قبضہ میں آ گیا۔ بالآخر نواب صاحب بہاولپور اور برطانوی افواج کی مشترکہ مساعی سے دیوان مولراج کو شکست ہوئی اور ۲۰ جنوری ۱۸۴۹ء کو وہ گرفتار ہو گیا۔

نواب صاحب نے اس موقع پر برطانوی حکومت کی جو خدمات سر انجام دیں اس سے خوش ہو کر سرکار انگلشیہ نے نواب صاحب کے لئے ایک لاکھ روپے سالانہ الاؤنس تا حین حیات مقرر کیا اور آٹھ لاکھ روپیہ ریاستی افواج میں تقسیم کرنے کے لئے پیش کیا گیا۔

۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء میں نواب بہاول خاں ثالث کا انتقال ہوا اور اس کے بعد تیسرا لڑکا سعادت یار خاں صادق محمد خاں ثالث کے لقب سے مسند نشین ہوا لیکن صرف ۴ ماہ کے بعد اسے تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور اس کا بڑا بھائی حاجی خاں تخت نشین ہوا۔ اس کا سرکاری لقب فتح خاں تھا۔ نواب فتح خاں ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء میں انتقال کر گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا رحیم یار خاں تخت پر بیٹھا اور تقریباً آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس

کا لڑکا صادق محمد خاں رابع کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نواب نے ۱۳۰۰ھ میں حضرت جلال سرخ بخاری کے مقبرہ کی دوبارہ مرمت کروائی اور اس کی خوب صورتی کا مزید اہتمام کیا۔

یہ تھا اوچ کے مختلف سیاسی ادوار کا اجمالی خاکہ جو تین ہزار سال قبل از مسیح سے شروع ہو کر بیسویں صدی عیسوی تک یعنی کم و بیش پانچ ہزار برس کے عرصہ پر محیط ہے۔

اوچ جو کسی دور میں وادی وسلا کا پایہ تخت رہا تھا۔ جہاں راجہ کھند اور اس کے بیٹے آیند نے کوس لمن الملکی بجایا تھا۔ جس کی سرسبزی و شادابی کی تمنا سکندر اعظم کے دل میں انگڑائیاں لیتی رہی جو اشوک اعظم اور راجہ کنشکا کی خصوصی توجہات کا مرکز رہا جسے رائے خاندان کے زیر اقتدار قلعوں میں ایک اہم فوجی مرکز کی حیثیت حاصل تھی جسے چچ برہمن نے بڑی حکمت عملی سے مسخر کیا۔ جہاں محمد بن قاسم کے قدم پہنچے اور محمود غزنوی نے جس کی تسخیر کے لئے جتن کئے اور شہاب الدین غوری نے جس کی فوجی اور سیاسی اہمیت کے اعتراف کے طور پر اپنے معتمد سالار کو وہاں کا وائسرائے مقرر کیا اور جسے ناصرالدین قباچہ کا پایہ تخت بننے کا اعزاز نصیب ہوا۔ اور جس خطہ کو ہندوستان کے کم و بیش ہر قابل ذکر بادشاہ نے اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا جو علم و معرفت اور تصوف و روحانیت کا ایک عظیم مرکز رہا اور جس کی تاریخ ارض مصر و بابل سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ آج وہاں عہد رفتہ کے ویران کھنڈروں، تباہ حال مقبروں اور بوسیدہ دیواروں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں ہے۔

باب سوم

اوچ ــ مرکزِ علم و عرفان

تقریباً ہر اسلامی دور میں اوچ کی علمی اہمیت مسلّم رہی ہے۔ سومرہ عہد حکومت میں جو چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے تقریباً ڈھائی سو برس کا عرصہ ہے۔ یہاں ایک مدرسہ کا سراغ ملتا ہے جس کا نام مدرسہ فیروزیہ تھا۔ یہ درسگاہ قباچہ کے عہد میں بھی موجود تھی اور اس میں مشہور مورخ علامہ منہاج سراج جیسا جلیل القدر عالم صدر نشین مسند تدریس تھا۔

اس درسگاہ کا نام "فیروزیہ" اس امر کا غماز ہے کہ اس کی بنیاد سومرہ عہد اقتدار میں رکھی گئی کیونکہ سومرہ حکمران اپنے لئے "ملک فیروز" کا لقب استعمال کرتے تھے۔ اسی نسبت سے یہاں کے مدرسہ کو "مدرسہ فیروزیہ" کا نام دیا گیا۔

ناصر الدین قباچہ کے عہد میں اس درسگاہ کو بڑا فروغ ہوا۔ اس دور کی قابل ذکر شخصیتوں میں ہمیں جہاں علامہ منہاج سراج جیسے نامور مورخ اور قاضی وقت کا نام ملتا ہے وہاں، قطب الدین کاشانی، علی بن حامد بن ابوبکر کوفی، نور الدین محمد بن عوفی الحنفی البخاری اور شیخ محمود فاروقی جیسے اصحاب علم و فضل اور ارباب زہد و تقویٰ کا سراغ بھی ملتا ہے۔

ان نادرۂ روزگار شخصیتوں ہی کے دم قدم سے اوچ کی سرزمین میں

مرجعیت کا وہ رنگ اور وہ روحانی کشش پیدا ہوئی جس نے اسے بہت سے اہلِ دل حضرات کا مہبط و مسکن بنا دیا۔ قباچہ کے عہد سے فوراً بعد کے دور میں یہاں دو خانقاہیں یا دوسرے لفظوں میں دو درسگاہیں زیادہ مشہور ہوئیں ان میں ایک گازرونیوں کی تھی اور دوسری شیخ جمال خنداں رو کی۔

خانقاہ گازرونیہ منسوب تھی حضرت سید صفی الدین گازرونی کی طرف جو عام روایت کے مطابق چوتھی صدی ہجری میں اوچ تشریف لائے۔

خانقاہ جمالیہ بھی مدت مدید تک اشاعت علم کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتی رہی اور شیخ جمال خنداں رو کے بعد ان کے خلف صدق شیخ رضی الدین گنج علم اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اسی کے تھوڑے عہد میں یہاں ایک مدرسہ بہائیہ قائم ہوا جس کے مہتمم قاضی بہاؤالدین اوچی تھے۔

حضرت سید جلال سرخ بخاری کی آمد پر یہاں خانقاہ جلالیہ کی بنیاد پڑی جس میں خود حضرت مخدوم اور ان کے بعد ان کے فرزند حضرت سید احمد کبیر زیب مسند رہے۔

اس درس گاہ کو غیر معمولی شہرت حضرت سید احمد کبیر کے فرزند اور حضرت مخدوم جلال سرخ بخاری کے پوتے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس عہد میں ہند اور بیرونِ ہند سے یہاں اس قدر طلباً جمع ہوئے کہ جس کی مثال دہلی کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔ ان طلبہ میں بعض حضرات اپنے زمانہ کے ممتاز اہل علم و فضل اور نامور اصحاب شریعت تھے اور یہ جن علاقوں میں گئے وہاں ایک دنیا ان کے فیوض علمی و عملی سے بہرہ ور ہوئی۔ آٹھویں صدی ہجری میں یہاں ایک مشہور علمی اور روحانی شخصیت سید حسن کبیر کا ورود ہوا۔ ان کی درسگاہ بھی مثالی اور امتیازی حیثیت کی حامل تھی۔ نویں صدی ہجری میں یہاں ایک

اور علمی ادارہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس درسگاہ کے بانی خانوادہ گیلانیہ کے فرد فرید سید محمد غوث حلبی تھے۔ ان کے افاضات علمی اور روحانی سے بھی ایک عالم فیضیاب ہوا۔ خانقاہ گیلانیہ کے اثر و نفوذ کا دائرہ بھی کچھ کم وسیع نہیں تھا۔ برّ صغیر ہند و پاک کے اکثر بزرگان طریقہ قادریہ اسی آستانہ سے فیضیاب ہوئے۔ اور اس ظلمت کدہ میں اسلام کی مشعل فروزاں کئے رہے۔ اپنی انہی علمی اور روحانی خصوصیات کی بنا پر اوچ کی سرزمین کم و بیش پانچ سو برس تک مرجع خلائق رہی اور یہ شہر ہندوستان کے عظیم روحانی اور علمی مراکز میں امتیازی شان کا حامل رہا۔

مدرسہ فیروزیہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا اوچ کی علمی شہرت کا آغاز "مدرسہ فیروزیہ" سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ پہلے پہل طبقات ناصری کے مصنف علامہ منہاج سراج نے کیا ہے اور جس کے وہ صدر مدرس بھی رہے ہیں۔

افسوس کہ خود علامہ نے اس مدرسہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی اور نہ یہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ اس مدرسہ کی بنیاد کس دور میں رکھی گئی اور کس نے اسے قائم کیا۔

اوچ کے مدرسے کا نام "فیروزیہ" کس مناسبت سے رکھا گیا اس پر کچھ روشنی سید سلیمان ندوی مرحوم کی تاریخی تصنیف "عرب و ہند تعلقات" کے ذریعے پڑتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"محمود غزنوی کے وارثوں کی حکومت کے انحطاط کے بعد سندھ پر "سومرہ" خاندان حکمران ہوا۔ یہ لوگ اسماعیلی تھے۔ خود کو موحد اور اہل توحید کہتے تھے لیکن ان میں غیر اسلامی مراسم بھی پائے جاتے تھے۔ اس خاندان کا ہر بادشاہ اپنا اسلامی لقب "ملک فیروز" اختیار کرتا تھا۔"

اس واقعہ سے اس مدرسہ کے نام کی ایک توجیہہ سمجھ میں آتی ہے کہ

مدرسہ فیروزیہ سے مراد "شاہی" مدرسہ تھا۔ یہ بھی امکان ہے کہ سومرہ عہد کے بجائے ناصرالدین قباچہ ہی کے دور میں اس مدرسہ کی بنیاد پڑی ہو اور اس نے اپنے پیشرو حکمرانوں کی تقلید میں خود کو اسی لقب سے ملقب کرنے میں کوئی قباحت نہ کبھی ہو یا ہو سکتا ہے کہ یہ مدرسہ پہلے سے قائم ہو اور ناصرالدین قباچہ نے اس مدرسہ کے نام میں تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی ہو اور مدرسہ کا نام جوں کا توں برقرار رہا اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے کہ مدرسہ فیروزیہ چونکہ ایک خالص تعلیمی ادارہ تھا اس لئے سومروں کی شکست کا اس مدرسے پر کوئی بُرا اثر مرتب نہیں ہوا اور اس کا نام اور اس کے تدریسی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

مدرسہ فیروزیہ کا نصاب تعلیم

مدرسہ فیروزیہ کے نصاب تعلیم کے بارے میں کوئی جامع تفصیل نظر سے نہیں گزری۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ جو کتابیں داخل درس تھیں، ان میں فقہ، اصول فقہ، تصوف، علم کلام، معانی و بیان اور تفسیر و حدیث کی کتابوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی جیسا کہ ناصرالدین قباچہ سے متصل دور میں خانقاہ جمالیہ کے تعلیمی مشاغل سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا بیان ہے کہ حضرت جمال خنداںؒ رو ان کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔

ہدایہ، بزدوی، مشارق الانوار، مشکوٰۃ المصابیح اور عوارف المعارفؒ۔ اس دور کے تصنیفی رجحانات کو دیکھ کر بھی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کون کونسی کتابیں اور کس قسم کے علوم ان مدارس میں مروج تھے۔ چوتھی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک تاریخ، منطق، فلسفہ، علم ہیئت و افلاک، فقہ، اصول فقہ، تصوف علم کلام اور معانی و بیان پر سب سے

لہ جامع العلوم

زیادہ کتابیں لکھی گئیں نیز مختلف اسلامی فرقوں کے تقابلی مطالعہ اور مناظرہ و مباحثہ کے رنگ میں بھی کئی ایک کتابیں اس دور کی یادگار ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے عہد میں جو کتابیں خود حضرت مخدوم کے زیر تدریس رہیں ان سے بھی اس زمانہ کے نصاب تعلیم کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے۔

جامع العلوم میں ہے کہ حضرت مخدوم قرآن حکیم کے علاوہ تفسیر مدارک، صحاح ستہ، مشارق الانوار، شرح کبیر چہل اسم، مشکوٰۃ المصابیح، رسالہ مکیہ، قصیدہ لدمیہ، کتاب منتفق، عقائد نسفی، شرح نودونہ نام، فقہ اکبر، عوارف المعارف، اسرار الدعوات، صرف و نحو اور لغت و ادب کی بعض کتابوں کا درس بڑی باقاعدگی سے دیا کرتے تھے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ علامہ زمخشری کی تفسیر "کشاف" کے چنداں قائل نہ تھے اور اس کی بجائے تفسیر مدارک التنزیل پڑھایا کرتے تھے۔ (در المنظوم صفحہ ۹۰، و صفحہ ۹۶) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تفسیر کشاف بھی داخل درس تھی۔ مگر چونکہ علامہ جار اللہ زمخشری، معتزلہ کے ہم نوا تھے۔ اس لئے آپ نے اس کی تفسیر کو متروک قرار دیا۔ اگر مدرسہ فیروزیہ کی بنیاد قرامطہ نے رکھی ہے جیساکہ اس کے نام سے مترشح ہوتا ہے تو اس کے نصاب تعلیم کا انداز یقیناً مختلف ہوگا۔ شیعی مکتب فکر کی جو کتابیں اس دور میں قرامطہ کے زیر اثر مدارس میں مروّج ہوں گی ان میں سے اکثر و بیشتر سیاسی اور مذہبی اختلافات کی بھینٹ چڑھ کر عنقا ہو چکی ہیں اس لئے قطعیت کے ساتھ اس بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال نصابِ تعلیم خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو اتنا وثوق سے معلوم ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں اوچ اسلامی تعلیمات کا عظیم مرکز تھا اور تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے اس شہر کی علمی عظمت کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ امپیریل گزٹیئر آف انڈیا

نے لکھا ہے۔[1]

"اوچ اسلامی تعلیمات کا بہت بڑا مرکز رہا ہے کیونکہ ۱۲۲۷ء میں مشہور ایرانی مؤرخ منہاج الدین سراج اوچ کے فیروزی کالج کا صدر نشین تھا۔"

کولمبیا لیپنی کاٹ گزیٹیئر آف دی ورلڈ میں اوچ کی علمی اہمیت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں یہ اسلامی تعلیمات کا مرکز تھا۔[2]

خود علامہ منہاج سراج نے اس شہر کا ذکر "حضرت اوچہ" کے نام سے کیا ہے جو اس کی علمی اور دینی عظمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔[3]

---

[1] (Imperial Gazetteer of India Vol. XXIV P. 82)

[2] (The Columbia Lippin Catt Gazetteer of the World)

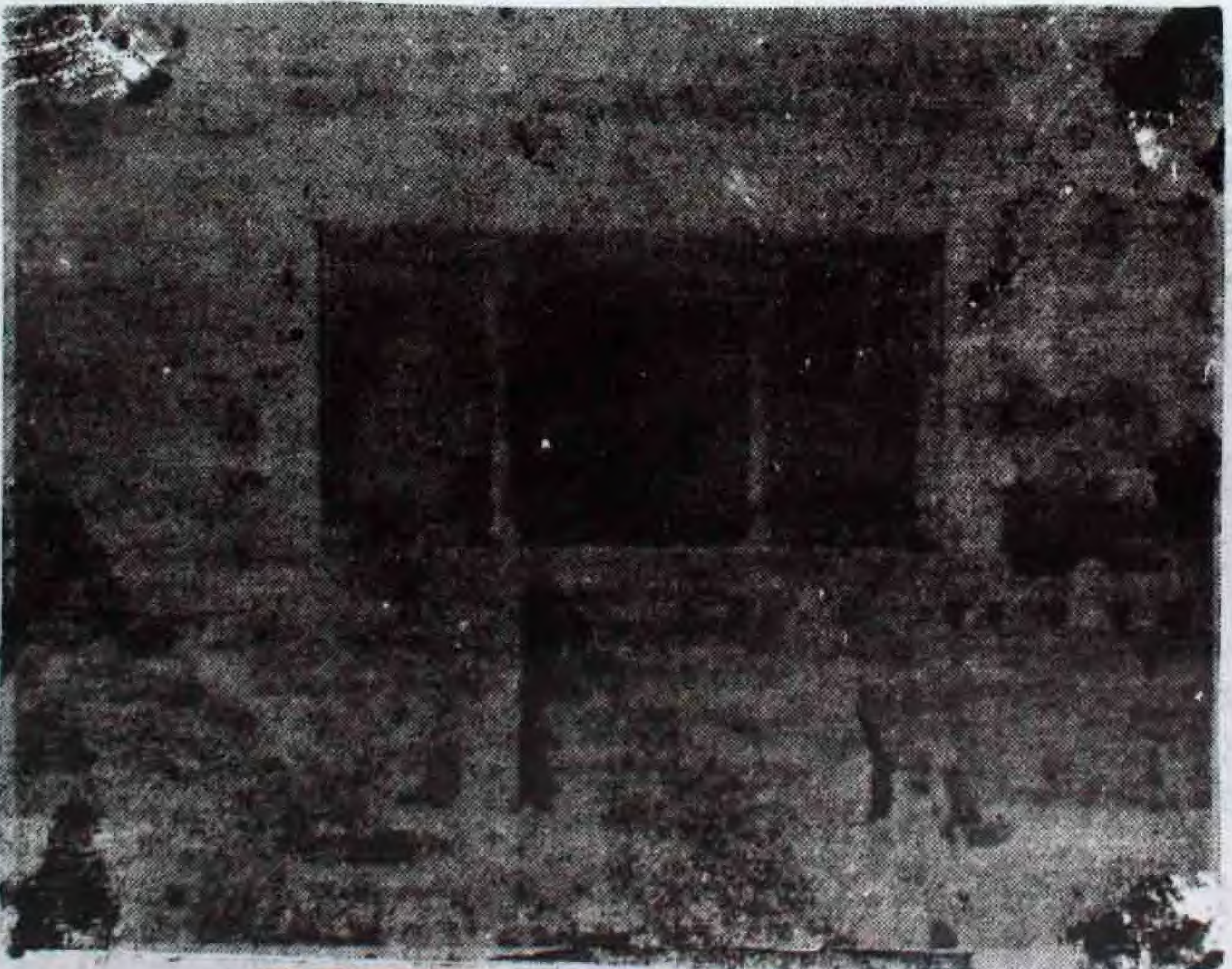
[3] طبقات ناصری ص۹۰

اوچ کی قدیم علمی شخصیتیں

حضرت سید صفی الدین گازرونی

اوچ کی قدیم علمی شخصیتوں میں حضرت صفی الدین گازرونی کا نام ملتا ہے۔ جن کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ وہ پہلے صوفی بزرگ ہیں جو اس برصغیر میں وارد ہوئے اور اوچ میں رہائش اختیار فرما کر یہاں انہوں نے ایک علمی درسگاہ قائم کی جس میں صرف طلبا کی تعداد پانچسو سے متجاوز تھی۔ اوچ میں ان کی آمد کا زمانہ ۳۷۰ھ بتایا جاتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ اس روایت کے بموجب ان کا انتقال ۳۹۸ھ میں ہوا۔ یہ راجہ انگ پال کے عہد کا واقعہ ہے۔

ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بابا ابو السحاق گازرونی کے خواہر زادہ تھے۔ جن کا انتقال ۴۲۶ھ میں گازرون میں ہوا۔ یہ روایت بھی زبان زد عوام ہے کہ ان کے مرشد نے ان کو ایک مسواک اور چند تبرکات عطا کئے۔ سواری کے لئے اونٹ دیا اور فرمایا کہ " یہ مسواک جہاں جا کر سر سبز ہو جائے اور زمین میں گاڑنے سے پھوٹ نکلے اور جہاں جا کر



خانقاہ حضرت صفی الدین گازرونی

تمہارا یہ اونٹ رک جائے اسی کو اپنا مقام سمجھ کر وہاں رہائش اختیار کر لینا" چنانچہ اس طرح منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے آپ اوچ پہنچے اور یہیں اپنے مرشد کے آثار کو پھلتا پھولتا دیکھ کر اقامت گزیں ہو گئے۔

افسوس کہ کسی قابل ذکر تاریخی کتاب میں ان کے تفصیلی حالات مذکور نہیں ہیں۔ ہند و بیرون ہند میں اس برِ صغیر کے بزرگوں کے حالات پر مختلف زبانوں میں بیشمار کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کی کسی قدیم اور مستند کتاب میں ایسی کسی شخصیت کا ذکر نہ ملنا ایک اعجوبہ سے کم نہیں جو اپنے دور کی اتنی اہم علمی حیثیت کی حامل رہی ہو کہ اس کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو۔

لے دے کے اخبار الاخیار مؤلفہ شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور فوائد الفواد (ملفوظات خواجہ نظام الدین دہلوی) میں ان کا ضمناً ذکر کیا گیا ہے مگر زمانہ کا تعین نہ اخبار الاخیار میں کیا گیا ہے نہ فوائد الفواد میں۔

اوچ کے خلیفہ خاندان کی بعض قلمی کتابوں میں ان کا سن وفات ۶۵۲ھ درج ہے اور ہندوستان میں انکی آمد ۶۱۴ھ بتائی گئی ہے۔ اس قلمی مسودہ میں یہ بھی درج ہے کہ آپ سیالکوٹ کے مشہور بزرگ امام علی الالحق کے داماد تھے۔ اسی طرح اس میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے صاحبزادہ کا نام فخر الدین تھا اور وہ زر بخش کے لقب سے مشہور تھے۔ فخرالدین گازرونی زر بخش کے صاحبزادہ کا نام معین الدین تھا اور وہ ناصرالدین محمود کے عہد میں تھے یعنی ۶۴۹ھ / ۱۲۵۱ء سے ۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء کے دوران۔

تاریخ اوچ مصنفہ مولوی حفیظ الرحمٰن میں بھی اس شخصیت کے بارے میں عجیب تضاد بیانی نظر آتی ہے۔ تاریخ اوچ صفحہ ۶۷ پر اوچ میں سید صفی الدین گازرونی کی آمد کا سال ۴۰۷ھ درج ہے اور اسی کتاب کے صفحہ ۶۹ پر ان کو شہاب الدین غوری کے عہد کی شخصیت ثابت کیا گیا ہے۔

خلیفہ خاندان کی محولا بالا قلمی کتاب محض اوراق پارینہ ہیں جو سو پچاس برس پہلے کسی نے لکھے۔ ان کی کوئی اعتباری حیثیت نہیں ہے اور پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس خاندان میں ایسے مخطوطات بھی ملتے ہیں جن میں حضرت موصوف کی اوچ میں آمد کا زمانہ چوتھی صدی ہجری درج ہے۔

ہماری رائے میں ان تمام اختلافی بیانات سے قطع نظر یہی آخری بات قرینِ قیاس ہے اور اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے، کہ عام تذکروں میں ان کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں ملتیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ ان کے عہد کی قدامت دبی ہو جو عام طور پر مشہور ہے۔ کیوں کہ یہی وہ دور ہے جس میں کسی عظیم علمی یا روحانی شخصیت کے کارناموں کا باقاعدہ ریکارڈ شکل سے دستیاب ہے۔ خاص طور پر برّ صغیر میں جو بزرگ اس عہد میں آئے تب کہ یہاں کافروں اور ملحدوں کا غلبہ تھا۔ ان کے حالاتِ زندگی، ان کے علمی رنامے، ان کی روحانی فتوحات اور ان کے گرد و پیش کے واقعات کی چھان بین بس مشکل ہے۔

اوچ ہی کے رہنے والے ایک صاحب جو سید صفی الدین گازرونیؒ سے بھی متقدم ہیں اور جو سندھ میں ایک خود مختار ریاست منصورہ کے بانی ہوئے نبی عمر بن عبدالعزیز ہباری ہیں ان کے متعلق بھی صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ یہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور ان کا خاندان تیسری صدی ہجری کے نصف دل میں اوچ میں آباد تھا۔ جب ایسی اہم سیاسی شخصیتوں کے بارے میں ہم تاریکی میں ہیں تو کسی علمی شخصیت کے بارے میں معلومات کی یہ تشنگی چنداں قابل تعجب نہیں ہے۔

خزینۃ الاصفیاء میں سید صفی الدین گازرونی کی اوچ میں آمد آٹھویں صدی ہجری بتائی گئی ہے۔ خزینۃ الاصفیا کی روایت کے مطابق۔ سید صفی الدین گازرونی میراں بادشاہ لاہوری کے بھانجے اور مرید تھے۔ سید ابو اسحاق گازرونی

میراں بادشاہ کا مزار مسجد وزیر خان لاہور کے صحن میں زمین دوز طریقہ پر بنا ہوا ہے۔ اوچ میں سید صفی الدین گازرونی اپنے پیرو مرشد کے ایماء پر تشریف لائے اور یہاں اوچ گیلانی کی بنیاد رکھی۔ یہ سید اسحاق گازرونی بابا ابو اسحاق بن ابراہیم شہریار گازرونی سے بالکل مختلف شخصیت ہیں اور ان کے درمیان کم و بیش ساڑھے تین سو برس کا فاصلہ حائل ہے۔ خزینۃ الاصفیا کی عبارت یہ ہے:۔

"سید اسحاق گازرونی لاہوری المشہور بہ میراں بادشاہ قدس سرہٗ صاحب مقامات بلند و کرامات ارجمند از خاندان سادات عظام حسینی است و بہ وقت خود شیخ المشائخ و قطب الاولیا بود نسبت ارادت بخدمت شیخ اوحدالدین اصفہانی داشت اول در شہر گازرون اقامت داشت بعد ازاں بہ اشارت غیبی در شہر لاہور آمدند صاحب رسالۃ المومنین می فرماید کہ سید ابو اسحاق گازرونی لاہوری عمرے طویل یافت۔ وفات سید اسحاق در سال ہفت صد و ہشتاد و شش ہجری کہ مورخان متقدمین سال وفات وے از بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اخذ کردہ اند و ایں قطعہ مدرج رسالہ تحفۃ الواصلین ہست۔

سید اسحاق ولی کریم ——— گشت چوں زیں دہر بجنت مقیم
سال وصل او عجب آمد ز دل ——— بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۷۸۶ھ ہجری

ترجمہ:۔ سید اسحاق گازرونیؒ لاہوری جو میراں بادشاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خصوصی رحمتوں سے نوازے۔ بڑے اونچے مقام کے مالک اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ آپ حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے زمانہ کے بہت بڑے شیخ اور قطب اولیاء تھے۔ آپ شیخ اوحد الدین اصفہانی سے بیعت کی نسبت رکھتے تھے۔ پہلے شہر گازرون میں قیام فرماتے پھر غیبی اشارے سے لاہور تشریف لائے۔ رسالۃ المومنین کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید اسحاق گازرونیؒ لاہوری نے طویل عمر پائی۔ آپ کی وفات

۸۹۰ھ میں ہوئی۔ پرانے مورخین نے سال وفات کا استخراج " بسم اللہ الرحمن الرحیم " سے کیا ہے۔ تحفۃ الواصلین میں یہ قطعہ بھی اس ضمن میں درج ہے (جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے)

سید اسحاق نیک طینت ولی جب اس دنیا سے جنت میں تشریف فرما ہوئے تو دل نے ان کے وصال کا سال " بسم اللہ الرحمن الرحیم " سے اخذ کیا۔

گویا اوچ کی تاریخی شخصیت سید صفی الدین گاذرونیؒ انہی بزرگ کے مرید اور خواہر زادہ تھے۔خزینۃ الاصفیا کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"و درج اخبار الاخیار است کہ چوں سید ابو اسحاق گاذرونی لاہوری بعد عطائے نعمت و خرقہ خلافت بسید صفی الدین ہمشیرہ زادہ خود ،اورا از نزد خود رخصت فرمود۔ حکم داد کہ بر اشترے سوار شود۔ ہر جانب کہ آں شتر برود تو نیز بر رو بہ جائیکہ بنشیند مقام ساز و قیام کن۔ چنانچہ سید صفی الدین ہم چناں بعمل آورد چوں بر زمین متصلہ آبادی سابقہ مقام اوچہ رسید شتر بنشست پس ہماں جا بہ حکم پیر دستگیر خود توطن فرمود و آبادانی علیحدہ آباد ساخت۔ (خزینۃ الاصفیا ج ۱ صـ۱۱")

ترجمہ:۔

اخبار الاخیار میں درج ہے کہ جب سید ابو اسحاق گاذرونی لاہوری نے نعمت و خرقہ خلافت اپنے بھانجے سید صفی الدین گاذرونی کو عطا فرمانے کے بعد اپنے پاس سے رخصت کیا تو حکم دیا کہ اونٹ پر سوار ہو کر جدھر یہ اونٹ لے جائے اسی طرف چلتے جاؤ اور جہاں جا کر یہ بیٹھ جائے وہیں قیام کرو۔ چنانچہ سید صاحب موصوف نے حکم کی تعمیل کی۔ جب اونٹ اوچ کی پرانی آبادی کے قریب جا کر بیٹھا تو حضرت سید صفی الدین گاذرونی نے اپنے پیر و مرشد کے حکم سے اسی جگہ ڈیرہ ڈالا اور ایک علیحدہ بستی بسائی۔

ایک دوسری جگہ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:۔

سید صفی الدین بانی مقام اوچہ و ہمشیرہ زادہ سید اسحاق گازرونی میراں بادشاہ لاہوری کہ اندرون مسجد وزیرانِ مغل آسودہ است (ایضاً صفحہ ۱۱۷)

ترجمہ:۔

"سید صفی الدین جو اوچ کے بانی اور سید اسحاق گازرونی میراں بادشاہ لاہوری کے بھانجے ہیں۔ سید اسحاق گازرونی مغل وزیروں کی مسجد میں مدفون ہیں"

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صفی الدین گازرونی" آٹھویں صدی ہجری کی شخصیت ہیں اور سن ۷۰۰ ہجری کے بعد انہوں نے کسی دور میں اوچ میں قدم رنجہ فرمایا لیکن اگر اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے تو فوائد الفواد کی اس عبارت کا معمہ حل نہیں ہوتا جس میں حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی" نے سید صفی الدین گازرونی کا ذکر کیا ہے اور ان سے متعلق جوگی سے مقابلہ کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ:۔

ایک مرتبہ اوچ میں ایک جوگی، شیخ صفی الدین گازرونی کی خدمت میں آیا بحث شروع کی اور شیخ سے کہا اگر تم سچے ہو تو کوئی کرامت دکھاؤ۔ آپ نے فرمایا۔ دعویٰ تمہیں ہے تم ہی اس کی دلیل کے طور پر کوئی کرامت دکھلاؤ۔ اس پر وہ جوگی زمین سے ہوا میں سیدھا اوپر کو اُڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور کہا کہ تم بھی کوئی مظاہرۂ کرامت کرو۔ شیخ نے بارگاہِ حق میں التجا کی کہ پروردگار! تو نے بیگانوں کو یہ طاقت عطا کی ہے، مجھے بھی کچھ عنایت فرما! اس کے بعد شیخ اپنی جگہ سے قبلہ رُخ اڑے پھر مشرق کی جانب پھر شمال کی سمت پھر جنوب کی طرف۔ جوگی نے جو یہ منظر دیکھا تو شیخ کی عظمت کا قائل ہو گیا اور کہا کہ میں تو صرف سیدھا اوپر کی طرف اڑ سکتا تھا اور آپ تو ہر سمت پرواز کر سکتے ہیں۔ واقعی آپ سچے ہیں اور میں جھوٹا۔

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب اولیاء دہلوی" کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا ہے۔ اس بنا پر یہ واقعہ ان کی وفات سے پہلے کا ہونا چاہئے۔

یہاں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے اس ملفوظ کو بھی ذہن میں رکھئے کہ حضرت سید جلال سرخ بخاری کے اوچ تشریف لانے سے قبل یہاں دو خانقاہیں پہلے سے موجود تھیں۔ ایک گاذرونیوں کی اور دوسری جمالیوں کی (ملفوظ المخدوم)

ان واقعات سے خزینۃ الاصفیاء کی روایت غلط ثابت ہوئی ہے اور صحیح یہ ہے کہ مفتی غلام سرور لاہوری کو ابو اسحاق گاذرونی کے نام سے اشتباہ ہوا۔ انہوں نے لاہوری بزرگ اور گاذرون کے چوتھی صدی ہجری کے بزرگ کے ہم نام ہونے کے باعث سید صفی الدین گاذرونی کو لاہور کے سید ابو اسحاق گاذرونی کا خواہر زادہ قرار دے دیا۔

سید صفی الدین گاذرونی کی اوچ میں آمد غالباً اس دور میں ہوئی جب اوچ اردر یا ردر کے نام سے مشہور تھا۔ اس زمانہ کی شخصیتوں کے حالات سے بہت کم اعتنا برتا گیا ہے اور تفصیلی حالات ان بزرگوں کے بالکل نایاب ہیں جو چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان میں آکر قیام پذیر ہوئے۔

چوتھی صدی ہجری میں اوچ، منصورہ کی ریاست کا ایک ماتحت علاقہ تھا اور چوتھی صدی ہجری کے آخری سالوں میں اوچ پر قرامطہ کے اثرات کا پرتو پڑا۔ غالباً اس زمانہ میں سید صفی الدین گاذرونی یہاں قیام پذیر تھے۔ اور شاید انہی کی کوششوں سے محمود غزنوی نے اوچ پر حملہ کیا اور ملتان کی طرح اوچ سے بھی قرامطہ کا استیصال کر دیا۔ اگرچہ بابا ابو اسحاق گاذرانیؒ نسباً عجمی تھے جیسا کہ ان کے شجرۂ نسب سے معلوم ہوتا ہے لیکن ممکن ہے ان کی ہمشیرہ کسی سید زادے سے منسوب ہوں اور چونکہ اسلام میں نسب کا اعتبار باپ کی جانب سے ہوتا ہے اس لئے اسی نسبت سے اوچ کی یہ عظیم شخصیت خانوادہ سادات سے تعلق رکھتی ہو۔

مسعودی نے مروّج الذہب میں منصورہ میں علوی سادات کے کئی

حکمرانوں کا ذکر کیا ہے جب سے اس علاقہ میں ان حضرات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ اوچ بھی اس عہد میں منصورہ کے ماتحت تھا اس لئے یہاں بھی اس معزز خاندان کے افراد موجود ضرور ہوں گے۔

جامع الحکایات جو قباچہ کے عہد کی تصنیف ہے اور جسے اس دور کے نامور عالم نور الدین محمد عوفی اوچی نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں محمود غزنوی کے عہد میں اوچ کے آس پاس کسی بزرگ کا تذکرہ ملتا ہے جو سادات میں سے تھے۔ حکایت یہ ہے کہ محمود غزنوی جب چولستان کے علاقہ سے گزر رہا تھا تو راستہ بھول گیا۔ دو ہندوؤں نے محمود غزنوی کو راستہ بتانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں جو اسے تین دن تک ریگستان میں لئے پھرے اور آخر ایسے مقام پر لے گئے جہاں دُور دُور تک نہ پانی تھا، نہ سبزے کا نام و نشان۔ یہاں پہنچ کر ان ہندوؤں نے محمود غزنوی کو بتایا کہ انہیں اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ تمہیں غلط راستے پر ڈال دیا جائے۔ تمہارے آگے صحرائے اعظم ہے۔ اور پیچھے ہندوستان کی فوج۔ اب تم ہمارے ساتھ جو سلوک چاہے، کرو۔ لیکن یاد رہے کہ تم اور تمہارا ایک سپاہی بھی یہاں سے بچ کر واپس نہ جا سکے گا۔

اس اثنا میں محمود غزنوی کی نظر ہوا میں اڑتے ہوئے ایک دریائی پرندے پر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی اور اس نے اس دریائی پرندے کے رخ پر اپنے سفر کو جاری رکھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں میٹھا پانی دریافت کرنے میں اسے کامیابی ہو گئی یہاں محمود کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے ایک سن رسیدہ بزرگ ملے جو اپنے کنبے کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔ محمود نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے خود تو راستے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ البتہ ایک اور بڈھے آدمی کا پتہ بتایا جو چولستان کے راستوں سے واقف تھا اس نے محمود غزنوی اور اس کی فوج کو لب دریا ایک مقام پر پہنچا دیا۔

اس طویل حکایت کو پیش کرنے کا مقصد محض یہ بتانا تھا کہ اس عہد میں ان اطراف میں بعض ایسی بزرگ شخصیات موجود تھیں جو نمایاں خاندانی عظمت کی حامل تھیں لیکن وہ اس طرح گوشۂ خمول و گمنامی میں جا پڑیں کہ ان کے نام اور ان کے مقام کے بارے میں مفصل تو کیا مختصر سی معلومات بھی دستیاب نہیں ہیں۔

میری رائے میں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کا وہ دور اس خطہ کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ یعنی وہ زمانہ جب یہاں قرامطہ عروج پر تھے انہوں نے ان تمام شخصیتوں کے کارناموں پر پانی پھیر دیا جو ان کے پیشروؤں کے عہد میں ممتاز مرتبہ و مقام کی مالک تھیں۔ اور اس طرح ان حضرات کے علمی یا روحانی کارنامے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ گئے۔ سب سے زیادہ افسوس ساتویں صدی ہجری کے ان مورخین پر ہے جو اوچ سے متعلق رہے مگر انہوں نے اوچ کے بارے میں بھی کسی قسم کی تاریخی معلومات فراہم کرنے میں حد درجہ بخل اور بے اعتنائی برتی مثلاً چچ نامہ کے مؤلف علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے عمر کا بیشتر حصہ اوچ میں گزارا مگر پوری کتاب میں اوچ کا نام تک نہیں لیا نہ یہ بتایا کہ محمد بن قاسم کے عہد میں اوچ کی کیا حالت تھی یا اس بستی کا کیا نام تھا۔ یہی حال علامہ منہاج سراج کا ہے کہ وہ ایک سال اوچ میں مقیم رہے مگر نہ اوچ کی حدود اربعہ پر کوئی روشنی ڈالی نہ اپنی ہمعصر یا اپنے پیشرو شخصیتوں کا کوئی اجمالی سا ذکر بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سید صفی الدین گازورنی کے بارے میں ہماری معلومات از حد تشنہ ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت ؒ کے ملفوظات میں بھی گازورونیوں کی خانقاہ کا ذکر تو ملتا ہے مگر کسی گازورونی بزرگ کا نام لینے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

علی بن حامد بن ابوبکر کوفی مولف "چچ نامہ"

سندھ میں مسلمانوں کی فاتحانہ یلغار اور محمد بن قاسم کی فوجی مہم کے بارے

میں سب سے پہلی مستند اور "تاریخی کتاب" المند و السند و منهاج المسالک" ہے جسے قاضی اسماعیل بن علی ثقفی نے مرتب کیا اور علی بن حامد بن ابو بکر کوفی نے ۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء میں فارسی جامہ پہنایا۔ یہ کتاب "چچ نامہ" کے نام سے مشہور ہوئی

علی بن حامد کو مذکورہ بالا عربی کتب کے اوراق بکھر کے ثقفی خاندان سے دستیاب ہوئے تھے۔ صحرا نوردی اور جہاں گردی کے بعد جب وہ ناصر الدین قباچہ کے عہد حکومت میں اوچ آئے تو ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور جیسا کہ انہوں نے خود چچ نامہ کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔ انہیں اوچ میں بڑا سکون نصیب ہوا اور یہاں رہ کر انہوں نے فارغ البالی اور آسودگی کی زندگی بسر کی۔ علی بن حامد بن ابوبکر کوفی کے جد امجد اوچ میں آکر آباد ہوئے تھے۔ علی کی پیدائش بھی اوچ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی انہوں نے یہیں حاصل کی۔ ۵۶ برس کی عمر میں انہوں نے اپنی یہ تاریخی کتاب مکمل کی اور اس کا انتساب ناصرالدین قباچہ کے وزیر عین الملک حسن بن ابوبکر بن محمد الاشعری کے نام کیا "چچ نامہ" میں تاریخی شخصیتوں کے بارے میں افسوسناک حد تک اغماض برتا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مقامات کے تعین میں بھی نہ کسی تحقیق کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ نہ کوئی ایسا واضح اشارہ ان کے محل وقوع کے بارے میں ملتا ہے جس سے تاریخ کے ایک طالب علم کو واقعات کے سوا بھی کچھ مزید معلومات حاصل ہو سکیں۔ خود اوچ کو بھی انہوں نے اپنی کتاب میں نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک پرانا تاریخی شہر تھا اور جہاں وہ اس علاقہ کے بارے میں معلومات مہیا کر رہے تھے۔ وہاں اوچ اور اس کے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات کا ذکر بھی کر دیتے تو تاریخ کا یہ تشنۂ تکمیل باب مکمل ہو جاتا۔

علی بن حامد بن ابوبکر کوفی کا انتقال بھی اوچ میں ہوا مگر قبروں کے اس جنگل میں آج ان کی لوح مزار کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

قاضی منہاج سراج

قاضی ابو عمرو عثمان بن محمد بن ابراہیم بن عبدالخالق جوزجانی، منہاج سراج کے نام سے مشہور ہوئے۔ زبردست عالم، شاعر اور صوفی تھے۔ ان کے والد مولینا سراج الدین محمد دہلوی شہاب الدین غوری کے زمانہ میں قاضی وقت تھے ان کی پیدائش غالباً ۵۸۹ھ میں دہلی میں ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "طبقات ناصری" میں* وضاحت کی ہے کہ ۶۰۷ھ میں وہ ۱۸ برس کے تھے علامہ منہاج سراج کا کچھ وقت لاہور میں بھی گزرا جہاں ان کے والد لاہور کے گورنر ملک حسام الدین علی کرماخ کے ماتحت ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں لاہور کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔ ۵۹۱ھ میں ان کے والد کو شہاب الدین غوری نے بامیان اور طخارستان (افغانستان) کا قاضی مقرر کیا۔ علامہ منہاج سراج کی ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں پر ہوئی۔ انہوں نے ہرات کے مشہور عالم قاضی ضیاء الدین تولکی کے زیر تربیت رہ کر علوم شرعیہ کی تکمیل کی۔ بعد ازاں والی ہرات ناصرالدین ابو بکر کے درباری بھی رہے۔

علامہ منہاج سراج، ناصرالدین قباچہ کے عہد میں منگل کے روز ۲۵ جمادی الاول ۶۲۴ھ کو اوچ پہنچے۔ قباچہ نے انہیں اوچ کی درسگاہ فیروزیہ کا انچارج مقرر کیا۔ طبقات ناصری جو ان کی تالیف ہے اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"روز سہ شنبہ و ششم ماہ جمادی الاول سنہ اربع وعشرین
وستمائتہ مدرسہ فیروزی اوچہ حوالہ ایں داعی شد"۔

ان کی ایک تصنیف "ناصری نامہ" جسے انہوں نے ۶۲۵ھ میں لکھا۔ اب ناپید ہے۔ ۶۵۸ھ میں انہوں نے طبقات ناصری مکمل کی جس کا انتساب انہوں نے نیک نام اور خوش نہاد بادشاہ ناصرالدین محمود کے نام کیا۔ ناصرالدین نام کے تین بادشاہوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ اول ناصرالدین ابو بکر

والی ہرات دوم ناصرالدین قباچہ اور تیسرے ناصرالدین محمود جن میں سے موخرالذکر کی نیکی اور پارسائی سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں انہیں ناگور کا قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔

ناگور کے مشہور بزرگ شیخ حمیدالدین ناگوریؒ جو سماع کے بڑے شائق اور دلدادہ تھے۔ جب ان کے خلاف اس عہد کے علماً نے ان کے شوق سماع کی بنا پر ایک ہنگامہ کھڑا کیا اور ان کی گمراہی اور فسق و فجور کے فتوے صادر کئے گئے۔ اور التمش کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تو یہ علامہ منہاج سراج تھے جنہوں نے فتویٰ بازی کی اس مہم کو اپنی دانشمندی سے ناکام کر دیا۔ علامہ منہاج سراج خود بھی سماع کے قائل اور صاحب حال شخص تھے۔ زبان میں بڑی تاثیر تھی اور وعظ و تذکیر کا انداز بڑا دلکش اور موثر تھا حضرت خواجہ نظام الدین محبوبؒ اولیا دہلوی ان کی مجالس وعظ میں باقاعدہ شرکت فرماتے رہے۔ فوائدالفواد میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے ان کی ایک مجلس وعظ کا ذکر کیا ہے جس میں خواجہ صاحب خود بھی شریک تھے۔ دوران وعظ میں علامہ منہاج سراج نے یہ دو شعر پڑھے:۔

لب بر لب لعل دل براں خوش کردن
وا بنگِ سرِ زلف مشوش کردن

امروز خوش است یک فرواست زیاں
خود را چو خسے طعمۂ آتش کردن

علامہ منہاج سراج شاعر بھی بڑے پایہ کے تھے۔ ۶۵۶ھ میں جب ہلاکو خاں کا قاصد ناصرالدین محمود کے دربار میں حاضر ہوا تو ایک زبردست شاہانہ کروفر کا دربار سجایا گیا۔ اس میں علامہ نے بیک وقت عربی اور فارسی میں دو قصیدے پڑھے جن سے ان کے ملکۂ شعرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربی قصیدہ کے دو اشعار یہ ہیں۔

ؔ نزہۃ الخواطر ج ۱ ص

قد صادف الرضوان ایام السوری ۔۔۔ می روح هذا البزم للسلطان
لازال یبقی فی جلالتہ ملکہ ۔۔۔ بمزید احسان ورفعة شان

فارسی قصیدے کے یہ اشعار ان کی استادانہ عظمت کے غماز ہیں۔

زہے جشنے کزو اطراف چوں خلد بریں گشتہ
خہے بزمے کزو اکناف عدل راستیں گشتہ

ز ترتیب نہاد و رسم و آئین و نشاط او
تو گوئی عرصہ دہلی بہشت ہشتین گشتہ

ز فر ناصر الدین شاہ محمود ابن التمش
ملک نزدش دعا خواندی فلک پیشش زمین گشتہ

شہنشاہے کہ در عالم بفیض فضل ربانی
سزائے چتر شاہی، لائق تخت و نگین گشتہ

چو خاقانا کین پرور چوں سلطانان دین پرور
بدلہ ماحی کفر است و بجاں حامی دین گشتہ

مبارک باد بر اسلام ایں بزم شہ عالم
کزیں ترتیب ہندستاں بسے خوشتر ز چیں گشتہ

ہمین از جملہ شاہان باد ہر بندہ ز درگاہش
چوں منہاج سراج از جاں دعا گوئے کمیں گشتہ

علامہ منہاج سراج دینی اور علمی وجاہت کے ساتھ ساتھ خاندانی اور نسبی عظمت کے بھی حامل تھے۔ ہرات کے والی ابراہیم بن مسعود جس کا عہد حکومت پانچویں صدی ہجری کا وسط ہے، کی ۴۰ لڑکیاں اور ۳۶ لڑکے تھے۔ اس نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں سادات کرام اور اہل علم حضرات سے کی تھیں۔ علامہ منہاج سراج کے پر دادا امام عبدالخالق جوزجانی جن کا مزار طاہر آباد (غزنین) میں ہے اور جو اپنے وقت کے عارف کامل تھے۔ وہ بھی سلطان ہرات

کے داماد تھے۔

علامہ منہاج سراج نے کافی طویل عمر پائی لیکن ان کے سن وفات کے بارے میں تاریخ کے صفحات بالکل خاموش ہیں ان کا انتقال غالباً دہلی میں ہوا

علامہ منہاج سراج کے علمی کارناموں میں طبقات ناصری ان کی تاریخی یادگار ہے لیکن وہ محض ایک مورخ تھے اور تحقیق کا مقام انہیں حاصل نہیں ہو سکا۔ انہوں نے اپنے معاصر شیوخ اور قابل ذکر تاریخی اور علمی شخصیتوں سے اغماض اور صرف نظر کیا ہے۔ نہ جانے اس دور میں تذکرہ نگاروں نے یہ عمومی روش کیوں اختیار کی کر اپنے گرد و پیش کے واقعات کو نظر انداز کرتے رہے اور صرف بادشاہوں کی قصیدہ خوانی ہی کا نام تاریخ سمجھ کر دادِ تصنیف دیتے رہے۔ گویا تاریخ صرف بادشاہوں کے حالات کا نام ہے اور اس کے سوا نہ اس کی کوئی غرض ہے نہ افادیت۔

نورالدین محمد بن محمد بن یحیٰی بن طاہر

بن عثمان العوفی الحنفی البخاری

اوچ کی علمی شخصیتوں میں نورالدین محمد عوفی کا نام بھی نمایاں اہمیت کا حامل ہے جو عہد قباچہ کے نامور عالم اور مصنف تھے۔ تاتاری فتنہ میں خراساں سے ترک وطن فرما کر سندھ پہنچے اور اوچ میں قباچہ کے مقربین کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ ناصر الدین قباچہ کے زوال تک آپ کا قیام اوچ میں رہا۔ اس دوران انہوں نے "لباب الالباب" نامی کتاب تصنیف کی اور اسے قباچہ کے وزیر عین الملک حسن بن ابوبکر بن محمد الاشعری کے نام سے منسوب کیا۔

اوچ پر جب شمس الدین التمش قابض ہوا تو اس نے اوچ کا نظم

و نسق اپنے وزیر نظام الملک قوام الدین کے سپرد کر دیا تھا۔ نورالدین محمد عوفی نے اپنی دوسری کتاب 'جوامع الحکایات و لوامع الروایات' اس کے نام منسوب کی۔ نورالدین نے بخارا میں وہاں کے زبردست عالم مولانا رکن الدین امام کے زیر سایہ تکمیل علوم کی وہ نسلاً مشہور صحابی رسول حضرت عبدالرحمان بن عوف کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اوچ میں نورالدین محمد عوفی کا ورود ۶۰۷ھ/۱۲۱۱ء میں ہوا اور اس نے کم و بیش ۲۵ سال یہاں گزارے۔ مشہور عوفی بزرگ قاضی ابو داؤد تنوخی کی کتاب " الفرج بعد الشدۃ " کو فارسی جامہ بھی انہوں نے پہنایا۔ ان کے سن وفات اور مزار کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

(نزہتہ الخواطر جلد نمبر ۱)

جمال الدین خنداں رو

اوچ کی علمی تاریخ نامکمل رہتی ہے۔ اگر اس میں حضرت شیخ جمال الدین خنداں رو اوچی کا ذکر جمیل شامل نہ ہو۔ یہ بزرگ اپنے عہد کے بہت بڑے اصحاب کمال اور ارباب علم و فضل میں سے تھے۔

'مرآۃ المناقب' میں ہے کہ حضرت مخدوم زکریا ملتانی جب اوچ تشریف لائے تو یہاں انہوں نے ایک بچے کی پیشانی میں آثار سعادت کی جھلک پائی۔ اس کے حق میں دعا فرمائی۔ حضرت مخدوم بہاؤالحق" نے اس ہونہار بچہ کو عمر کے آخری لمحوں تک فراموش نہیں فرمایا۔ انتقال سے کچھ عرصہ

ٹ جوامع الحکایات تاریخی کہانیوں پر مشتمل ایک دلچسپ مجموعہ ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس دور کے دیگر مورخین کے بارے میں شکایت کی ہے کہ وہ تاریخی مقامات اور شخصیات کے بارے میں خبر بہ لب رہتے ہیں اور صرف بادشاہوں کے قصے کہانیوں اور ان کی فتوحات کے تذکروں کو اہمیت دیتے تھے یہی اسلوب نورالدین نے

پہلے اپنے صاحبزادہ گرامی شیخ صدرالدین عارف سے فرمایا۔

"اچ میں ایک درویش رہتا ہے وہ جوہر لطیف کا ایک ہے اور صاحب استعداد ہے اس نے ابھی تک کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ ہمارے ہی خانوادے سے فیضیابی اس کے مقدر میں لکھی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکا لیکن وہ تمہارے پاس ضرور آئے گا۔ جذبۂ حق نے اس میں مجذوبانہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جب وہ تمہارے پاس پہنچے تو اسے تین دن تک ایک حجرے میں بٹھا کر تلاوت قرآن مجید میں مشغول رکھنا تاکہ ان کے جذباتِ عشق و مستی سکون آشنا ہو جائیں اور شعور کے ساتھ آداب صحبت بجا لانے کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد اسے اپنے پاس بلا کر حضرت شہاب الدین سہروردی کے خرقہ مبارک کے سوا باقی جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ نصف اس کے سپرد کر دینا۔"

چنانچہ حضرت زکریا ملتانی کے وصال کے بعد جب مولینا جمال الدین خنداں رو حضرت شیخ صدرالدین عارف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ عارف نے اپنے والد ماجد کی وصیت کے مطابق دیتے کے اس نامور عالم کو خرقۂ خلافت کے ساتھ ساتھ وہ تمام تبرکات بھی حصہ رسدی کے طور پر عطا فرما دیئے جو ان کے پاس تھے۔

حضرت جمال خنداں رو مشہور صحابی رسولؐ حضرت ابو ہریرہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد ماجد حضرت رضی الدین عثمان بھی بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ تاریخی کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل اوچ میں حضرت جمال خنداں روؒ کے جد امجد حضرت حاجی رجب غزنوی غالباً شہاب الدین غوری کی معیت میں تشریف لائے اور یہیں اوچ میں انہوں نے سکونت اختیار فرمائی لیکن ان کا انتقال پٹن (نہروالہ) گجرات، انڈیا میں ہوا اور وہ سید احمد کبیر رفاعی کے مرید و خلیفہ تھے۔

حضرت شیخ جمال الدین خنداں رحؒ اوچ میں خانقاہ جمالیہ میں درس و تدریس کا شغل فرماتے تھے اور اس عہد کی اوچ کی تمام نامور شخصیتیں ان کے فیوض علمی سے بہرہ ور ہوئیں۔

علم شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت و معرفت میں بھی آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق آپ کا مرید تھا۔ آپ کا انتقال غالباً ۷۲۵ھ میں ہوا۔

شیخ رضی الدین گنج علم

حضرت شیخ جمال الدین خنداں رحؒ کے بعد ان کی مسند تدریس پر ان کے ہونہار صاحبزادے حضرت رضی الدین متمکن ہوئے۔ آپ کی ولادت ۶۶۷ھ / ۱۲۶۸ء میں اور وفات ۷۷۰ھ / ۱۳۶۸ء میں ہوئی۔

آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحؒ کے استاد اور حضرت شاہ رکن العالم ملتانی کے مرید و خلیفہ تھے۔ علم و فضل میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے اور اسی بنا پر گنج علم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحؒ نے حضرت موصوف کے ایک فتویٰ کی تائید میں جو عبارت تحریر فرمائی ہے اس سے ان کی جلالت شان اور علمی منزلت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے حضرت مخدوم رحؒ نے لکھا ہے۔

اصاب فیما اجاب الاستاذ الاجل المرشد الکامل الاکمل شیخی الشیخ رضی الدین گنج علم نفعنا اللہ و ایاکم بعلمہ وکمالہ و افاض اللہ علینا فیوضہ ونوالہ۔

ترجمہ:۔

جلیل القدر مرشد کامل و اکمل میرے شیخ حضرت رضی الدین گنج علم نے صحیح جواب مرحمت فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ان کے علم و فضل اور

کمالات و فیوض سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ عطا فرمائے۔

علامہ قاضی بہاؤالدین

قاضی بہاؤالدین اوچ کے رہنے والے تھے۔ علم و فضل میں امتیازی حیثیت کے حامل اور غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے۔ اوچ میں آپ کی درس گاہ مدرسہ بہائیہ کے نام سے مشہور تھی۔ درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ بے شمار بندگان الٰہی آپ کے کمالات علمی سے بہرہ ور ہوئے۔ آپ کے شاگردانِ رشید کی فہرست میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جیسے اکابر کا بھی نام ملتا ہے۔ جامع العلوم میں ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے ابتدائی کتب درسیہ ہدایہ تک آپ سے پڑھیں۔ [1]

جامع العلوم میں خود حضرت مخدوم جہانیاں کا یہ اعتراف ملتا ہے کہ

"مولانا بہاؤالدین قاضی میرے استاد تھے۔ میں ان کے پاس پڑھتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے فرمایا" سر اونچا کر کے سلام کیا کرو کیوں کہ سر نیچا کر کے سلام کرنا مکروہ ہے"۔ [2]

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے مولانا کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کرایا تھا جو بڑا دلکش اور دیدہ زیب تھا۔ ۱۲۲۳ھ کے سیلاب میں جو دریائے گھارا کی صدیوں سے خشک گذرگاہ میں آیا۔ اس نے اس مقبرہ کا نصف حصہ مسمار کر دیا۔ باقی نصف حصہ بڑی پامردی سے حوادثِ دہر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اور عبرت کا منظر پیش کرتا ہے۔ مولانا بہاؤالدین مقامی حلقوں میں بہاول حیم کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے مقبرہ کو مقبرۂ بہاول حیم کہا جاتا ہے۔

ان مذکورۃ الصدر بزرگان دین اور علمائے محدثین کے علاوہ بے شمار ایسے اہل

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص۱۵
[2] الدر المنظوم ص ۳۶

علماء بھی اوچ میں تشریف لائے جنہوں نے برسوں اس علاقہ میں علوم اسلامیہ اور معرفت الٰہی کا درس دیا مگر ان میں سے اکثر و بیشتر علماء کے نام سے بھی کوئی شخص آج واقف نہیں ہے۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے رجوع خلق ان لوگوں کی طرف رہا جو تصوف و سلوک کے راہ نورد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بیشمار بندگان خدا جو اپنے زمانہ کے شیخ الاسلام اور اپنے عہد کے حکیم الامت تھے۔ ان کی کرامات اور خرقِ عادات سے تو لوگ واقف ہیں لیکن ان کے علم و فضل کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاری ان کے خلف الصدق سید احمد کبیر اور اس خانوادہ کے گوہر شب تاب حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کی گراں قدر شخصیتیں ہیں جن کے علم و فضل کا چرچا سمرقند و بخارا اور مصر و حجاز تک پہنچا اور جن کی علمی اور روحانی عظمت سے ایک دنیا متاثر ہوئی مگر ہمارے ہاں ان کی زندگی کا یہ پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور ان کی گوشہ گیری اور یاد حق میں ان کی ہر وقتی مصروفیت کے سوا ہمیں ان کے بارے میں کچھ بھی خبر نہیں ہے۔

حقیقت میں ان بزرگانِ دین کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے پُر آشوب دور میں اللہ کے دین کو اس کے بندوں تک پہنچایا جب نہ اس کے لئے فضا سازگار تھی نہ لوگوں میں قبول حق کی صلاحیت تھی مگر وہ اپنے فرائض کو اس خوبی سے سرانجام دیتے رہے کہ اللہ کا کلمہ اس بتکدۂ شرک و ضلالت میں بلند ہوا اور اسلامی تعلیمات کا چراغ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہا۔

یہ وہ لوگ تھے جن کے نفس گرم و آہ سرد کی تاثیر نے دلوں کی دنیا میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ ان کے خوان علم و فضل کی زلہ ربائی کے لئے مصر و حجاز اور روم و ایران سے علماء و فضلاء کی جماعتیں دور دراز کے سفر طے کر کے

ان کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور ہر ایک نے اپنے ظرف و دامن کی وسعت کے مطابق اپنا حصہ وصول کیا۔ یہ صرف طریقت کے رہنما نہیں تھے بلکہ شریعت کا علم ان کی امتیازی حیثیت کا طرۂ افتخار تھا۔ وہ شریعت و طریقت کے جامع اور علم و معرفت کے سنگم تھے اور علم و عمل کے امتزاج نے ان کی زندگیوں کو وہ رنگ روپ بخشا تھا کہ وہ دانش و آگہی کی ہر بزم کی زینت اور حکمت وخرد کی ہر انجمن کی رونق بنے رہے۔

باب چہارم

اوچ کی روحانی شخصیتیں

ناصر الدین قباچہ کے زوال کے بعد اوچ کی مرکزی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس کی دنیاوی اہمیت کا باب ختم ہوا اور اس کی روحانی عظمت دینی شکوہ اور مذہبی شان و شوکت کا نقش ابھرا تو کچھ بے جا نہ ہو گا یعنی ٹھیک اس زمانہ میں سندھ کا خطہ سلسلہ تصوف کے مشہور خانوادہ سہروردیہ کی ضیاء باریوں سے جگمگا اٹھا۔

اوچ کی سرزمین خوش نصیب تھی کہ اگرچہ وہ دنیاوی شان و شوکت کی خوش نمائیوں سے محروم ہو گئی تاہم علم و معرفت کی باطنی فتح مندیاں اس کے ماتھے کا جھومر بن گئیں۔

بڑے بڑے دارالحکومتوں، عظیم الشان شہروں اور تہذیب و تمدن کے بلند و بالا ایوانوں کو وہ سرافرازی کہاں نصیب جو ان خستہ تنوں اور سوختہ سامانوں کے مقبروں اور مزاروں کو میسر ہے۔ جن کے دلوں کے اُجڑے دریا اگر کسی کی محبت کا نشیمن بن سکے تو وہ صرف اس کی ذات قدسی صفات تھی جس نے اپنے پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اپنے برگزیدہ بندوں کو یہ خبر دی تھی کہ " انا عند المنکسرۃ قلوبھم" یعنی در کوئے ما شکستہ دلی می خرند و بس:

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ صاحب نظراں خواہد بود

سلسلۂ گاذرونیہ

برصغیر ہند و پاک میں صرف اوچ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بہ یک وقت چار خانوادہ ہائے طریقت کا اوّلین مہبط بننے کا شرف اسے حاصل ہوا ہے۔ ان میں سب سے پہلا سلسلہ گاذرونیہ ہے جو حضرت بابا ابو اسحاق گاذرونی علیہ الرحمۃ سے منسوب ہے۔ حضرت شیخ ابو اسحاق گاذرونیؒ کا اصل نام ابراہیم تھا۔ اور وہ نسلاً عجمی تھے۔ ان کا آبائی وطن ایران ہے۔ طریقت میں وہ شیخ ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی الاکار سے بیعت تھے۔ شیخ ابو اسحاق گاذرونی کمالات علمیہ و عملیہ کے جامع تھے۔ جب انہوں نے پہلے پہل تصوف کے راستہ پر قدم رکھا اور جذبہ عشق الہٰی کی آگ ان کے سینے میں روشن ہوئی تو انہیں اپنے وقت کے تین نامور صوفی بزرگوں سے عقیدت و محبت پیدا ہوئی۔ یہ تینوں بزرگ شخصیتیں عبداللہ خفیف، حارث اسبی اور ابو عمرو تھیں۔ شیخ ابو اسحاق گاذرونی ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ان میں سے کس بزرگ سے سلسلہ ارادت و بیعت استوار کریں کہ اس اثنا میں انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ابو عبداللہ خفیف کے کتب خانے میں سے بہت سی کتابیں اونٹ پر لاد کر ان کے پاس لایا ہے۔ جب بیدار ہوئے تو خواب کی تعبیر انہیں مل گئی۔ شیخ ابو علی حسین الاکار ان کے لئے شیخ ابو عبداللہ خفیف کی کتابیں لے کر آئے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر شیخ ابو اسحاق گاذرونی نے حضرت شیخ الاکار سے بیعت کر لی۔

شیخ ابو اسحاق گاذرونیؒ بڑے پایہ کے بزرگ اور بڑے صاحب کرامت تھے۔ ان کی کرامت کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ان کے عہد کا ایک دیلمی سردار

میر ابوالفضل شراب کا بڑا رسیا تھا۔ ایک روز جب وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا " شراب پینے سے توبہ کر لے "۔ اس نے عرض کیا "حضرت میں وزیر فخر الملک کا ہم نشین ہوں۔ وہ شراب پیتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کی مجلس میں مجھے بھی شراب پینی پڑے اور میری توبہ ٹوٹ جائے" شیخ نے ارشاد فرمایا " تم توبہ کرو اور اگر اس کے بعد کسی مجلس میں وزیر فخر الملک تمہیں شراب پینے پر مجبور کرے تو مجھے یاد کر لینا۔ میر ابوالفضل دیلمی نے شراب نہ پینے کا پختہ عہد کیا اور پھر ایک روز وزیر مذکور کی مجلس میں جب اسے شراب پیش کی گئی تو اس نے اپنی توبہ کا ذکر سنایا اور کہا کہ مجھے تو آپ اس سے معذور رکھیں وزیر در پئے اصرار ہوا۔ ناچار میر ابوالفضل نے شیخ ابو اسحاق گازرونی کی ہدایت کے مطابق تصوّر میں ان کو یاد کیا۔ اچانک ایک بلّی کودی اور شراب کی صراحی کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ ساری مجلس درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ ابوالفضل اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا۔ دیر تک روتا رہا۔ وزیر نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ فخر الملک نے شیخ کی یہ کرامت دیکھی تو میر ابوالفضل سے از خود کہا کہ اپنی توبہ پر کاربند رہو اور کبھی شراب کے قریب مت پھٹکنا۔"

کہتے ہیں کہ ۲۴ ہزار اشخاص حضرت شیخ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور ایک لاکھ افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور معصیت الٰہی کی روش سے تائب ہوئے۔ حضرت شیخ نے اپنے مریدین و معتقدین کا ایک دفتر تیار کر رکھا تھا۔ جن میں ان کے نام درج تھے۔ آپ کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ :-

" آزاد کردنِ بندگان مذہب من نیست بلکہ بندہ گردانیدن آزادگان مذہب من است "

"غلاموں کو آزاد کرنا میرا مسلک نہیں ہے۔ میں تو آزاد لوگوں کو حق کا غلام بناتا ہوں"

حضرت شیخ ابو اسحاق گازرونیؒ حضرت علی الہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ لاہوری)

کے معاصر تھے مگر ان دونوں میں ملاقات ثابت نہیں ہے۔ حضرت شیخ کا وصال ذیقعدہ کے مہینے میں ۴۲۶ھ میں گازرون میں ہوا۔ آپ کے بھانجے حضرت سید صفی الدین گازرونیؒ اپنے ماموں اور مرشد کے حکم پر ۴۲۰ھ میں اوچ تشریف لائے۔ ہم نے "اوچ کی علمی شخصیتوں" کے ضمن میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے۔

خانوادۂ سہروردیہ

سلسلۂ سہروردیہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ پر منتہی ہوتا ہے اور نسبت سہروردیہ شیخ وقت حضرت ضیاءُ الدین ابو نجیب عبدالقادر سہروردی اور ان کے بھتیجے اور مرید خاص حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی کے نام سے منسوب ہے۔

اس سلسلہ کو فروغ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ہی کی ذات گرامی سے ہوا۔ وہ بڑے پایہ کے بزرگ اور صاحب تصنیف صوفی تھے۔ برّ صغیر میں ان کے نامور خلفاءؒ میں حضرت مخدوم نوح بکھریؒ، حضرت قاضی حمیدالدین ناگوریؒ شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ اور حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے اسماءگرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مشہور ایرانی شاعر شیخ سعدی شیرازیؒ بھی اسی آستانۂ عالیہ سے وابستہ تھے جیسا کہ خود انہوں نے اپنی اس نسبت کا اظہار اپنے بعض اشعار میں کیا ہے۔

مرا پیر دانائے روشن شہاب ۔۔۔ دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آں کہ بر غیر بد بین مباش ۔۔۔ دوم آنکہ بر خویش خود بین مباش

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ زہد و اتقا اور اتباع سنت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ انہوں نے مختلف علوم الٰہیہ پر کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان کی سب سے مشہور اور اہم تصنیف عوارف المعارف ہے جو تصوّف کے موضوع پر بڑی جامع اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ شیخ کا وصال بغداد میں یکم محرم

الحرام ۶۳۲ ھ / ۱۲۳۴ء میں ہوا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نسباً صدیقی تھے مشہور مورخ ابن خلکان نے آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ ابو حفص عمر بن محمد بن عبداللہ بن محمد عمویہ بن سعد بن حسین بن قاسم بن علقمہ بن نصر بن معاذ بن عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیقؓ۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی ولادت قصبہ سہرورد میں ۵۳۶ھ میں رجب کے مہینے میں ہوئی۔ سہرورد کا قصبہ عراق کے پہاڑی علاقہ میں اس راستہ پر واقع ہے جو آذر بائیجان کو جاتا ہے۔ یہ بستی کردوں کے زیر تصرف تھی کردوں کو راہِ راست پر لانے میں سہروردی مشائخ کا بھی بڑا حصہ ہے۔

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ ۱۱ برس کی عمر میں بغداد پہنچے جہاں انکے عم گرامی حضرت شیخ ضیاءالدین ابو نجیب عبدالقاہر سہروردیؒ کا سلسلۂ تدریس و ارشاد قائم تھا۔ حضرت شہاب الدین سہروردی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے فیوض سے بھی استفادہ فرمایا۔ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ بھی کچھ عرصہ آپ کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ آپ مسلکاً شافعی تھے۔

حضرت مخدوم نوح بکھریؒ

سہروردی سلسلہ طریقت و تصوف کے اولین بزرگ جو اس برصغیر میں تشریف لائے حضرت مخدوم نوح بکھری تھے۔ تحفۃ الکرام کی روایت کے مطابق "شیخ نوح بکھری سروری از اجلہ اولیاء سندھ و اکمل مریدان شیخ شہاب الدین سہروردیست"[1]۔

ترجمہ:۔ شیخ نوح بکھری سروری سندھ کے جلیل القدر بزرگ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے کامل ترین مرید تھے۔ آپ حضرت بہاؤالحق زکریاؒ

---

[1] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۱۲

ملتانی سے بھی پہلے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل فرما کر بکھر تشریف لائے اور بے شمار بندگانِ خدا کو تصوف و معرفت کا آپ نے درس دیا۔

حضرت زکریا ملتانیؒ جب اپنے مرشد حضرت شہاب الدین سہروردی سے جدا ہو کر واپس ملتان تشریف لیجانے لگے تو شیخ نے انہیں رخصت کرتے ہوئے تلقین کی کہ " ہمارے ایک مرید سندھ کے ایک شہر بکھر میں اقامت پذیر ہیں۔ ان سے ضرور ملیں کیونکہ وہ چراغ بتی اور تیل ساتھ لائے تھے۔ اور انہیں صرف روشن کرنے کی ضرورت تھی "

لیکن حضرت زکریا ملتانیؒ کی آمد سے قبل ہی حضرت مخدوم نوح بکھریؒ کا وصال ہو چکا تھا۔ حدیقۃ الاولیاء میں آپ کی جلالت شان کے بارے میں مرقوم ہے کہ

" آں بزرگوار نامدار سر دفتر مشائخ کبار صاحب توفیق فارس مضمار تحقیق شیخ الشیوخ نوح بکھری قدس سرہٗ از جملہ اولیائے کرام و مشائخ عظام سندھ بود از خرقۂ مقبولان درگاہ و باریافتگان خلوت محبت اللہ دست ارادت از شہاب الحق والدین برہان الصدق و الیقین شیخ شہاب الدین گرفتہ "

ہندوستان میں خانوادۂ سہروردیہ کے جلیل القدر مشائخ جنہوں نے براہِ راست بانیٔ سلسلہ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ سے اکتساب فیض کیا۔ ان میں شیخ نوح بکھریؒ کے علاوہ قاضی حمیدالدین ناگوریؒ ، شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ ، شیخ بہاالحق زکریا ملتانیؒ ، شیخ جلال الدین تبریزی اور حضرت سید جلال سرخ بخاری کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ حضرت سید جلال سرخ بخاری کو خرقۂ خلافت اگرچہ حضرت زکریا ملتانیؒ سے حاصل ہوا تاہم سب سے پہلے آپ نے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے ہاتھ پر بیعت ارادت کی۔

شیخ نوح بکھریؒ کا مختصر سا تذکرہ ہم ابتدا میں کر چکے ہیں اور حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کا تذکرہ ایک مستقل باب چاہتا ہے اس لئے سردست ہم یہاں مذکورۃ الصدور سہروردی مشائخ کا اجمالی تذکرہ کر رہے ہیں۔

شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے اجلہ خلفاؒ میں سے تھے۔ شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں دہلی کے شیخ الاسلام کے منصب جلیلہ پر فائز رہے آپ میر دہلی کے نام سے معروف تھے۔

فوائدالفواد میں حضرت نظام الدین محبوب اولیاؒ دہلوی سے منقول ہے کہ قحط سالی کے ایام میں جب کہ امساک باراں ہوتا تھا لوگ آپ سے آکر دُعا کی استدعا کرتے۔ آپ دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ حق میں عرض کرتے۔

"خدایا اگر تُو نے بارش نہ برسائی تو میں کسی آبادی میں نہیں ٹھہروں گا۔"

فوراً بارش برسنے لگتی۔ آپ کا وصال ۶۳۲ھ میں ہوا۔ مزار مبارک حوض شمسی دہلی کے مشرقی جانب واقع ہے۔

شیخ حمیدالدین ناگوریؒ

التمش کے دور کے سربرآوردہ بزرگوں میں سے تھے۔ آپ نے بھی خرقۂ خلافت و اجازت حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے حاصل کیا۔ سماع کے بڑے رسیا تھے۔ اس پر اس دور کے ظاہربین علماؒ نے آپ پر سخت رد و قدح کی اور آپ کے خلاف فتووں کا ایک طومار کھڑا کر دیا۔ اس دور میں طبقات ناصریہ کے مصنف علامہ منہاج سراج ناگور کے قاضی القضاۃ تھے۔ وہ خود بھی صاحب وجد و حال بزرگ تھے ان کی سفارش پر آپ کی گلو خلاصی ہوئی۔ آپ

کا انتقال ۶۴۱ھ/۱۲۴۳ء میں ناگور میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کے خلفاءؒ میں شیخ شاہی روشن تاب اور شیخ احمد نہر والی مشہور ہیں جن کا وصال ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء میں بدایوں میں ہوا۔

حضرت خواجہ بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ

حضرت زکریا ملتانیؒ ۵۶۶ھ/۱۱۷۰ء میں قصبہ کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ سال کی عمر میں والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ خراسان اور بخارا میں علوم متداولہ کی تحصیل کی زیارت حرمین سے مشرف ہوئے اور بغداد پہنچ کر حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے واپس تشریف لائے اور ملتان میں قیام فرمایا۔ ناصرالدین قباچہ سے آپ کے تعلقات کشیدہ رہے۔ بعد میں جب التمش حکمران بنا تو اس نے آپ کو شیخ الاسلام مقرر کیا۔ اوچ کی روحانی ترقی میں حضرت مخدوم بہاالحق زکریا ملتانیؒ کا بھی بالواسطہ بڑا عمل دخل رہا ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب آپ حصول علم کی غرض سے بخارا میں مقیم تھے تو آپ کے تعلقات سادات بخارا سے استوار ہوئے اور پھر یہی تعلق خاطر حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کے ہندوستان تشریف آوری اور بعد ازاں اوچ میں آپ کے قیام کا باعث بنا۔ حضرت شیخ زکریاؒ کا وصال ملتان میں ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں ہوا۔

شیخ جلال الدین تبریزیؒ

آپ خواجہ ابو سعید تبریزیؒ کے مرید تھے مگر ایک مدت تک حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اکتساب فیض کرتے رہے۔ شمس الدین التمشؒ کے عہد میں دہلی تشریف لائے۔ کچھ عرصہ دہلیؒ میں قیام کے بعد بنگال تشریف لے گئے۔ آپ کے دست حق پرست پر بنگال کے

ہندو بالخصوص بدھ مت کے پیرو کثرت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ کا انتقال ۶۴۲ھ / ۱۲۴۴ء میں بنگال ہی میں ہوا۔ آپ دیوتلہ میں مدفون ہیں جہاں چلے اور لنگر خانہ کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

ان مذکورۃ الصدر حضرات مشائخ سہروردیہ کے علاوہ بھی بہت سے فیضیافتگان سلسلہ اس برصغیر میں وارد ہوئے جن میں حضرت مولانا مجدالدین جن کا مزار قطب صاحب کے قریب ہے اور سن وفات ۶۴۰ھ ہے۔ حضرت شیخ ترک بیابانی جن کا مزار قلعہ کہنہ کے قریب واقع ہے۔ حضرت شیخ ضیاءُ الدین رومی جن کا مزار پرانی دلّی میں اور جن کا سن وفات ۶۷۱ھ ہے کے نام قابل ذکر ہیں۔ [۲]

شیخ محمود فاروقیؒ

ہندوستان میں خانوادہ سہروردیہ کے نقیب و داعی حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریاؒ ملتانی کے ننھیالی بزرگوں میں ایک نام شیخ محمود اچی کا ملتا ہے جو اپنے وقت کے بہت بڑے عارف باللہ اور ولی کامل تھے اور جن کی مستقل سکونت اوچ میں تھی۔ تاریخی تذکروں میں مرقوم ہے کہ حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے جد امجد سلطان کمال الدین ابوبکر کے ہاں ان کی پہلی بیوی سے جو غزنی کے ایک رئیس سکندر کی

---

[۱] حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قیام دہلی کے دوران ان کے تعلقات دہلی کے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ سے کشیدہ ہوگئے۔ نجم الدین صغریٰ بدباطن شخص تھا۔ اس نے آپ پر طرح طرح کے بہتان تراشے جس سے بددل ہو کر آپ نے دہلی چھوڑ دی۔ کہتے ہیں اس نے ایک مطربہ کے ساتھ آپ کو زنا کی تہمت سے متہم کیا۔ دہلی سے روانہ ہو کر ابھی آپ بدایوں پہنچے تھے کہ دہاں دریا کے کنارے آپ نے اچانک فرمایا کہ آؤ نجم الدین صغریٰ کی نماز جنازہ پڑھیں اس نے ہمیں دہلی سے نکلوایا تھا۔ ہمارے پیر و مرشد نے اسے دنیا سے نکال باہر کیا۔ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب دہلی میں نجم الدین صغریٰ کا انتقال ہوا۔ (مرآۃ الاسرار سیر العارفین)

[۲] مرآۃ الاسرار، اخبار الاخیار

صاحبزادی تھی، کوئی اولاد نہ تھی۔ جب اس عفیفہ کا انتقال ہوا تو مصاحبین نے مختلف رشتوں کی تحریک کی مگر حضرت خاموش رہے۔ ایک دفعہ آپ مراقبہ میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً آپ نے سر اٹھایا اور اپنے مصاحب خاص مسعود بن عرب کی طرف دیکھ کر فرمایا

"مسعود بابا! در لوح چنیں نوشتہ دیدہ ام کہ معصومہ شیخ محمود اوچی کہ نسب نسل او از قبیلہ فاروقی است در عقد نکاح نصیب مایاں است و ازاں دو فرزند متولد خواہند شد یکے شیخ احمد، دوم شیخ محمد دہر دورا درجات چنداں از قدرت ذوالجلال عطاست کہ حدے و نہایتے نہ دارد و از اولاد شاں کرسی بہ کرسی ولادت عارف باللہ و رئیس اولیأ خواہد شد:

(منبع البرکات) بحوالہ "بہاؤ الدین زکریا" از مولانا نور احمد فریدی

ترجمہ:۔

میں نے لوح تقدیر میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ شیخ محمود اوچی کی با عصمت صاحبزادی ہمارے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گی اس سے دو لڑکے پیدا ہوں گے۔ ایک کا نام شیخ احمد ہوگا اور دوسرے کا شیخ محمد۔ یہ دونوں بلند مرتبہ اور صاحب کمال ہوں گے اور ان کی اولاد سے عارف باللہ اور رئیس الاولیأ پیدا ہوں گے۔"

شیخ محمود فاروقی کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں نہ ان کی تاریخ پیدائش اور سنِ وفات کسی کتاب میں مذکور ہے۔

خانوادۂ بخاریہ

مخدوم سیّد جلال الدّین سُرخ بخاریؒ

خانوادۂ سہروردیہ کے گوہر شب چراغ حضرت خواجہ بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ جب طلب علم کے لئے بخارا میں مقیم تھے تو وہاں ان کے مخلصانہ روابط ایک عالی نسب گھرانہ سے ہوئے جس کے سربراہ سید علی بن جعفر تھے۔ سید علی اس نوجوان طالب علم میں آثار ولایت دیکھ کر اس کے گرویدہ ہو گئے اور جب مخدوم زکریا ملتانیؒ بخارا سے واپس ملتان تشریف لائے تو یہ تعلقات کچھ اور زیادہ پائیدار ہو گئے۔ سید علی آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے اور ہمیشہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے، سید علی کے نوجوان صاحبزادہ سید جلال بھی اپنے والد ماجد کی طرح اس بزرگ کی عظمت کے معترف تھے۔ چنانچہ باوجودیکہ وہ دور بڑا پُر آشوب تھا اور راستہ انتہائی خطرناک۔ مگر حضرت سید جلال سرخ بخاری کو یہی عقیدت کشاں کشاں ہندوستان لے آئی۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے عقیدت و محبت بھی اس دوستی کی قدر مشترک تھی جو سید جلال سرخ بخاریؒ اور حضرت زکریا ملتانیؒ کے درمیان قائم ہوئی



اوچ بخاریہ اوچ کے اولین بزرگ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ کی خانقاہ کا منظر

اور جس نے آگے چل کر انہیں مرید و مرشد کے رشتہ میں جوڑ دیا۔ مشہور مورخ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی اپنی کتاب 'تحفۃ الکرام' میں لکھتے ہیں کہ

سید جلال الدین بخاری جنہیں سید جلال الدین سرخ بخاری کا لقب حاصل ہے وہ شیخ بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے مرید اور یار ہیں۔ یہ بزرگ آپس میں چار یار کہلاتے تھے

۱۔ شیخ بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ

۲۔ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

۳۔ سید عثمان مروندی لعل شہباز قلندر

۴۔ سید جلال سرخ بخاریؒ

حضرت سید جلال سرخ بخاری کی ولادت با سعادت ۵۹۵ھ میں بخارا میں ہوئی۔ آپ کے والد گرامی حضرت سید علی ابوالمؤید بن جعفر حسینی سادات کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت موصوف کی ابتدائی تعلیم و تربیت بخارا میں اپنے والد ماجد کی نگرانی میں ہوئی۔ بخارا میں آپ کی شادی سید قاسم بخاریؒ کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی جس کے بطن سے آپ کے دو فرزند سید علی اور سید جعفر پیدا ہوئے۔ ۶۳۵ھ میں آپ اپنے دونوں صاحبزادوں کو ساتھ لے کر بھکر پہنچے۔ چونکہ آپ کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے آپ کی دوسری شادی بھکرؔ کے ایک مشہور

ؔ بھکر سندھ کا ایک قدیم شہر ہے جو سندھ کی رائے حکومت کے بعد اس وقت آباد ہوا جب سندھ کا قدیم دارالسلطنت الور ویران ہوا۔ الور کی کچھ آبادی اسی جگہ آکر بس گئی۔ پھر اسی آبادی کو بھکر کہا جانے لگا۔ (تحفۃ الکرام ج ۳ صفحہ ۱۲۴)۔ بھکر ایک خوب صورت شہر تھا۔ دریائے سندھ کے بیچوں بیچ ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ دوسری صدی ہجری میں اس شہر کو مسلمانوں نے بسایا اور اس کا نام منصورہ رکھا پھر یہ اجڑ گیا۔ اس کی دوبارہ آبادی چھٹی صدی ہجری میں ہوئی۔ جب سید بدرالدین کے جدامجد سید محمد بن شجاع مکی یہاں رونق افروز ہوئے۔

(جنۃ المشرق سنہ ۹ مجمع الامکنہ صـ ۱۳)

بزرگ حضرت سید بدرالدین بن صدرالدین حسینی کی صاحبزادی زہرہ سے انجام پائی۔ ؎

اخبارالاخیار میں شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس رشتہ کے بارے میں یہ

؎ تاریخ اوچ میں مولوی حفیظ الرحمن نے "چاہ کلہ والا" نام کے ایک کنوئیں کا ذکر کیا ہے، جو بدرالدین نامی کسی بزرگ کے کہنے سے چلنے لگ جاتا تھا۔ جب سید جلال سرخ بخاری اوچ پہنچے اور آپ نے یہ کیفیت دیکھی تو کنوئیں کو رکنے کا حکم دیا۔ اسی حکم کو سنتے ہی کنواں رک گیا۔ جب بدرالدین مذکور کو علم ہوا تو انہوں نے کہا: اوچ کا اصل مالک آ گیا ہے۔ اب یہ کنواں انہی کی اجازت سے چلے گا۔ ممکن ہے یہ بدرالدین وہی بھکر والے بزرگ ہوں یا یہ اوچ کے کوئی اور صاحب تصرف بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

؎ سید بدرالدین بھکر کے نامور بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد ہے۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے۔ پہلے پہل آپ کے جد امجد سید محمد بن شجاعؒ مکہ مکرمہ سے بھکر تشریف لائے۔ سید محمد بن شجاعؒ کا سن پیدائش ۵۰۳ھ ہے۔ بھکر کی دوبارہ آبادی آپ ہی کے دم قدم سے ہوئی۔ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں آپ بھکر تشریف لائے تو یہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں ملتا تھا۔ آپ نے یہاں قیام فرمایا اور گائے ذبح کی۔ گائے کو عربی میں "بقرۃ" کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ جگہ "بقر" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ پھر بگڑتے بگڑتے "بقر" سے بھکر بن گیا۔ تحفۃ الکرام کی روایت ہے کہ جب آپ بھکر پہنچے تو بے ساختہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ صادر ہوئے۔ "جعل اللہ بکرتی فی البقعۃ المبارکۃ" اللہ نے ایک بابرکت مقام پر میری صبح کی۔ عربی میں صبحدم کو بکرۃ کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام "بکرہ" پڑ گیا جو بعد میں زبان زد عام ہو کر بھکر بن گیا۔ سید بدرالدین کے والد ماجد کا نام بھی محمد تھا۔ آپ کے صاحبزادے سید علی اپنے والد کی وفات کے بعد بھکر سے جہانسی منتقل ہو گئے وہاں آپ کی اولاد و احفاد کی کثیر تعداد ہوئی۔ سید بدرالدین نے اپنی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کے عقد میں دیں۔ سید بدرالدین کا انتقال ۶۸۰ھ میں بھکر میں ہوا اور وہیں آپ کا مزار مبارک ہے۔

نقل کی ہے کہ:۔

"گویند کہ در خواب از جانب حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم مبشر شد تبزوج صغیرہ سید بدرالدین و سیّد بدرالدین نیز بہ ایں دولت بشارت یافت جگر گوشہ خود را بہ وے عقد تزویج بست و ازاں جا بہ جہت حسد و نزاع اخوان بجانب اوچہ تشریف آوردند"۔

یعنی اس نکاح کی بشارت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ سے آپ کو ملی تھی اور خواب میں اس بشارت سے سید بدرالدین کو بھی نوازا گیا۔ پھر خویش و اقارب کے رشک و حسد کی بنا پر آپ بھکر کی سکونت ترک فرما کر اوچ تشریف لے آئے۔ سید بدرالدین بھکری کی بڑی صاحبزادی زہرہ کے انتقال کے بعد آپ کی دوسری شادی بھی سید موصوف ہی کی دوسری صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی۔ جن کے بطن سے آپ کے دو صاحبزادے احمد اور محمدؐ ہوئے۔

بخارا سے آپ کے نقل مکانی کا سبب ایک قلمی کتاب "انساب جلالی" میں یوں مذکور ہے کہ وہاں کے حکمران گروہ سے آپ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ آپ بخارا کی سکونت چھوڑ کر مشہد آ گئے۔ مشہد میں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ نے ایران سے ہندوستان کا رُخ کیا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب سمرقند و بخارا پر تاتاریوں کی یلغار شروع ہوئی۔ ۶۱۷ھ میں چنگیز خاں تاتاری نے جس کا اصلی نام تموجین تھا، بخارا فتح کر لیا۔ اس نے صرف شہر کی لوٹ مار پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ بخارا کے باشندوں پر سخت ظلم و زیادتی سے کام لیا، شہر کو آگ لگا دی۔ مسجدوں کی بے حرمتی کی اور کلام اللہ کے اوراق کو پھاڑا اور جلایا۔ اسی ہنگامہ دارو گیر میں غالباً حضرت والا بخارا سے ایران منتقل ہوئے۔

یہ جو مشہور ہے اور تاریخ اوچ میں مولوی حفیظ الرحمان نے بیان کیا ہے کہ "حضرت سید جلال سرخ بخاری نے چنگیز خاں کو قبول اسلام کی دعوت دی اور اس

نے غضبناک ہو کر آپ کو آگ میں زندہ جلا دینے کا حکم صادر کیا مگر قدرت الٰہی سے آگ نے آپ پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کرامت کو دیکھ کر چنگیز خاں مسلمان ہو گیا۔ اس نے اپنا نام جہانگیر خاں رکھ لیا۔ اور اپنی لڑکی بھی حضرت کے نکاح میں دے دی جس کا نام "زینب" تھا مگر اس بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی"۔ یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے بالکل بے بنیاد ہے۔ بعض تذکروں میں آپ کو آگ میں ڈالنے کا حکم دینے کی روایت تو ملتی ہے مگر چنگیز خاں کے مسلمان ہونے کا واقعہ کسی مستند تاریخی کتب میں نہیں ملتا۔ چہ جائیکہ اس نے اپنی لڑکی بھی آپ کے عقد میں دے دی ہو۔

بعض بزرگ شخصیتوں کے بارے میں لوگوں نے جوشِ عقیدت میں آ کر وہ وہ افسانہ طرازیاں کی ہیں کہ جنہیں بداہت عقل بھی صحیح تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے تاہم واعظوں، قصہ خوانوں اور تیسرے درجہ کے داستان گویوں نے نہ صرف ان افسانوی روایات کو زیب داستان بنایا ہے بلکہ ان کی بنیاد پر ایسے ایسے مفروضے اختراع کئے کہ باید و شاید۔

ایران میں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ اثنائے سفر میں آپ کے قافلہ کے ایک ساتھی نے اشرفیوں کی ایک تھیلی بطور امانت آپ کے سپرد کی اور کہا کہ میں ہندوستان پہنچ کر آپ سے یہ لے لوں گا۔ راستے میں وہ تھیلی چوروں کی نذر ہو گئی۔ اس کا علم تھیلی کے مالک کو بھی تھا مگر اس نے بطور آزمائش کے بھکر پہنچ کر آپ سے اپنی اشرفیوں کی تھیلی طلب کی۔ جب اس کا تقاضا شدید ہوا تو آپ اسے لے کر لبِ آبِ دریا پہنچے اور پانی میں ہاتھ ڈال کر عین وہی تھیلی نکالی اور اس کو دے دی۔ وہ شخص آپ کی اس کرامت کو دیکھ کر صدقِ دل سے آپ کا معتقد ہو گیا۔ شدہ شدہ یہ خبر سید بدرالدین بھکری تک پہنچی۔ انہیں آپ سے ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ پہلی ہی ملاقات رابطۂ قلبی استوار کر گئی۔ حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ اپنے مرشد حضرت خواجہ بہاؤالحق زکریاؒ ملتانی کی صحبت میں کم و بیش تیس برس تک قیام پذیر رہے اس کے بعد بھی آپ نے کچھ عرصہ حضرت

زکریا ملتانیؒ کے فرزند گرامی شیخ صدرالدین عارف کے پاس گزارا۔ لبعدازاں آپ اوچ تشریف لائے۔ حضرت شیخ الاسلام زکریاؒ ملتانی کا وصال ۶۶۶ھ میں ہوا ہے۔ اس حساب سے اوچ میں آپکی آمد حضرت ملتانی کی وفات کے بعد ۶۶۵ھ اور ۶۷۰ھ کے درمیان ہوئی ہو گی۔ تاریخ اوچ میں حضرت سید جلال سرخ بخاری کی اوچ میں آمد ۶۴۴ھ بتائی گئی ہے۔ "آب کوثر" میں شیخ اکرام نے بھی اسے نقل کر دیا ہے لیکن حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ وہ فرماتے ہیں

"میرے دادا شیخ الاسلام بہاؤالحق زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے کافی عرصہ بعد اوچ تشریف لائے۔ ؎

ملفوظ المخدوم میں ہے کہ سید جلال سرخ بخاریؒ، حضرت بہاؤالحق زکریاؒ ملتانی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے خطہ اوچ میں سکونت اختیار کی اور متاہل ہوئے۔ ان کے ہاں تین لڑکے پیدا ہوئے۔ سید احمد کبیر، سید بہاؤالدین، سید محمد۔

خزینۃ الاصفیاؒ کے مصنف کی رائے میں یہ تینوں صاحبزادے حضرت سید جلال سرخ بخاری کی وہ اولاد ہیں جو سید بدرالدین بھکری کی دو صاحبزادیوں سیدہ فاطمہ اور سیدہ زہرہ کے بطن عفت سے متولد ہوئے۔ آپ کے دو صاحبزادے سید علی اور سید جعفر کی والدہ بخارا کی تھیں۔ انساب جلالی کی روایت ہے کہ یہ دونوں صاحبزادگان اپنے والد کی آمد سے قبل ہندوستان آ رہے تھے مگر راستے میں کہیں گم ہو گئے اور گو حضرت سید جلال سرخ بخاری نے ان کی تلاش میں ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا مگر یہ دونوں بچے دوبارہ اپنے والد سے نہیں مل سکے۔ خزینۃ الاصفیاؒ نے آپ کے پانچوں صاحبزادوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔

؎ انساب جلالی کے مصنف سید صفی الدین نامی ایک بزرگ ہیں جو نسباً خانوادۂ بخاریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے دونوں بچوں کی گمشدگی کی روایت اپنے بزرگوں سے سنی ہو۔ اس کتاب کا سن تصنیف ۱۰۰۳ھ ہے۔

"این پنج فرزند چوں پنج بنائے اسلام در ولایت و شرافت و خوارق اشتہار داشتند۔"

ترجمہ: یہ پانچوں فرزند جو اسلام کی پانچ بنیادوں کی طرح تھے ولایت، شرافت اور خوارق و کرامات میں شہرت رکھتے تھے۔"

حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاریؒ کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت اور کثرت عطا فرمائی اور آپ کے احفاد امجاد اس برصغیر کے گوشہ گوشہ میں پہنچے۔ حضرت سید احمد کبیر جو آپ کے فرزند کبیر تھے۔ ان کے دو صاحبزادے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور صدر الدین راجو قتال تھے۔ حضرت سید محمد کے چار فرزند تھے۔ سید شمس الدین، سید ابو سعید، سید ابوالکرم اور سید ابوالغیث عبدالقادر۔

آپ کے تیسرے صاحبزادے سید بہاؤ الدین کے ہاں بھی کثیر اولاد ہوئی اور حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاری کی خانقاہ کی سجادگی نویں صدی ہجری تک انہی کے قبضہ میں رہی۔ اس سلسلہ کے آخری بزرگ سید رحمت اللہ شاہ چاند نہ چراغ تھے جنہیں سید احمد کبیر کی اولاد میں سے مخدوم حسن جہانیاں نے بزور شمشیر اس خانقاہ سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا اور سید رحمت اللہ کو اوچ چھوڑنا پڑا!

حضرت سید جلال سرخ بخاری قدس سرہٗ علم و فضل، زہد و اتقاءٗ اور تقوی و طہارت میں بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ نزہۃ الخواطر میں آپ کی جلالت شان اور آپ کی عظمت علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہے۔

وکان عالماً کبیراً عارفاً فقیہاً زاہداً صالحاً منقطعاً الی اللہ سبحانہ وکان یدرس و یفید اخذ عنہ خلق کثیر من العلماء والمشائخ وبارک اللہ تعالیٰ فی ذریتہ الصالحۃ فملؤا آفاق الہند۔

ترجمہ:۔

آپ بہت بڑے عالم، عارف باللہ، فقیہ عابد، زاہد، پارسا اور ساری

دنیا سے کٹ کر صرف اللہ رب العزت کی طرف متوجہ تھے۔ درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ ایک دنیا آپ کے فیوض علمی سے بہرہ ور ہوئی اور بے شمار بندگان خدا نے آپ سے علمی اور روحانی استفادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ پورا ہندوستان جن کے فیوض سے فیضیاب ہوا۔" ان علمی و عملی کمالات کے ساتھ ساتھ تصرفات باطنی بھی آپ کو حاصل تھے۔ تاریخ فرشتہ میں ہے کہ "ملتان کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ جب کہ موسم گرما اپنے عروج پر تھا، دھوپ کی شدت اور موسم کی حدت میں بے اختیار حضرت سید جلال کی زبان سے یہ فقرہ صادر ہوا:"

"آہ یخ بخارا درچنیں حرارت از کجا یابم"

اس گرمی میں بخارا کی برف کہاں ملے گی۔

یہ کہنا تھا کہ مطلع صاف میں دفعۃً ابر نمودار ہوا جو گھٹا بن کر برسا اور مرغی کے انڈوں کے برابر اولے گرنے لگے" حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت فرماتے ہیں "میرے داد کے ہاں لکڑی کا ایک پیالہ تھا۔ جب حضرت مخدوم حجرے کے اندر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوتے تو وہ پیالہ بھی آپ کے ساتھ ذکر کرتا۔ کسی شخص نے حضرت شیخ صدرالدین عارف ملتانی سے پوچھا کہ" حجرے میں حضرت سید جلال سرخ بخاری کے سوا کوئی نہیں ہوتا لیکن آواز سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا دو آدمی ذکر کر رہے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا۔

"پیالہ ان کی موافقت کرتا ہے"

اس کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے متبسم ہو کر فرمایا

"یہ پیالہ اب تک بطور تبرک ہمارے پاس محفوظ ہے"۔ [1]

اوچ میں حضرت جلال سرخ بخاری کی آمد ایک ایسے دور میں ہوئی جبکہ

---

[1] ملفوظ المخدوم و مظہر جلالی

اوچ کے اطراف میں چولستان کا علاقہ ہندوؤں کے قبضہ میں تھا۔ڈیراور ، بھاگلہ اور جیسلیر کے قلعے راجپوتوں کے تصرف میں تھے اور ان کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ساتھ دل آزارانہ اور دشمنی کا تھا۔ حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ نے اپنی روحانی قوت اور ایمان وعمل کی تاثیر سے اطراف و نواحی کے بے شمار کفار کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ راجپوتوں کے متعدد قبائل بھی آپ کی تبلیغی مساعی سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ چولستان کے علاقہ کا ایک راجہ گھلہ بھی حضرت جلال سرخ بخاری کے دست حق پرست پر مسلمان ہوا۔ ریاست بہاولپور کی بیشتر اقوام جن میں پدھر، ڈاہر اور سیال وغیرہ شامل ہیں ان کا اسلام بھی حضرت سید جلال ہی کی مساعی کا رہین منت ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے کہ

"ہزار ہا مخلوق خدارا بہ ہدایت باری حقیقی براہِ راست آورد و شہر جھنگ سیالاں کہ در پنجاب مشہور و معروف است بنا فرمود۔"

ترجمہ:۔ ہزاروں لوگوں کو ہدایت حق سے راہِ راست پر لائے اور شہر جھنگ سیالاں کی جو پنجاب کا مشہور ضلع ہے، بنیاد بھی آپ ہی نے رکھی۔

ڈیراور کا قلعہ اس زمانہ میں جیسلیر کی حدود میں تھا۔ یہاں کا راجہ کافر تھا

ؔ تاریخ اوچ مصنفہ مولوی حفیظ الرحمن میں مشہور تاتاری سردار چنگیز خاں کے قبول اسلام کا واقعہ درج ہے جو حضرت سید جلال سرخ بخاری کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوا۔ لیکن یہ واقعہ تاریخی حقائق کی رُو سے صراحاً غلط ہے اس لئے کہ چنگیز خاں کا عہد آپ سے پہلے کا ہے پھر یہ کہ کسی ایک تاریخی کتاب سے بھی چنگیز خاں کے مسلمان ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔ تاریخ اوچ میں حضرت سید جلال سرخ بخاری کا چنگیز خاں کی لڑکی سے شادی کا افسانہ بھی بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بھی محض بے بنیاد ہے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ چنگیز کے پوتے ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر مسلمانوں کی سلطنت کو تاخت وتاراج کیا۔ البتہ ہلاکو کا پوتا اباقا خاں مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس کی اولاد نے بعد میں ترکی کی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

ایک مرتبہ تبلیغی سفر میں آپ کا گزر اس مقام سے ہوا، پوچھا " یہاں کوئی مسلمان بستا ہے؟" نفی میں جواب پا کر فرمایا کہ راجہ کی بیوی جو حاملہ ہے اس کے پیٹ کا بچہ مسلمان اور ولی اللہ ہوگا۔ راجہ کو جب اس پیشگوئی کا علم ہوا تو اس نے بچہ پیدا ہوتے ہی اسے ڈیراور کے قریب ریت کے ایک تودے پر پھنکوا دیا۔

یہ بچہ قدرت حق کی عنایات مخفیہ سے زندہ رہا اور آگے چل کر چن پیر یا چھنن پیر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ راجکمار بڑا ہو کر اسلام کا مبلغ ثابت ہوا۔ ریاست بہاولپور کے اس بے آب و گیاہ خطہ میں ہر سال موسم بہار میں بڑا زبردست میلہ لگتا ہے جو کئی روز تک جاری رہتا ہے۔

حضرت سید جلال سرخ بخاری کا سلسلہ نسب نو واسطوں سے امام محمد تقی تک پہنچتا ہے۔ شجرۂ نسب حسب ذیل ہے۔

جلال الدین حسین بن علی بن جعفر بن محمد بن محمود بن احمد بن عبداللہ بن علی بن جعفر بن علی بن محمد بن امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن امام زین العابدین علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ۔[1]

اوچ میں حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ نے خانقاہ بخاریہ کی بنیاد رکھی۔ اس خانقاہ میں علمی اور روحانی استفادہ کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور اس کثرت سے رجوعِ خلق حضرت شیخ کی جانب ہوا کہ بہت جلد اوچ کا وہ حصہ جہاں حضرت والا فروکش ہوئے تھے، اوچ بخاری کے نام سے دور و نزدیک مشہور ہو گیا۔

یہاں حضرت مخدوم کے حالات کے ضمن میں اس غلط بیانی کا ازالہ بھی ضروری ہے جو بہاول پور گزیٹیئر آف انڈیا، امپریل گزیٹیئر آف انڈیا، تاریخ اوچ اور " آبِ کوثر" میں کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا تمام کتابوں میں حضرت مخدوم کی اوچ

---

[1] نزہتہ الخواطر

میں آمد کا سال ۱۲۴۴ء بتایا گیا ہے۔ جس کی تردید ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ایک افسانہ جسے ان سب کتابوں میں دُہرایا گیا ہے اور معجم الامکنہ نے بھی اسے ہُو بہُو نقل کر دیا ہے کہ جب حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ اوچ میں وارد ہوئے تو اس بستی کا نام دیو گڑھ تھا اور یہاں کا حکمران راجہ دیو سنگھ تھا۔ یہ روایت بھی اس لئے غلط ہے کہ اوچ ناصرالدین قباچہ کے عہد میں اس کا پایۂ تخت تھا، ازاں بعد شمس الدین التمش اور اس کے جانشین اس شہر پر حکمران رہے اور اسی عہد میں حضرت سید جلال سرخ بخاری کا اوچ میں ورود ہوا ہے اس لئے آپ کے عہد میں اوچ کا نام دیو گڑھ ہونا بعید از فہم ہے۔ اوچ کے ناموں کی بحث میں ہم اس پر مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ ۹۵ سال کی عمر میں ۱۹ جمادی الاولیٰ مطابق ۲۰ مئی ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء حضرت جلال سرخ بخاری کا وصال ہوا۔ تاریخ وفات لفظ "مخدوم" سے برآمد ہوتی ہے۔

اس زمانہ میں اوچ ایک وسیع و عریض شہر تھا جس کی حدود دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اوچ سے چھ کوس کے فاصلہ پر جو قصبہ چناب رسول پور کے نام سے مشہور ہے وہ بھی اوچ ہی میں شامل تھا۔ اور حضرت مخدوم کا قیام اسی حصہ میں تھا وہیں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں مزار بنا۔ دریا کی طغیانی نے اس حصہ کو متاثر کیا، چنانچہ آپ کے جسدِ مبارک کو یہاں سے سیونک بیلا منتقل کر دیا گیا یہ علاقہ بھی دریا کی زد میں آگیا چنانچہ یہاں سے آپ کو صدرالدین راجو قتال کے مزار سے متصل دفن کیا گیا۔ پھر مخدوم محامد نو بہار اول نے ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء میں آپ کے جسدِ اطہر کو کانی ہنگامے کے بعد اس جگہ دفن کیا جہاں آجکل آپ کا مزار مبارک ہے۔ مقبرہ کی موجودہ عمارت نواب بہاولپور بہاول خاں ثالث نے تعمیر کروائی۔ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ خانوادۂ سہروردیہ کے علاوہ خانوادۂ حسینیہ کے سربراہ بھی تھے۔ خانوادہ حسینیہ بخاریہ کا شجرۂ طریقت وہی ہے جو حضرت مخدوم کا شجرہ نسب ہے۔ آپ کو اس سلسلہ میں خرقۂ خلافت اپنے والد محترم سید علی

سے حاصل ہوا جو بخارا کے نامور اصحابِ طریقت میں سے تھے لیکن آپ کو حضرتِ غوث العالم بہاؤ الحق زکریا ملتانیؒ سے جو تعلق خاطر تھا اس کی بنأ پر آپ کی نسبت سہروردیہ کی شہرت زیادہ ہوئی۔

آپ کے جلیل القدر خلفأ میں آپ کے فرزند سید احمد کبیر سے اس سلسلہ کو فروغ نصیب ہوا۔

استدراک

حضرت سید جلال سرخ نوراللہ مرقدہٗ کے ابتدائی حالات زندگی جن کا تعلق بخارا کی سرزمین سے ہے۔ ان کا تذکرہ ایک قلمی کتاب "انسابِؒ جلالی" میں کسی قدر تفصیل سے مذکور ہے۔ اس کتاب کو سید صفی الدین محمد شاہ بخاری نے ترتیب دیا ہے جو غالباً دسویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں اور اوچ کے خانوادہ بخاریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"حضرت امیر کبیر مخدوم سید حسین جلال قدس سرہٗ بن سلطان بن سید ابو علی

ؒ "انساب جلالی" کا سن کتابت جو اس کتاب پر درج ہے ۱۰۰۳ھ ہے۔ اس حساب سے اس کی تحریر تقریباً پونے چار سو سال پرانی ہے اور تصنیف یقیناً اس سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ مصنف کتاب کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ غالباً گمان یہ ہے کہ دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ کاتب تحریر کا نام سید رحمت اللہ ہے۔ یہ کتاب صادق آباد کے ایک باذوق زمیندار میرزاہد حسین صاحب کے قیمتی کتب خانہ کی زینت ہے۔ کتاب خط نستعلیق میں ہے مگر آخری صفحہ شکستہ خط میں ہے۔ جا بجا کتاب پر حواشی بھی دیئے ہیں۔ کتاب کالی روشنائی سے لکھی گئی ہے جس میں جا بجا سرخ روشنائی سے بعض بزرگوں کے نام اور دیگر عنوان درج ہیں۔ خانوادۂ بخاریہ کے ابتدائی حالات بالخصوص حضرت سید جلال سرخ بخاری اور ان کے والد ماجد حضرت سید علی المؤید کے بارے میں بعض ایسی تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں جو کسی دوسری جگہ موجود نہیں ہیں تاہم بعض روایات کی سند:: محل نظر ہے۔ آغاز الکتاب اس عبارت سے ہوتا ہے۔ "حمد بے حد و ثنائے بے عد حضرت ارحم الراحمین رائد بکمال الطاف حبیب خود ما از انوار رخص الخواص "

المؤید حسینی البخاری بوده و والدۂ حضرت قطب العالم مذکور بنت سلطان محمدؐ خدا بنده و خدا بنده مذکور از نسل چنگیز خاں بود و والدۂ حضرت امیر کبیر مذکور را از چہ سبب لقب سلطانی می نامند بدیں جہتہ کہ چوں از نسل چنگیز خاں ، سلطان محمد خدا بندہ در اسلام مشرف شدہ و سلطان محمد خدا بندہ بادشاہ موروثی بودہ و سہ دختر داشت - ہر سہ دختر بسادات نامزد کردہ بود یکے را از سادات کرمان و یکے را بہ میر جمال الدین کہ دراں وقت درمیان سیداں عالم تر بودہ و یکے را از سادات عرب قرارداده بجانب سادات عرب ، عرض کردہ فرستاد دراں وقت حضرت سید علی در مدینہ بودند ہمراہ قافلۂ عرب چند کس کہ از سادات بجانب ولایت سلطان محمد خدا بندہ متوجہ شدہ بودند - ایشاں نیز ہمراہ شدند چوں در مقام خدا بندہ رسیدند چنانچہ لائق سادات بود ہمچناں نمود و در محلہ ساکن کرد - چوں دعوت سلطان مذکور مہیا برائے سادات طعام شدہ - ایشاں را طلب نمود ہر یکے را دید در فکر او رسید کہ بہ کدام سادات عرب ، عزیزگی ظاہر کنیم توجہ باشارت حضرت جہاں پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کرد بعد توجہ بر یک حلیہ بشارت شد کہ یکے درمیان جماعۃ سادات کہ از عرب آمدہ اند اصم است ، دختر خود را بہ حضرت ایشاں بسپار - روئے مبارک حضرت ایشاں نیز نمودند، سلطان مذکور باز چوں بسادات مشرف گشت ، آں حلیہ را نہ یافت از سادات مذکور پرسید کہ دیگر سادات ہم ہمراہ خود دارید - ایشاں فرمودند کہ آرے داریم سلطان مذکور فرمود کہ چرا حاضر نہ ساختید سادات فرمودند کہ از جہتہ اصمہ حاضر نہ ساختیم سلطان مذکور گفت کہ حکم پیوند دختر ما بد شدہ است ، حضرت سلطان سید علی ابوالمؤید را در دائرۂ خود آوردند - چوں سلطان محمد مذکور ایشاں را دید - گفت کہ بریں حلیہ مارا حکم پیوندگی شدہ است - جامۂ عزیزگی بر حضرت سلطان سید علی ابو المؤید را پوشانیدند و دیگر سلطان محمد خدا بندہ چوں در مذہب اثنا عشریؑ اختیار داشت و دریں مذہب غیر سادات دیگرے را خلافت جائز نیست بداں جہتہ امیر سید علی مذکور کہ داماد ایشاں بود او را سلطان

علی ابوالموید نام نہاد و خود وزیر او شدہ بنا بر والد حضرت امیر کبیر مذکور را لقب سلطانی می نامند۔

و دیگر چوں امیر کبیر حضرت حسین مخدوم سید جلال قدس سرہٗ در بخارا تولد شدہ و چوں بزرگ شدند و والدۂ حضرت مخدوم مذکور وفات یافتند سلطان محمد خدا بندہ حیات بود خیال کرد کہ سلطانی بہ حضرت حسین مخدوم سید جلال حسینی البخاری مقرر را سازیم ہر چند کہ سلطان محمد خدا بندہ مذکور کوشش نمودند حضرت مخدوم مذکور سلطانی را اختیار نہ کردند نہایت بجانب مکہ مبارکہ و مدینہ معظمہ و مکرمہ متوجہ شدند دراں طرف چند مدت مشرف گشتند بعد از متوجہ شدن حضرت مخدوم سلطان محمد خدا بندہ مذکور وفات یافت بعد وفات او فرزند خدا بندہ سلطان شدہ در حکومت ایشاں حضرت

ؔ یہ روایت کہ سلطان محمد خدا بندہ شیعہ مذہب رکھتا تھا اور اس نے اپنی تینوں صاحبزادیاں سادات کے گھرانہ میں دی تھیں۔ اس امر کا غماز ہے کہ اس زمانہ میں شیعیت کوئی ایسا شجر ممنوعہ نہیں تھا کہ عام مسلمانوں کے تعلقات ان سے خوشگوار نہ ہوں اور ان میں رشتے ناتے نہ ہوا کرتے تھے۔ یہ دور ساتویں صدی ہجری ؔ ہے۔ اس زمانہ میں خراساں اور ماوراء النہر کا علاقہ شیعیت کی زد میں تھا بلکہ شروع دن ہی سے ایران کی مانند ان علاقوں میں اہل بیعت کی محبت اور ان کے ساتھ عقیدت کے جذبات عام ہو چکے تھے اس لئے خدا بندہ کا شیعہ ہونا کوئی مستبعد امر نہیں ہے۔

ہسٹری آف پرشیا مصنفہ سائیکس میں درج ہے کہ

سلطان خدا بندہ کی ماں عیسائی تھی البتہ اس کی بیوی مسلمان تھی جس کے اثر سے اس نے اسلام قبول کر لیا لیکن ایک دفعہ جب ملک میں طوفان آیا اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ آفت اس کے اپنے مذہب سے انحراف کا نتیجہ ہے تو وہ پھر ڈانواڈول ہوگیا۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی کی تحریک پر حضرت علیؑ کے مزار پر گیا جہاں اس کو یہ بشارت ملی کہ وہ اسلام کے دامن سے وابستہ رہے سائیکس کی رائے میں یہی واقعہ اس کے شیعہ ہونے کا باعث ہوا۔ خدا بندہ نے سلطانیہ (وسط ایشیا) کے مقام پر ایک مقبرہ تعمیر کرایا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کے جسم اس مقبرہ میں دفن کئے جائیں۔ وہ اپنے اس ارادے میں تو

از مکہ مبارک در آں جا آمدند بہ زیارت حضرت ایشاں بسیار مردم غلو نمودند فرزند محمد خدا بندہ مذکور فکر کرد کہ مبادا حضرت حسین مخدوم سید جلال حسینی البخاری قدس سرہٗ مذکور در سلطانی ما بر خود خیال کند زیرا کہ ایشاں فرزند سید علی سلطان ابوالموید، مستند داد سلطان پدر ما بود بداں جہۃ آزار حضرت ایشاں را شروع کردند کہ حضرت مخدوم بآزردہ شدہ جائے دیگر متوجہ شود حضرت مخدوم را معاینہ شد کہ از بخارا زود انتقال فرمائی کہ ساکنانِ بخارا کردہٗ خویش خواہند یافت حضرت مخدوم مذکور بجانب شہید در مقام حضرت امام علی رضا رواں شدہ۔ بعد از رفتن حضرت مخدوم مذکور در شہر بخارا قحط و وبا ظاہر شدہ نعوذ باللہ من ذٰلک مردم اکابر آنجائے اتفاق کردہ در مشہد آمدند۔ در خدمت حضرت مخدوم مذکور بسیار الحاح نمودند کہ نوعی کرم فرمودہ در شہر بخارا باز تشریف فرمایند۔ ایشاں را چوں معائنہ شدہ بود بداں جہۃ بازگشت در بخارا نکردند اما چوں بسیار عاجزی نمودند در باب ایشاں فرمودند کہ از جہۃ دنیا مرا رنج رسانیدند حکومت آں شمارا تا دیر نہ خواہد ماند۔"

حاصل کلام یہ کہ حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کی والدہؒ ماجدہ بخارا کے کامیاب نہ ہوسکا۔ البتہ اس کے مرنے کے بعد اسے اس مقبرہ میں دفن کردیا گیا۔

مشہور بات ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ حضرت سید جلال سرخ بخاری کی والدہ ماجدہ سلطان محمد خدابندہ کی بیٹی تھیں کیونکہ سلطان محمد خدا بندہ اور حضرت جلال میں کافی بُعد زمانی ہے۔ خدا بندہ جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو مخدوم سید جلال الدین بخاری کی وفات کو جنہوں نے ۹۰ سال کی عمر پائی تھی ۱۲ سال گزر چکے تھے اس لحاظ سے یہ ساری داستان کہ خدابندہ نے اپنی ایک بیٹی حضرت سید جلال کے والد سید ابو المؤید کے عقد میں دی اور یہ کہ سلطان نے آپ کو بادشاہت کی مسند پیش کردی اور خود آپ کا وزیر بن گیا، سراسر غلط ہے۔

سلطان خدابندہ کے حالات پر مولانا شبلی نعمانی کے مندرجہ ذیل نوٹ سے کسی قدر روشنی پڑتی ہے جو شعرالعجم کے حصہ دوم کے شروع میں ہے۔

"چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اٹھا تھا اور اپنے فوری اور سرسری انتظامات کیلئے اُسنے کچھ قاعدے بھی بنائے تھے جو تورہ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں لیکن جب سلطنت کو

بادشاہ سلطان محمد خدا بندہ کی بیٹی تھیں۔ سلطان خدا بندہ، چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ اس نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ اپنی تینوں بیٹیاں سادات کے گھرانوں میں بیاہے گا۔ چنانچہ ایک لڑکی سادات کرمان کے خاندان کو دی، دوسری میر سید جمال الدین کے عقد میں دی جو اس زمانہ میں سادات کے سربرآوردہ فرد تھے۔ اور تیسری لڑکی عرب کے کسی خانوادہ سادات کے سلئے

استقلال ہوا تو شاہانہ نظم ونسق کی ضرورت پڑی۔ تاتاری لوٹ مار کے سوا اور کچھ جانتے نہ تھے اس لئے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ چنگیز خاں کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن اور اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی ابن چنگیز خاں تخت نشین ہوا۔ ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اس کا بیٹا نکودار، خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغون خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے ۶۸۰ھ میں قتل کر دیا لیکن جب ارغون کا بیٹا غازان خاں ۶۹۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا اور اس کے ساتھ ۱۰۰ ہزار ترک مسلمان ہو گئے۔ غازان ۷۰۳ھ میں مرگیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی خدابندہ اور اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بادشاہ ہوا۔ یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، مدبر اور بیدار مغز تھے اور بالخصوص سلطان ابوسعید کے عدل وانصاف اور نظم ونسق کے قواعد اور آئین مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے۔ یہاں تک کہ اوحد کرمانی نے جو مشہور صوفی گزرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے ؎

سکہ بر نام بوسعید زدند ۔۔۔ دو جہاں را صلائے عید زدند
مدح ایں گلبن اولوالامرے ۔۔۔ در چمن گفتہ بلبل و قمرے

سلطان ابوسعید نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی۔

(شعر العجم حصہ دوم مصنفہ مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۱ اور ۲)

مخصوص کر رکھی تھی۔ اس زمانہ میں حضرت سید جمال سرخ بخاری کے والد گرامی سیدّ علی ابوالموید مدینہ منورہ میں تھے وہاں سے وہ سادات کے ایک قافلہ کے ہمراہ بخارا تشریف لائے۔ سلطان محمد خدا بندہ نے اس گروہ سادات کی پذیرائی بڑے اچھے طریقہ پر کی اور ان کی مہمانداری کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا اور اب اس فکر میں غلطاں ہوا کہ ان میں سے کس سے اپنی لڑکی کا عقد کرے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلمّ کی ذات با برکات کی جانب توجہ کی۔ خواب میں ایک حلیہ دکھائی دیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس گروہ میں ایک سیدّ زادہ ہے جس کی سماعت میں نقص ہے۔ وہی گوہر مراد ہے۔ بادشاہ جب ان حضرات سے ملا تو اسے مطلوبہ حلیہ کا شخص نظر نہیں آیا۔ اس نے ان سے دریافت کیا کہ کیا کوئی اور بزرگ بھی آپ کے ہمراہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہاں ایک اور صاحب بھی ہمارے ساتھ ہیں مگر چوں کہ انہیں کانوں سے کم سنائی دیتا ہے اس لئے ہم انہیں ساتھ نہیں لائے۔ بادشاہ نے بتایا کہ ہمیں انہی کا انتظار تھا اور انہی سے اپنی لڑکی کی شادی کا ہمیں حکم ملا ہے۔ حضرت سید علی ابوالموید کو بلایا گیا۔ بادشاہ انہیں دیکھتے ہی بول اٹھا کہ یہی وہ بزرگ ہیں جن کا حلیہ مجھے دکھایا گیا تھا اور جن سے قرابت داری کا مجھے ایماء ہوا تھا چنانچہ سید علی ابوالموید شاہزادی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

سلطان محمد خدا بندہ چونکہ مسلک شیعہ (اثنا عشری) پر کار بند تھا اور اس مسلک کی رو سے خلافت و حکومت کا حق صرف سادات کو حاصل ہے اس لئے سلطان نے آپ کو بادشاہت کی مسند پیش کر دی اور خود آپ کا وزیر بن گیا۔ اسی سبب سے سید علی ابوالموید کا لقب سلطان پڑ گیا۔ سید علی ابوالموید کے گھر اس شاہزادی کے بطن سے حضرت سید جلال سرخ بخاری پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش بخارا میں ہوئی اور وہیں آپ پلے بڑھے۔ جب آپ بڑے ہوئے تو

آپ کی والدہ ماجدہ انتقال کر گئیں۔ سلطان محمد خدا بندہ کا دلی منشا یہ تھا کہ والد کے بعد مسند حکومت پر سید جلال سرخ بخاری کو متمکن کیا جائے لیکن حضرت موصوف کو طبعاً اس کی رغبت نہیں تھی اس لئے آپ زیارت حرمین شریفین کے ارادے سے بخارا سے روانہ ہو گئے اور کچھ مدت تک وہاں قیام پذیر رہے۔ اس اثنا میں سلطان محمد خدا بندہ فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا بادشاہ بن گیا۔ اس کے عہد حکومت[1] میں حضرت سید جلال سُرخ بخاری مدینہ المنورہ سے بخارا واپس تشریف لائے۔ لوگوں نے آپ کا شاہانہ استقبال کیا اور شائقین زیارت کا ایک جم غفیران کے ارد گرد جمع ہو گیا۔ بادشاہ کو فکر دامن گیر ہوا کہ کہیں سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل کر سید جلال سرخ بخاری کے قبضہ میں نہ چلی جائے کیونکہ بہر حال ان کے والد میرے والد کے زمانہ میں بادشاہ تھے۔ اس اندیشہ کے تحت وہ آپ کے درپئے آزار ہوا تاکہ آپ تنگ آ کر بخارا سے کہیں باہر تشریف لے جائیں۔ حضرت موصوف کو بھی القاء ہوا کہ بخارا سے نقل مکانی فرمائیں اور اس کا خمیازہ بخارا کے لوگوں کو بھگتنا پڑے گا۔ حضرت موصوف وہاں سے حضرت امام رضا کے مزار مقدس پر مشہد میں آ گئے اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کے بخارا سے آ جانے کے بعد بخارا میں قحط سالی اور وباؤں کا دور دورہ ہوا وہاں کے لوگ مل کر مشہد پہنچے اور آپ سے بصد عجز و نیاز درخواست کی کہ آپ واپس تشریف لے چلیں۔ آپ نے ایماءِ غیبی کے بموجب واپس ہونا گوارا نہ فرمایا اور ان لوگوں سے ارشاد فرمایا اگر تم لوگوں نے محض دنیا کے لئے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ تم بھی وہاں زیادہ عرصہ دادِ حکمرانی نہیں دے سکو گے۔

آگے چل کر انساب جلالی نے حضرت موصوف کے سفر ہندوستان کا

---

[1] حقائق کی رُو سے یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ جب خدا بندہ کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو حضرت سید جلال سرخ بخاری کو وفات پائے ۲۶ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

مجملاً تذکرہ کیا ہے۔ جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور بھکر پہنچنے اور سید بدرالدین سے ملاقات وغیرہ کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔

اوچ میں حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاری کے ورود کا حال انساب جلالی کے مصنف کی زبانی سنیئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"بھکر میں کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت سید جلال سرخ بخاری اپنے خدام کے ساتھ اپنے دو صاحبزادوں کی تلاش میں نکلے جو آپ سے پہلے ہندوستان آئے تھے۔ مخدوم سید بدرالدین بھکری بھی کچھ دور آپ کے ساتھ آئے۔ جب مئو پہنچے تو وہاں آپ کی ملاقات سلطان محمد تغلق سے ہوئی جو ٹھٹھہ کی مہم پر جا رہا تھا۔ سلطان آپ کے اوصاف و کمالات کا ذکر حضرت شیخ بہاؤالحق ذکریا ملتانیؒ سے سن چکا تھا۔ اس نے آپ کو دس گاؤں بہ طور جاگیر نذر کئے۔ مئو سے جب اوچ کے قریب پہنچے تو حضرت شیخ جمال خنداں رو آپ کی پیشوائی کے لئے بڑھے اور آپ کو اوچ لے کر آئے۔ اوچ میں ایک شخص کے گھر میں کوئی آسیب یا بلا تھی۔ آپ کو وہیں ٹھہرایا گیا۔ آپ کے قیام کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس بلا کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ کرامت دیکھ کر سارا شہر آپ کا معتقد ہو گیا۔

یہاں انساب جلالی آپ کے ورود ملتان کا ذکر کرتا ہے اور حضرت مخدوم بہاؤالحق ذکریا ملتانی کی بجائے حضرت صدرالدین عارف سے آپ کی ملاقات کا

لہ انساب جلالی نے آپ کے سفر ہندوستان کا مقصد یہ لکھا ہے کہ آپ کے دو صاحبزادگان سید علی اور سید جعفر پہلے سے یہاں آچکے تھے اور انہیں آپ سے جدا ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اس لئے آپ نے اپنے بیٹوں سے ملنے کی غرض سے ہندوستان کا قصد کیا۔

سے مئو —— یہ وہی قصبہ ہے جہاں ابتدا میں کچھ عرصہ حضرت مخدوم بہاؤالحق ذکریا ملتانیؒ کا قیام رہا ہے اور جہاں آپ کے خلیفہ اجل حضرت مخدوم حمیدالدین کا مزار مرجع خلائق ہے۔ مئو ایک قدیم قصبہ ہے اور اس کا ذکر سندھ پر سلاطین خاندان کے دور حکومت میں بھی ملتا ہے۔

حال بیان کرتا ہے۔ مصنف کو غالباً سہو ہوا ہے۔ کیونکہ روایاتِ متواترہ سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاری حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانی کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہے اور انہی سے آپ نے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے اس لئے یہ سمجھنا کہ ملتان میں آپ کی ملاقات حضرت زکریا ملتانی سے نہیں ہوئی بلکہ ان کی بجائے ان کے فرزند گرامی شیخ صدرالدین عارف کے پاس آپ تشریف لائے تاریخی واقعات کی رو سے غلط ہے۔

ملتان کے زمانہ قیام میں آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے ایک فرزند سید علی انتقال کر گئے ہیں اور سید جعفر ہندوستان میں واپس[1] چلے گئے ہیں۔ چنانچہ آپ واپس اوچ تشریف لے آئے اور یہیں آپ کے ہاں سید احمد کبیر کی ولادت ہوئی۔ سید احمد کبیر کی والدہ سید بدرالدین کی بیٹی تھیں۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سید احمد کبیر کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ سید بدرالدین بھکری کی پوتی تھیں۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے جد مادری (نانا) سید دولہ بن سید بدرالدین بھکری تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے تین صاحبزادے تھے۔ سید ناصرالدین محمود، سید عبداللہ اور سید جلال الدین کبیر، ان تینوں کی والدہ الگ الگ تھیں سید ناصرالدین محمود کی والدہ سید محمد بن سید جلال سرخ بخاری کی صاحبزادی تھیں

---

[1] حضرت جلال سرخ بخاری کی پہلی شادی بخارا کے ایک نامور عالم سید ابوالقاسم فقیہ الحسن کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ان کے بطن سے آپ کے دو فرزند متولد ہوئے۔ ایک سید جعفر اور دوسرے سید علی، سید جعفر کے بارے میں انساب جلالی کی روایت یہ ہے کہ ان کا انتقال ہندوستان میں کسی مقام پر ہوگیا اور سید علی واپس تشریف لے گئے۔ انساب جلالی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید جعفر کی اولاد قصبہ لاڑ میں آکر آباد ہوئی۔ قصبہ لاڑ سے ۳ فرسنگ کے فاصلہ پر ایک گاؤں بشنت تھا جہاں آپ کے اہل دعیال متوطن ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سید عبداللہ کی والدہ دہلی کے خاندان سادات سے تعلق رکھتی تھیں اور سید جلال الدین کبیر کی والدہ ترکی نژاد تھیں۔ ان کا وطن مالوف ترکی کا ایک شہر رومیلی تھا جہاں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے خاندان کے لوگ اب بھی آباد ہیں۔ سید عبداللہ بن مخدوم جہانیاں جہانگشت کا مزار دہلی میں قدم مبارک کے قریب واقع ہے

سید ناصرالدین محمود نے کئی شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی ملک حسین لانگاہ کی بیٹی سے ہوئی جن کے بطن سے سید احمد کبیر متولد ہوئے۔ ایک شادی انہوں نے اپنی بنت عم سے کی یعنی سید محمد بن سید جلال سرخ بخاری کے فرزند سید شادن کی لڑکی خونزا سے۔ سید حامد بن سید ناصرالدین محمود کے دو فرزند تھے۔ سید رکن الدین ابوالفتح اور سید بہاؤالدین۔

انساب جلالی ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ اوچ کے گیلانی اور بخاری سادات کے درمیان رشتہ مصاہرت قائم تھا۔ حضرت مخدوم ناصرالدین محمود کی اولاد میں سے سید میراں شاہ محمد کے نام ایک بزرگ تھے جن کی شادی سید عبدالقادر جیلانی ثانی کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی اور ان کے بطن سے سید صفی الدین بخاری پیدا ہوئے تھے جو غالباً اس کتاب کے مرتب بھی ہیں۔

سید ناصرالدین محمود کی اولاد کے بارے میں مختلف روائتیں ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ کے فرزندان گرامی کی تعداد ایک سو بیس تھی۔ اسی لئے آپ ناصرالدین کہلاتے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ کی اولاد نرینہ کی تعداد ۲۵ تھی، جن میں سے سات صاحب اولاد ہوتے۔ تاریخ اوچ کے مصنف نے بھی آپ کی اولاد نرینہ کی تعداد ۲۱ لکھی ہے جن میں سے چودہ کو صاحب اولاد قرار دیا ہے، مگر انساب جلالی کی روایت یہ ہے کہ آپ کے فرزندان گرامی کی تعداد ۲۰ تھی جن میں سے پانچ کے نام معلوم نہیں ہوسکے۔ باقی ۱۵ کے اسماء ملتے ہیں۔ آپ کی پانچ صاحبزادیاں بھی تھیں۔

حضرت سیّد احمد کبیرؒ

سید کبیرالدین احمد حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاری کے فرزند ارجمند مرید اور خلیفۂ اعظم تھے۔ آپ کو خانوادۂ حسینیہ بخاریہ میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ سے اور خانوادۂ سہروردیہ میں اپنے والد بزرگ کے علاوہ حضرت شیخ صدرالدین عارف ملتانیؒ سے خلافت و اجازت حاصل تھی۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات میں ان کے والد گرامی مرتبت حضرت سید احمد کبیر کی روشن اور شاندار زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید موصوف کس قدر صاحب کمال اور کیسے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ فرماتے ہیں۔

"میرے والد خوف الٰہی کی وجہ سے بستر پر نہیں سوتے تھے مبادا غفلت کی نیند سو جائے۔ موسم سرما ہو یا موسم گرما، صرف ایک چادر اوڑھتے تھے۔ دن رات میں ایک ایک قرآن مجید ختم کرتے۔ جس وقت نماز ادا کرتے یا قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تو آپ پر رقت طاری ہو جاتی اور اس طرح روتے کہ محسوس ہوتا کہ ان کے سینہ مبارک سے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ میرے والد ہر وقت عشق الٰہی میں سرشار رہتے تھے۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ جب وہ فرض یا نفل نماز کے لئے مصلے پر کھڑے ہوتے تو نعرہ مارتے اور زار زار روتے تھے۔

(بزم صوفیہ ۳۹۶ - ڈاکٹر منظوم مطبوعہ دہلی)

حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کے بعض دوسرے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت پر جذب و مستی کا غلبہ تھا اور اگر حضرت جمال الدین خنداں رو آپ کی نگہداشت نہ فرماتے تو آپ مجذوب ہو جاتے۔

حضرت سید احمد کبیر کے حالاتِ زندگی کی تفصیل بہت کم ملتی ہے۔ خلفا میں آپ کے صاحبزادہ بلند مرتبت حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کے علاوہ حضرت

جلال مجرد سلہٹی کا نام ملتا ہے۔ حضرت سید احمد کبیر کی تاریخ پیدائش اور سن وفات کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا البتہ انکے بارے میں یہ معلوم ہے کہ جب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ منصب شیخ الاسلامی چھوڑ کر سفرِ حجاز پر تشریف لے گئے تو آپ ابھی بقید حیات تھے

حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت نوّر اللّٰہ مرقدہٗ

•حضرت سید جلال الدین حسین مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ حضرت سید احمد کبیرؒ کے فرزند اکبر اور حضرت سید جلال سرخ بخاری کے پوتے تھے۔ آپ ۱۴ شعبان المعظم ۷۰۷ھ کو شب برات کی ساعت سعید میں اوچ میں پیدا ہوئے۔ جب آپ سات برس کے ہوئے تو آپ کے والد بزرگوار آپ کو حضرت شیخ جمال خنداں روؒ اوچی کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت جمال خنداں روؒ کے سامنے کھجوروں کا طشت رکھا ہوا تھا انہوں نے حکم دیا کہ کھجوریں حاضرین میں تقسیم کر دی جائیں۔ جب حضرت مخدومؒ کی باری آئی تو آپ نے کھجوریں گٹھلیوں سمیت کھالیں۔ حضرت شیخ جمال الدین خنداں رو متبسم ہوئے اور فرمایا

"میاں صاحبزادے! تم نے گٹھلیوں سمیت یہ کھجوریں کیوں کھالیں"

حضرت مخدوم نے برجستہ عرض کیا

"جو کھجوریں آپ کے دست مبارک سے عطا ہوئی ہوں، مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ ان کی گٹھلیوں کو پھینک دوں"

حضرت شیخ جمال الدین خنداں رو ایک بچے کی زبان سے یہ جواب سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ آپ کے حق میں دعا کی اور فرمایا "تم اپنا، فقراء کا اور اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔"

آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت سید احمد کبیرؒ اپنے عم محترم سید صدر الدین محمد اور شیخ جمال خنداں روؒ کے زیر سایہ ہوئی۔ فقہ اور اصول فقہ کی معیاری کتابیں مثلاً ہدایہ اور اصول بزدوی وغیرہ آپ نے علامہ شیخ بہاؤالدین

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

اوچ سے پڑھیں۔

حضرت علامہ بہاؤ الدین کی وفات کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے۔ جہاں آپ ایک سال رہے اور شیخ ابوالفتح رکن الدین شاہ رکن عالم ملتانیؒ کی نگرانی میں مولانا موسیٰ نبیرۂ حضرت زکریا ملتانیؒ اور ان کے چچا زاد بھائی مولانا مجد الدین کے زیر تدریس رہے۔ ملتان کے زمانۂ قیام میں آپ نے مولانا شاہ رُخ عالم سے بھی استفادہ علمی کیا۔

درمنظوم میں ہے کہ آپ سبعہ قرأت کے قاری تھے۔ آپ تحصیل علم کی غرض سے حجاز بھی تشریف لے گئے جہاں مکہ معظمہ میں آپ نے شیخ عبداللہ یافعی سے اور مدینہ منورہ میں شیخ عبداللہ مطری سے تصوف و حدیث کی کتابوں کا درس لیا۔ [1]

مدینۃ المنورہ میں شیخ عبداللہ مطری کی صحبت میں دو برس کا عرصہ گزارا، صحاح ستہ کے علاوہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی مشہور تصنیف عوارف المعارف کا سبق بھی شیخ عبداللہ مطری سے لیا۔ معمول یہ تھا کہ تہجد کے وقت سبق پڑھتے۔ شیخ عبداللہ مطری کو آپ کے حال پر خصوصی شفقت و عنایت تھی۔ مدینۃ المنورہ کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں امامت کا شرف بھی حاصل کیا۔

حضرت مخدومؒ نے عوارف المعارف کا درس جس نسخہ سے لیا تھا وہ خود حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے زیر نظر رہ چکا تھا۔ جب شیخ عبداللہ مطری کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے خاص طور پر وہ نسخہ امام عبداللہ یافعیؒ کے پاس مکہ مکرمہ بھجوا دیا کہ وہ اسے سید جلال الدین بخاری کے پاس پہنچا دیں۔ چنانچہ انہوں نے وہ نسخہ آپ کو دے دیا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اس نسخہ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

---

[1] شیخ عبداللہ یافعی اور شیخ عبداللہ مطری دونوں حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ کے فیض یافتگان صحبت میں سے تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے عوارف المعارف کا سبق شیخ شرف الدین محمود تستری سے بھی ان کے وطن شوکارہ (عراق) پہنچ کو حاصل کیا۔

سیر و سیاحت

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی زندگی کی ایک امتیازی خصوصیت ان کی جہاں نوردی اور ان کا شوقِ سیاحت ہے اس جذبہ جہاں پیمائی نے انہیں بیشمار اہل اللہ کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔ لطائف اشرفی میں ہے۔

"اکثر سفر ربع مسکون نمودہ و جمیع مشائخ چہاردہ سلسلہ ویک گروہ را دریافت و از سی و صد وچند مشائخ صاحب ارشاد نعمت یافتہ و خرقۂ اجازت از دست ایشاں پوشیدہ بود"

ترجمہ:۔ زمین کے بہت بڑے حصہ کا سفر کیا اور ۱۴ سلسلوں کے تمام مشائخ اور بزرگوں کے ایک بڑے گروہ سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ ایک سو تیس سے زیادہ صاحب ارشاد مشائخ سے اکتساب فیض کیا اور خرقۂ خلافت و اجازت حاصل کیا۔

اخبار الاخیار میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

"سیاحت بسیار کردہ و از بسیارے از اولیاء نعمت و برکت یافتہ"

ترجمہ:۔ بہت سیر و سیاحت فرمائی تھی اور بے شمار اولیاء اللہ سے روحانی برکات و فیوض حاصل کئے۔

اس سیر و سیاحت کے پیچھے جو مقصد کارفرما تھا وہ حضرت مخدوم ہی کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں۔

"سلطان محمد تغلق نے مجھ کو شیخ الاسلام مقرر کیا اور ۴۰ خانقاہیں میری تحویل میں دے دیں۔ شیخ رکن الدین ابوالفتح (شاہ رکن عالم ملتانیؒ) مجھے خواب میں دکھائی دیئے اور فرمایا۔

"تو حج کو چلا جا ورنہ غرق ہو جائے گا۔ حج کو شیخ کے امام نے بھی کہا کہ شیخ کا حکم ہے۔ جلد روانہ ہو جاؤ۔ تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے حضرت

مخدوم والد سے اجازت طلب کی اور روانہ ہو گیا۔ میرے پاس زادِ سفر نہیں تھا لیکن حق تعالیٰ نے بعید انعامات و اکرامات سے نوازا اور زادِ سفر کی یہ سبیل پیدا فرمائی کہ ایک عزیز جو سفرِ حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تھا، واپس آ گیا اور اس کا سفر خرچ مجھے مل گیا۔ ساتھ ہی گھوڑا بھی سواری کے لئے دیا۔ میں نے وہ گھوڑا مولانا نظام الدین کڑہ کو دے دیا جو دق کے مریض تھے اور خود پا پیادہ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوا۔[1]

اس واقعہ سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی بے نفسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اتنے بڑے منصب کو محض اپنے مرشد کے ایماء غیبی پر ترک فرمایا اور سب کچھ چھوڑ کر راہِ حق میں نکل کھڑے ہوئے۔

شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی (المتوفی ۷۴۹ھ) نے "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" کے نام سے جو ضخیم کتاب تالیف کی ہے۔ اس میں اس نے شیخ مبارک کی روایت سے محمد تغلق کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں۔ منصب شیخ الاسلامی کی بابت لکھتا ہے۔

"اسلامی دور میں قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کے دو موقر عہدے ہوتے تھے جنہیں دس دس قصبات جاگیریں ملتے تھے۔ ان کی آمدنی ۶۰ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی۔ قاضی القضاۃ کا کام مقدمات کی سماعت اور احکام سزا کا اجراء تھا۔ جب کہ شیخ الاسلام کا فرض منصبی شرع کے مطابق مسائل عامہ طے کرنا تھا۔ علماء و فقہاء کے جملہ امور قاضی القضاۃ سے متعلق تھے اور مشائخ و فقراء کے تمام معاملات شیخ الاسلام کی وساطت سے طے پاتے تھے۔"

اس قدر اہم عہدے اور ایسے منفعت بخش منصب کو چھوڑ کر اور اہل و عیال سے مفارقت اختیار کر کے طلب علم اور اہل اللہ کی زیارت کے ارادے سے

---

[1] الدر المنظوم ص ۶۰۹

دُور دراز علاقوں کا پا پیادہ سفر طے کرنا ایک شیخ طریقت کی بارگاہ میں حاضری دینا اور اس کے فیوض علمی و عملی سے بہرہ ور ہونا اور ہر قابل ذکر علمی اور خانقاہی شخصیت سے مل کر اس کے احوال و مقامات سے مستفیض ہونا صرف اس شخص کا نصیب ہو سکتا ہے، توفیق الٰہی کی دستگیری ازل سے جس کا مقدر ہو۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی زندگی کا انداز ہمہ گیر اور متنوّع تھا اور وہ عمر بھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے مطابق کہ (کن عالما او متعلما او مستمعاً او محبا للعلماءٔ) "عالم بنو، طالب علم بنو، علم کی باتیں سنتے رہو اور اہل علم سے محبّت کرو"۔ ہمیشہ خود بھی تحصیل کمالات میں کوشاں رہے اور دوسروں کو بھی اپنے فیوض علمی و عملی سے بہرہ ور فرماتے رہے۔ سیر و سیاحت کا شوق دامن گیر تھا۔ دشت گردی اور صحرا نوردی کے طبعی ذوق نے بعض ایسے بزرگوں تک انہیں پہنچا دیا جو اپنے دور کے اقطاب و ابدال تھے اسی شوقِ رہ نوردی اور ذوقِ جہاں پیمائی کی بنا پر جہانیاں جہانگشتؒ کے لقب سے معروف ہوئے[1]

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بڑے پایہ کے عالم و محدّث اور نہایت بلند مرتبہ صوفی اور صاحبِ ارشاد بزرگ تھے۔ آپ نے عمر کا بیشتر حصہ ملکوں کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ آپ کی ذات سے لاکھوں انسانوں نے ظاہری اور باطنی فیض پایا اور ہزار ہا نفوس نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ تمام عمر آپ دین

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ عید کے مبارک دن آپ حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور اپنی عیدی طلب کی۔ حضرت مخدوم نے فرمایا۔ تمہاری عیدی یہ ہے کہ تم مخدوم جہانیاں کے خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ بعدازاں آپ اپنے مرشد حضرت شاہ رکن عالم کے مزار پر حاضر ہوئے وہاں سے بھی عیدی کی درخواست کی جس کا حسب سابق جواب ملا۔ جب آپ احاطۂ مزار سے باہر تشریف لائے تو ہر شخص کی زبان پر "مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ" کے الفاظ تھے۔ بعض پرانے قلمی مسودوں میں "جہانیاں جہاں گیر" بھی مرقوم ہے۔

اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں معروف رہے اور ہمیشہ حلال روزی پر گزر بسر کیا۔ چنانچہ "الدر المنظوم" میں ہے "حضرت مخدوم کہ معظمہ میں حصول علم اور فیوض باطنی کی تحصیل میں مشغول تھے۔ وجہ معیشت کتابت تھی دن میں تعلیم میں معروف تھے۔ اور رات کو دو تین جزو لکھ کر اس کی اجرت حاصل فرماتے اور اس سے اپنا پیٹ بھرتے"۔ (الدر المنظوم ج ۲ ص ۷۷۶)

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا علم بڑا گہرا اور مطالعہ بہت وسیع تھا مسائل فقہیہ میں مسلک اعتدال پر گامزن تھے۔ "نزہۃ الخواطر" میں ہے۔

وکان عالما بارعا مجتهدا فی الطاعات والخیرات متعبدا مرتاضا فقیها محدثا حنفیا فی الاصول و الفروع یفتی علی مذهب الامام ابی حنیفة رحمه الله، و یعمل علی العزیمة ولا یتبع الرخص وله مختارات فی المذهب وکان یجوز القراءة خلف الامام فی الصلوٰة کما فی جامع العلوم، وکان یجوز صلاة الغائب من الموتی کما فی الخزینة، وکان رحمه الله متوقد الذهن جسوم القریحة فی نهایة من الفطنة والجرعة فاخر حلاوة النطق وعذوبة البیان وحسن الانشاء و شرف الخیم وکرم الاخلاق، اشتغل علیه خلق کثیر من شاس و دان وتخرج جماعات من الفضلاء و تصدرت الطلبة والمسترشدون حتی صار علما مفردا فی الهند وانتهت الیه المشیخة والله السلطان محمد شاه التغلق مشیخة الاسلام فی ارض السند وبایم علی یده فیروز شاه وسه منصب متکرة وانشاءات بدیعة و

فوائد جمۃ ۔

(ج ۲ نزہتہ الخواطر)

ترجمہ :۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بڑے نکتہ رس عالم، نہایت نیک، صالح، پارسا اور عبادت گزار تھے۔ نیکی اور بھلائی کے جملہ امور میں حد درجہ کوشاں، ریاضت کیش، دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے، حدیث کے عالم اور اصول و فروع میں مسلکاً حنفی تھے۔ فتویٰ بھی امام ابوحنیفہ کی فقہ کے مطابق دیتے تھے۔ عزیمت پر کاربند اور رخصتوں سے دامن کش تھے، مذہب میں بعض تفردات رکھتے تھے۔ امام کے پیچھے نماز میں قرأت کے جواز کے قائل تھے (جامع العلوم) نماز جنازہ غائبانہ کے بھی قائل تھے (خزانۂ جلالی) انتہائی روشن دماغ، بلا کے نکتہ رس، بے حد ذہین و ذکی تھے، حاضر دماغی، شیریں کلامی اور خوش اسلوبیٔ تحریر میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ طبیعت میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اخلاق کریمانہ اور اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے، نزدیک و دور کے بے شمار بندگانِ حق نے ان سے فیض حاصل کیا اور اہل علم و فضل کے گروہ ان سے استفادہ کرتے رہے۔ طلباء اور مریدین ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔ اپنی ان خصوصیات کی بناء پر پورے ہندوستان میں نمایاں مقام حاصل کر گئے۔ شیخ الاسلامی کا منصب بھی آپ کو ملا سلطان محمد تغلق نے آپ کو سندھ کا شیخ الاسلام مقرر کیا اور سلطان فیروز شاہ تغلق آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوا۔ آپ کے خطبات، عجیب و غریب نکات کے حامل، آپ کی تحریریں نہایت عمدہ اور آپ کے فیوض بے پایاں تھے"

سلطان فیروز تغلق کو حضرت مخدوم جہانیاں سے جو عقیدت تھی اس کا حال اس دور کے مشہور مؤرخ شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

"نقل است کہ خدمت سید جلال الدین بخاری بعد از یک سال و دو سال

از اوچہ برائے ملاقات خسرو ششش جہات آمد میان ہر دو بزرگوار محبت و مودت از بطانہ چوں دوستان یگانہ بود ہریکے برائے ازدیاد اتحاد از دل و جان کوشش بیش نمود چوں خدمت سید جلال الدین از اوچہ می آمدند چوں نزدیک فیروز آباد می رسیدند حضرت شاہ تا مندّ رفتے استقبال می کردے میان ہر دو نیک بخت ملاقات می شد حضرت شاہ حضرت سید را بہ اعزاز و اکرام درون شہر آوردے گاہے درون کوشک معظم فیروز آباد متصل منارہ و گاہے در شفاخانہ و گاہے در حظیرہ شاہزادہ فتح خاں مرحوم فرود می آوردند المقصود چوں خدمت سیدالسادات بر طریقۂ معتاد از محل عبادت خود بر سلطان فیروزمی رفتند بمجرد آنکہ خدمت سیدالسادات سید جلال الدین قدس سرہ العزیز در محل حجاب سلام کردے حضرت شاہجہان با آں جاہ از تخت گاہ ایستادہ شدے و بہ تواضع تمام خدمت کردے۔

(تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۱۴)

ترجمہ :-

"حضرت مخدوم جب اوچ سے برس دو برس کے بعد دہلی تشریف لاتے اور فیروزآباد کے قریب پہنچتے تو بادشاہ "مند" تک حضرت کے استقبال کے لئے پہنچتا اور بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو شہر میں لاتا۔ حضرت مخدوم کبھی منارہ سے متصل کوشک معظم میں، کبھی شفاخانہ میں اور کبھی شہزادہ فتح خاں کی خانقاہ میں قیام فرماتے تھے جب حضرت مخدوم معمول کے مطابق اپنی قیام گاہ سے سلطان فیروز تغلق سے ملنے کے لئے تشریف لاتے تو جونہی حضرت والا محل حجاب میں پہنچ کر سلام کہتے۔ بادشاہ فوراً تخت گاہ سے نیچے اتر کر کھڑا ہو جاتا اور بڑے انکسار و تواضع سے پیش آتا"

سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان کے نظم و نسق میں جو ابتری پھیلی اس کا اثر گجرات پر بھی پڑا۔ گجرات کے گورنر نظام مفرح راستی خاں نے علم بغاوت بلند کیا۔ محمد تغلق ایک کمزور حکمران ثابت ہوا۔ وہ اس بغاوت پر قابو نہ پا سکا۔ بالآخر اس نے اپنے ایک امیر ظفر خاں کو گجرات کا گورنر نامزد کیا۔ ظفر خاں حضرت مخدوم

جہانیاں جہاں گشتؒ کا عقیدت مند اور مرید تھا اور حضرت والا نے اسے بادشاہت کی دعا سے سرفراز فرمایا تھا۔ اگرچہ اس کی طبیعت میں ہوس اقتدار کو مطلق دخل نہیں تھا تاہم جب ۸۰۱ھ میں امیر تیمور گورگان نے دہلی پر حملہ کر کے تغلق خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو اس انتشار اور خانہ جنگی کے ماحول میں اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ صوبہ گجرات میں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھے چنانچہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی دعا کی یہ تاثیر تھی کہ علماً و مشائخ کے مشورے اور امراء دربار کے اصرار پر ۸۱۰ھ میں اس نے مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے گجرات کی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

سلطان مظفر خاں بانی سلطنت گجرات کا انتقال ۸۱۴ھ میں ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا پوتا احمد شاہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ وہ بھی اس خانوادۂ بخاریہ کا انتہائی عقیدت مند تھا اور حضرت مخدوم کے پوتے حضرت قطب العالم برہان الدینؒ کے دامن ارادت سے وابستہ تھا۔ حاجی دبیر آصفی مکی نے جن کا اصل نام عبداللہ محمد بن عمر ہے۔ ایک کتاب سلطان مظفر خاں والی گجرات اور اس کی اولاد احفاد کے بارے میں "ظفر الوالہ بمظفر وآلہ" کے نام سے ترتیب دی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وسبقت الاشارة فی ترجمة مظفر سلطان گجرات الی البشارة لہ بالسلطنة من القطب الربانی مولانا جلال الدین المخدوم جہانیاں قدس سرہ۔ (۹۱۳۔ مطبوعہ لندن)

یعنی گجرات کے سلطان مظفر کے حالات میں یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ اس کو سلطنت کی خوشخبری حضرت قطب ربانی مولانا جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے دی تھی"

حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کا اپنے دور کے تمام مسلمان حکمرانوں پر بڑا زبردست اثر تھا اور ہر علاقہ کے بادشاہ اور حکام آپ کے سامنے سر تسلیم خم

کرنا ۔ اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب سندھ کے سمہ حکمران نے سلطان فیروز تغلق کے علاقوں پر تاخت و تاراج کی اور اس کی سرکوبی کے لئے بادشاہ نے ایک لشکر جرار لے کر ٹھٹھہ پر حملہ کیا تو سمہ حکمران جام بانبیہ نے اپنی شکست دیکھتے ہوئے اپنا ایک قاصد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں اوچ بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ تشریف لا کر فیروز تغلق سے اس کی صلح کرا دیں۔

حضرت مخدوم اوچ سے ٹھٹھہ پہنچے اور آپ کی سفارش پر سلطان نے جام بانبیہ کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اسے کچھ عرصہ بعد دوبارہ سندھ کا حاکم بھی بنا دیا۔ بادشاہوں کے ساتھ حضرت مخدوم کا تعلق طلب جاہ و مال کے لئے نہ تھا بلکہ محض خدمت خلق اور اصلاح کا جذبہ اس میں کار فرما تھا اور یہی وجہ ہے کہ حکمران طبقہ آپ کے فقر و استغنا اور آپکی بے نیازی و بے نفسی سے متاثر ہو کر آپ کی بات بڑی توجہ سے سنتا اور اسے قبول کرتا تھا۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ فرماتے ہیں۔

"حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے کرامات کا صدور بڑی کثرت سے ہوتا تھا۔ شاید ہی متاخرین صوفیا میں کسی سے اتنی کرامتیں رونما ہوئی ہوں مگر حضرت والا ان کرامات کو شرف و کمالات کا سبب نہیں جانتے تھے بلکہ فرماتے تھے کہ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی ہوا میں اڑے، پانی پر چلے۔ اس کے لئے آسمان اور زمین کی طنابیں کھینچ سکتی ہیں مگر اس وقت تک درجہ ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنی رفتار، گفتار اور کردار میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش پا کی اتباع نہ کرے۔"

اپنے مکتوبات میں ایک جگہ حضرت مخدوم نے تحریر فرمایا ہے کہ

"علی الدوام باید کہ نفس خود را نصیحت گر باشد تا سعادت ہر دو جہاں یابد و سنت پیغمبر علیہ السلام را متابعت کند تا سعادت و کرامت سرمدی یابد۔

ترجمہ :- چاہیئے کہ ہمیشہ اپنے نفس کو نصیحت کرتا رہے تا کہ دونوں جہان کی سعادت حاصل ہو اور پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی پیروی کرے تا کہ سرمدی سعادت و کرامت حاصل ہو۔ (مقرر نامہ)

حضرت مخدوم جاہل صوفیوں کے سخت خلاف تھے، فرمایا

کن عالما باحکام الفقہ ولاتکن من جہال الصوفیۃ فانہم لصوص الدین وقطاع الطریق علی المسلمین (مقرر نامہ ص۲۱)

"مسائل فقہیہ کا علم ضروری ہے۔ جاہل صوفی مت بنو کہ یہ لوگ دین کے چور اور ڈاکو ہوتے ہیں، جو مسلمانوں کی متاع دین پر ہاتھ صاف کرتے ہیں"

خزانہ جلالی میں ہے کہ حضرت مخدوم نے فرمایا

یکے از علامات قیامت آنست کہ علماء فاسق گردند و صوفیا جاہل باشند۔ (ص ۳۴ ا)

"قیامت کی ایک نشانی یہ ہے کہ علماء بد راہ ہو جائیں اور صوفی جاہل ہوں"

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت مسلکاً اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ جامع العلوم میں ہے کہ

ولا نتبرأ من احد من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھذا بیننا وبین الروافض لانہم تیبرأون من الصحابۃ الاعن علی رضی اللہ عنہ فنرد علیہم بقولہ علیہ السلام اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم وان ابیتم غویتم فالاخبار فی فضائلہم کثیرۃ یطول ذکرھا ھہنا ولانوالی احدا من الصحابۃ دون احد وھذا بیننا وبین الشیعۃ لانہم والوا علیا علی جمیع الصحابۃ وھذا قریب من مذھب الروافض ایضا

"ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی سے اظہار بیزاری کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ ہمارے اور روافض کے درمیان یہ مسئلہ اختلاف کا باعث ہے۔ کیونکہ وہ حضرت علیؓ کے سوا باقی تمام صحابہ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے

پاس روافض کے رد میں یہ حدیث ہے کہ

"میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے اور اگر انکار کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ پس ہم سب صحابہ کو واجب الاحترام مانتے ہیں کہ ان کے فضائل میں بے شمار احادیث مروی ہیں۔ لیکن شیعہ صرف حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے قائل ہیں اور باقی صحابہ کو نظر انداز کرتے ہیں اور یہ اعتقاد رافضیوں کے اعتقاد سے زیادہ قریب ہے۔"

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے خلفاء کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ الدرالمنظوم میں ۴۲ خلفاء کے نام ملتے ہیں جو اپنے دور کے عظیم الشان بزرگ اور شیوخ طریقت تھے۔ آپ کے خلیفہ اعظم آپ کے حقیقی بھائی سید صدرالدین راجو قتال ہوئے ان کے علاوہ شیخ اخی راجگیری، شیخ علم الدین ترمذی، شیخ سراج الدین، سید اشرف جہاں گیر سمنانی، سید شرف الدین مشہدی، شیخ تاج الدین بھکری، سید محمود شیرازی، سید سکندر بن مسعود، شیخ علاؤالدین علی، سید ناصرالدین محمود اور اس قبیل کے دیگر حضرات کو بھی آپ کی بارگاہ سے خرقۂ خلافت و اجازت حاصل ہوا۔

مریدین کی تعداد "ثمرات القدس" کی روایت کے مطابق تو دو لاکھ کے قریب تھی۔

خود حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کو ایک سو چالیس سے زیادہ مشائخ طریقت سے نسبت باطنی حاصل تھی۔ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین محبوب اولیاءؒ دہلوی کے چار خلفا سے آپ نے باطنی فیض حاصل کیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی آپ کو خصوصی محبت و عقیدت تھی اور ہمیشہ اپنی اس خوش بختی پر نازاں رہے کہ انہوں نے حضرت شیخ کے دیکھنے والوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔[۱]

---

[۱] الدرالمنظوم ص ۲۵۹) فرمایا میں نے حضرت شرف الدین محمود تستری کی زیارت کی۔ انہوں نے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کیا۔ حضرت شیخ سہروردیؒ

حضرت شیخ جیلانی ؒ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں اور نہایت ذوق و شوق سے فرماتے تھے

تین خانوادۂ طریقت ایسے ہیں جن سے حضرت مخدوم کو خصوصی تعلق

خاطر تھا۔ چشتیہ نظامیہ میں حضرت خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلی ؒ سے،

سہروردیہ میں حضرت شاہ رکن الدین سہروردی ملتانی ؒ سے۔

اور حسینیہ بخاریہ میں اپنے والد گرامی سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ

بخاری ؒ سے۔

اوچ کے مضافات میں مولانا وجیہ الدین نامی ایک عالم سکونت پذیر تھے، انہوں نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ایک بزرگ وعظ فرما رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ

" جو شخص دنیاوی امور کو دینی امور پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے دونوں کام برباد ہو جاتے ہیں"

مولانا وجیہ الدین خواب سے بیدار ہوئے تو سوچنے لگے۔ یہ کون بزرگ ہوں گے۔ لوگوں کو خواب کا قصہ سنایا۔ کسی نے بتایا یہ شکل و صورت تو اوچ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت ؒ کی ہے۔ مولانا وجیہ الدین اوچ تشریف لے گئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب بجا لائے۔ خواب میں جو شکل دیکھی تھی عین وہی صورت سامنے تھی اور پھر جب حضرت مخدوم نے خواب کا وہی فقرہ ان کے سامنے دہرایا تو وہ حضرت مخدوم ؒ کے کشف و کرامت کے بھی

حضرت شیخ جیلانی ؒ کے فیض یافتہ صحبت تھے۔ اس نسبت سے ہیں حضرت شیخ کے اس ارشاد کا مصداق ہوگیا کہ (طوبیٰ لمن رآنی ولمن رآی من رآنی الخ) جنہوں نے مجھے دیکھا یا مجھے دیکھنے والوں کو دیکھا یا میری زیارت سے مشرف ہونے والوں کو دیکھنے والوں کی زیارت کی ان کے لئے خوش بختی ہے۔

(جامع العلوم)

ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت ؒ

نازل ہو گئے۔ پھر جب رخصت ہوئے تو آپ نے نصیحت کا اعادہ ان لفظوں میں فرمایا۔

"البتہ کارِ دنیا را بر کارِ دین مقدم نہ باید داشت"۔
(دنیا کے معاملات کو دین کے تقاضوں پر مقدم نہیں سمجھنا چاہیے)

یہ ایک فقرہ اگر دیکھا جائے تو حضرت مخدومؒ کی زندگی کا عنوان جلی بن سکتا ہے ان کی پوری زندگی عشق خدا اور رسول کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور ان کے ہر تعلق میں "کارِ دین" "کارِ دنیا پر مقدم تھا۔ وہ بادشاہوں سے ملتے تھے مگر اپنی غرض سے کبھی نہیں ملے بلکہ عامۂ پھر یا خواص میں سے کوئی دین کے معاملہ میں کسی کی رو رعایت نہیں فرماتے تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے ایک مرتبہ بعض محاصل کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا۔ یہ سب غیر مشروع اور حرام ہیں۔ ایک دفعہ بادشاہ کے ہاتھ میں تلوار دیکھی جس کا قبضہ سونے کا"۔ آپ نے فوراً ٹوکا۔ بادشاہ نے وہ تلوار فوراً اسلحہ خانہ میں جمع کروا دی۔

دہلی کے زمانہ قیام میں جب آپ بادشاہ سے رخصت ہوئے تو شاہی خاندان کے کچھ بچے بھی طلب دعا کے لئے حاضر ہوئے۔ انہیں ریشمی لباس میں ملبوس دیکھ کر فرمایا۔

"ریشم کا لباس مردوں کے لئے حرام ہے اس کا وبال شہزادوں کے سرپرستوں پر آئے گا"۔

کوئی شخص جوشِ عقیدت میں پاؤں چومنے کو جھکتا تو اسے سختی سے روک دیتے اور فرماتے۔ ہمارے مذہب میں سجدۂ تحیت جائز نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کسی مرید نے آپ کو قطب عالم، شیخ الشیوخ اور سید السادات کے القاب لکھے۔ فرمایا۔ "میرے لئے ایک ہی لقب گدائے عالم کافی ہے۔ یہ لکھا کرو"۔

یہ تھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی سیرت طیبہ کی ایک ادنیٰ جھلک جو اپنے وقت کا شیخ المشائخ، قطب الاقطاب اور شیخ الاسلام تھا اور جس کے

آستانہ فقر پر بادشاہوں کی پیشانیاں خم ہوتی تھیں اور جو طریقت و معرفت اور شریعت و حقیقت کا نیّرِ اعظم تھا اور جس کی ساری زندگی فقر و استغنا اور ریاضت و مجاہدہ میں بسر ہوئی اور جس کا مطمحِ نظر اصلاحِ ذات و رضائے حق کے سوا کچھ نہ تھا ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ میں علم و عمل کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ آپ کی خانقاہ اوچ بخاری کے شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے جو تاریخ وفات کو ظاہر کرتا ہے۔

تاریک گشت جملہ جہاں بے جمال شاہ
تاریخ بود ہفصد و ہشتاد و پنج سال !!

سید صدرالدین راجو قتال

آپ حضرت سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاریؒ کے چھوٹے فرزند اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے برادر حقیقی اور خلیفۂ اجل تھے ۲۶ شعبان ۷۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ جمادی الآخری ۸۲۷ھ / ۱۴۲۴ء کو انتقال فرمایا۔ علم و عمل کے جامع اور شریعت و طریقت کے ماہر تھے۔

اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اپنے برادر بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی صحبت میں بسر کیا اور سفر و حضر میں حضرت مخدومؒ کے فیوضِ ظاہرہ و باطنہ سے بہرہ یاب ہوتے رہے۔ حضرت مخدومؒ فرمایا کرتے تھے۔

" خالقِ حقیقی نے ہم کو امورِ خلقت میں مشغول کیا اور برادر عزیز صدرالدین کو اپنی ذات کے عشق میں مستغرق کر رکھا ہے"۔ [1]

چونکہ طبیعت میں جلال کا عنصر غالب تھا اس لئے قتال کے لقب سے مشہورؒ [2]

---

[1] ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

[2] بعض روایتوں میں آپ کا لقب کاف کشش سے "کتال" بھی آیا ہے جس کے معنی ترکی میں بزرگ کے ہیں۔

ہوئے۔ اس سلسلہ میں اوچ کے ہندو حاکم "لواہوں" کے واقعہ قتل کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں جس سے آپ کے افتاد طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مرض الموت کے ایام میں "لواہوں" عیادت کی غرض سے حاضر ہوا اور حضرت والا کی تعریف میں ایک ایسی بات اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گئی جس سے توحید و رسالت کا اقرار مترشح ہوتا تھا۔ آپ نے اسے قبول اسلام کا حکم دیا۔ "لواہوں" کو اس میں تامل ہوا اس لئے راتوں رات بھاگ کر دہلی پہنچا۔ فیروز تغلق سے اس کے مراسم دوستانہ تھے۔ حضرت صدرالدین راجو قتال نے دہلی تک اس کا پیچھا کیا۔ مشہور بزرگ قاضی عبدالمقتدر تھانیسری کے صاحبزادے مولانا محمد تھانیسری نے "لواہوں" کی جان بخشی کے لئے حیلۂ شرعی سے کام لیا۔ اس پر آپ مولانا محمد تھانیسری سے بگڑ گئے اور ان پر ایک نگاہ غضب آلود ڈالی اور فرمایا۔ تمہاری گفتگو دیانت سے خالی ہے۔ تم اپنے کفن دفن کی فکر کرو۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ مولانا محمد تھانیسری کے پہلو میں درد اٹھا اور اس حد تک بڑھا کہ مرغ بسمل کی طرح زمین پر لوٹنے لگے۔ قاضی عبدالمقتدر اور دیگر علماء و فضلاء نے ان کی آپ سے سفارش کی۔ فرمایا "جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اس کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کرو اور غم نہ کرو۔ مولانا محمد تھانیسری کے ہاں جو لڑکا پیدا ہونیوالا ہے وہ اپنے وقت کا مشہور زمانہ عالم اور ولی اللہ ہو گا"۔ چنانچہ مولانا محمد تھانیسری کے انتقال کے ۲ ماہ بعد ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام ابوالفتح رکھا گیا۔ یہ بچہ آگے چل کر بہت بڑا عالم فاضل اور خدا رسیدہ بزرگ ثابت ہوا۔ ان کا مقبرہ جون پور (یو۔ پی۔ انڈیا) میں مرجع خلائق ہے۔ ملفوظات میں لکھا ہے کہ سید صدرالدین راجو قتال کے ہاتھ پر تین لاکھ چالیس ہزار سے زیادہ افراد نے بیعت کی۔

آپ کی اولاد کافی تھی مگر خلافت و سجادگی اپنے بھتیجے سید ناصرالدین محمود کے صاحبزادے سید فضل الدین فضل اللہ کے سپرد کی جن کا مزار اوچ میں آپ

کے مزار سے متصل جانب جنوب واقع ہے۔ آپ کے خلفاء کی تعداد بھی سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ مشہور خلفاء میں قطب العالم سید برہان الدین گجراتی، شیخ کبیرالدین اسماعیل بخاری، حاجی سید عبدالوہاب، شاہ داؤد قریشی، شیخ اسماعیل قریشی اور سید احمد مخدوم جہان شاہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ [۱]

مخدوم سیّد ناصرالدین محمودؒ

آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے فرزند اکبر اور خلیفۂ مجاز تھے۔ حضرت مخدوم کے وصال کے بعد ان کی مسند سجادگی پر اگرچہ سید صدرالدین راجو قتال فائز ہوئے مگر علم و فضل اور ارشاد و ہدایت میں آپ بھی اپنے والد کے صحیح جانشین تھے۔ سید ناصرالدین محمود کے مناقب کے ذکر میں صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں:۔

"سید ناصرالدین بن مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری قدس اللہ سرہم جامع بود میان علوم شریعت و طریقت و حقیقت و شرافت و سیادت و نجابت و خوارق و کرامات در ولایت مرتبۂ عالی و مراتب بلند داشت ..... اگرچہ جانشین پدر بزرگوار وے سید صدرالدین راجو قتال بود اما وے نیز در ارشاد طالبان و ہدایت ایشاں آیتے از آیات الٰہی بود"۔

ترجمہ:۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے فرزند سید ناصرالدین قدس اللہ سرہم علوم شریعت و طریقت، حقیقت و شرافت، سیادت و نجابت اور خوارق و کرامات کے جامع تھے۔ ولایت میں بلند مقام پر فائز اور درجاتِ عالیہ کے مالک تھے۔ اگرچہ آپ کے والد ماجدؒ کے جانشین سید صدرالدین راجو قتال تھے لیکن طالبانِ حق

---

[۱] تذکرہ قطب الاقطاب از نور احمد خاں فریدی

کے ارشاد و ہدایت کیلئے ان کا وجود بھی اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھا۔"

سید ناصرالدین محمود، حضرت مخدوم کے بڑے فرزند تھے۔ یوں تو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے دو صاحبزادے اور بھی تھے۔ ایک سید عبداللہ اور دوسرے سید محمد، نواب صدیق حسنؒ نے الفرع النامی میں لکھا ہے کہ سید عبداللہ لاولد فوت ہوئے۔ ان کا مزار دہلی میں قدم شریف کے پاس ہے لیکن بعض روایات میں دہلی اور اطراف دہلی میں اور کرنول میں ان کی اولاد کا پایا جانا ثابت ہے۔ اسی طرح سید محمد الملقب بہ جلال الدین اکبر کی اولاد دکن، مدراس، میسور اور ملتان کے علاقوں میں آباد ہے۔

سید ناصرالدین محمود کثیرالاولاد تھے اور اسی نسبت سے ناصرالدین ترک کے نام سے مشہور تھے۔ بعض تذکروں میں ان کی اولاد کی تعداد سَو سے متجاوز بتائی گئی ہے معتبر روایات کے مطابق آپ کے فرزندانِ گرامی کی تعداد بیس سے پچیس کے درمیان تھی جن میں سے سات صاحبزادوں کا سلسلۂ اولاد باقی ہے۔

۱۔ **سیّد حامد کبیر بخاری** ——— آپ نے اپنے جد امجد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے فیض پایا۔ بھوپال کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خاںؒ انہی کی اولاد میں سے تھے۔

۲۔ **سیّد علم الدین** ——— لاہور کے مشہور بزرگ سید میراں محمد شاہ المعروف بہ موج دریا بخاریؒ جن کا مزار بھی لاہور میں ہے۔ ان کی پشت سے تھے۔

۳۔ **سیّد اسماعیل بخاری** ——— سادات بخاریہ شکار پور کے مورث اعلیٰ قطب العالم سید شہاب الدین ان کی اولاد میں سے تھے۔

۴۔ **سیّد فضل الدین فضل اللہ** ——— آپ کا مزار اوچ میں ہے اور آپ کی اولاد اوچ اور مضافات اوچ میں آباد ہے۔

۵۔ **قطب العالم سیّد برہان الدین**۔ آپ کا مزار احمد آباد کے قریب

" بڑا " میں ہے اور آپ کی اولاد گجرات (انڈیا)، حیدرآباد، دکن، گلبرگہ اور مدراس میں موجود ہے۔

۶۔ **سیّد علاؤالدین بخاری کشمیری**۔ کشمیر کے مشہور بزرگ سید حاجی مراد، سید علاؤالدین کے بڑے بیٹے سید فخرالدین کے فرزند تھے کشمیر میں ان کی اولاد بکثرت موجود ہے۔

۷۔ **سیّد شرف الدین بخاری**۔ سید پیر کمال بخاری نکوی کا سلسلہ نسب انہی سے ملتا ہے۔ سید پیر کمال کی اولاد اضلاع گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات وغیرہ میں ہے۔

حضرت سید ناصرالدین محمود بڑے شاہ خرچ واقع ہوئے تھے اور اپنی فیاضی کی بدولت ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ حضرت مخدوم انہیں پیار سے خانگی چور کہتے تھے۔

برصغیر ہند و پاک میں سلسلہ سہروردیہ کو فروغ آپ ہی کی اولاد سے حاصل ہوا اور اس برصغیر کا شاید ہی کوئی مرکزی شہر ایسا ہو جہاں آپ کی اولاد گرامی موجود نہ ہو اور جہاں تک آپ کے فرزندان معنوی کا تعلق ہے۔ تو وابستگان دامن ارادت کی تعداد ہند و پاکستان کے علاوہ ایران، ترکی، عراق اور مصر و حجاز میں بھی لاکھوں سے متجاوز ہو گی۔

حضرت مخدوم ناصرالدین محمود کی تاریخ پیدائش ۲۔ ذی قعدہ ۷۴۰ھ/۱۳۴۱ء اور سن وفات ۲۲۔ رمضان ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء ہے۔ [1]

---

[1] مناقب برہانی

سیّد حسن بن ابی الحسن الحسینی

حضرت سید حسن کبیر الدین، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ہم عصر بزرگوں میں سے تھے تاہم ان کی ملاقات تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں ان کی عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ایک سو اسی برس سے زیادہ کے ہو کر فوت ہوئے۔"

آپ کی تاریخ ولادت ۷۱۶ھ ہے اور آپ کا انتقال ۸۹۶ھ میں ہے نزہۃ الخواطر میں ہے کہ:۔

احد الرجال المعروفین بالفضل والصلاح سافر الی البلاد و دار الربع المسکون ثم قدم مدینۃ اوچ وسکن بہا وقد اسلم علی یدہ خلق کثیر وکان اذا رآہ احد لا یسعہ الا ان یذعن لہ الاطاعۃ۔

ترجمہ:۔

"نیکی اور علم و فضل میں نہایت معروف و ممتاز شخصیت تھی۔ ایک دنیا دیکھی تھی اور تمام عالم کی سیر و سیاحت فرمائی تھی۔ پھر اوچ تشریف لائے، اور وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ بے شمار بندگانِ خدا آپ کے ہاتھ پر مشرف

بہ اسلام ہوئے اور آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپ کو دیکھتا تو اسے آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہوتی"۔

حضرت سید حسن کبیر ملتان کے مشہور شیعہ بزرگ شاہ شمس سبزواری ملتانی کے پڑپوتے تھے مگر آپ مسلک حقہ اہل سنت پر کاربند تھے اور طریقت و تصوف میں خانوادہ سہروردیہ سے منسلک تھے۔ شجرۂ نسب حسب ذیل ہے۔

"سید کبیرالدین حسن بن سید صدرالدین بن سید نصیرالدین بن سید شمس الدین سبزواری ملتانی بن سید صلاح الدین بن سید سلام الدین بن سید مومن بن سید محب بن سید ہاشم بن سید احمد بن سید مہدی بن سید مظفر بن سید عبدالجلیل بن سید منصور بن سید اسماعیل بن سید محمد بن سید اسماعیل بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین علی بن امام حسین بن علی بن ابی طالب"۔

سید حسن کبیر کا مزار اوچ گیلانی کے مشرقی جانب واقع ہے۔ چونکہ آپ نسباً اسماعیلی سادات میں سے ہیں اس لئے اسماعیلی فرقہ کے لوگ آپ کے بڑے عقیدت مند ہیں۔ آپ کی اولاد بھی مسلک شیعیت پر گامزن ہے۔ آپ عوام میں حسن کبیر دریا کے نام سے مشہور ہیں جس سے غالباً آپ کی فیاضی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

اوچ کے خانوادۂ بخاریہ کی دیگر معروف شخصیتیں

سیّد حامد کبیر بخاری سہروردیؒ

آپ حضرت مخدوم سید ناصرالدین محمود کے فرزند جلیل اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے منظورِ نظر پوتے، مرید اور خلیفہ اجلؒ تھے۔ سفر حضر میں ہمیشہ حضرت مخدوم جہانیاں کے ہم عنان رہے۔ ملفوظ المخدوم میں بکثرت ان کا تذکرہ ملتا ہے جس سے ان کا اپنے دادا سے قربِ روحانی کا پتہ چلتا ہے۔ مخدوم سید حامد کبیر بڑے پایہ کے عالم اور حدیث و تفسیر کے زبردست ماہر تھے۔ علوم متداولہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ طریقۂ سہروردیہ میں اپنے جد امجد کے حقیقی جانشین تھے۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ اور بیشمار مخلوق خدا کو اپنے فیوض علمی و عملی سے بہرہ ور فرمایا۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۷، ربیع الاول ۸۲۵ھ کو اوچ میں انتقال فرمایا اور وہیں آسودہ ہوئے۔

سید حامد کبیرؒ کو حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ سے بڑی عقیدت تھی اس لئے آپ نے اپنے بڑے صاحبزادے کا نام رکن الدین ابوالفتح رکھا دوسرے صاحبزادے کا نام بہاؤالدین تجویز کیا۔ اول الذکر اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین

ثابت ہوئے اور سید حامد کبیر بخاری کے بعد مسند سجادگی انہی کے حصہ میں آئی اور اب تک خانوادہ بخاریہ کے منصب سجادگی پر آپ ہی کی اولاد متصرف ہے۔

مخدوم سید فضل اللہ بخاری

آپ بھی حضرت مخدوم ناصرالدین محمود کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے اپنے والد ماجد کے عم بزرگوار سید صدرالدین راجو قتال سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ علم حدیث و فقہ اور تصوف کے بہت بڑے ماہر تھے۔ کئی ہندو قومیں آپ کی تبلیغ کی بدولت مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

سید فضل اللہ کی اولاد اوچ میں دیوان کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ سلسلہ بخاریہ سہروردیہ کے کچھ تبرکات بھی ان حضرات کے پاس موجود ہیں۔ سید فضل اللہ کا مزار حضرت مخدوم راجن قتال کی خانقاہ کی مغربی جانب اوچ کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔

دیوان صاحبان میں سے جو شاہ فضل اللہ کے سجادہ نشین ہیں۔ دیوان سید زین العابدین رابع سہروردیہ کی بجائے چشتیہ سلسلہ میں بیعت ہوئے۔ سید فضل اللہ بخاری کی اولاد امجاد میں بہت سے اہل علم و فضل اور اصحاب کمال پیدا ہوئے۔ باقرالانوار کے مصنف سید محمد باقر بھی اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔

مخدوم سید ناصرالدین محمود کے ان دو فرزندان گرامی کے دم سے اوچ کا خطہ دور دور تک شہرت اختیار کر گیا اور اوچ کو جو عروج نصیب ہوا اس میں ان دونوں بزرگوں کی اولاد کا غالب حصہ ہے۔

خانوادۂ بخاریہ کے منتسبین

خانوادہ بخاریہ کے منتسبین میں سے بعض ایسی جلیل القدر شخصیتیں بھی اوچ میں محوِ خواب ہیں جو اگرچہ اپنے عہد میں عظیم علمی اور روحانی اہمیت کی حامل تھیں تاہم ان کے حالات و واقعات کی تفصیل نایاب ہے ان میں پیر منان ہیں جن کا اصل نام صالح محمد تھا اور جو حضرت مخدوم سید جلال سرخ بخاری کے خلفاء میں سے تھے۔ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ان کا مزار اوچ بخاری کے جنوبی حصہ میں واقع ہے۔

حضرت سید جلال سرخ بخاری کے مزار سے متصل مشرقی جانب ایک مزار جہاں گیر سرمست کا ہے۔ یہ بھی حضرت سید جلال سرخ بخاری کے متوسلین میں سے تھے اور صاحب جذب و استغراق بزرگ تھے۔

سید علاؤ الدین ابو عبداللہ علی بن سعد بن اشرف دہلوی

آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ قیام دہلی کے دوران آپ نے حضرت مخدوم کے ارشادات کو "جامع العلوم" کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء میں حضرت مخدوم سے بیعت ہوئے اور

اوچ میں اپنے پیر و مرشد کے پاس قیام پذیر ہو گئے۔ زندگی کا باقی حصہ حضرت والا کی صحبت میں بسر کیا اور فوت ہونے کے بعد اوچ ہی میں حضرت مخدوم جہانیاں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ [1]

آپ کا اصل وطن گردیز تھا اور آپ نسباً حسینی سادات میں سے تھے۔ سیّد علاؤالدین کے ایک بھائی سید معزالدین گردیزی کا مزار بھی آپ کے مزار کے ساتھ ملحق ہے۔ سید معزالدین گردیزی بھی اسی آستانہ عالیہ سے وابستہ تھے۔

ابو حنیفہ

سید صدرالدین راجن قتال کے مزار کے قریب ابو حنیفہ نامی ایک صاحب کا مزار ہے۔ تاریخ اوچ میں انہیں ایک امیر قرار دیا گیا ہے لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ وہی ابو حنیفہ ہیں جن سے ابن بطوطہ نے بھکر میں ملاقات کی تھی اور بھکر کے قاضی شہر تھے۔ چونکہ بھکر اور اوچ کے درمیان ثقافتی روابط قائم تھے اس لئے ممکن ہے ابو حنیفہ اوچ ہی کے رہنے والے ہوں اور بھکر میں قضا کے عہدہ پر متمکن ہوں یا پھر ایک امکان یہ ہے کہ وہ خانوادہ بخاریہ سے نسبت ارادت رکھتے ہوں جیسا کہ ان کے مزار کے محل وقوع سے اندازہ ہوتا ہے اور انہوں نے اپنے مدفن کے لئے اوچ بخاری کی یہ جگہ خود منتخب کی ہو۔ بہرحال اگر یہ وہی ابو حنیفہ ہیں جو بھکر کے قاضی تھے اور جن سے ابن بطوطہ ملا ہے تو حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کے ہمعصر تھے۔

---

[1] اوچ کی بستی ملتان، ٹھٹھہ اور دہلی کی طرح مقبروں کا ایک وسیع جنگل ہے اس کی سرزمین میں نہ جانے کتنے اولیاء اللہ اور کیسے کیسے ارباب فکر وفن اصحاب علم وفضل اور اہل ہنر وکمال آسودہ خواب استراحت ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے!

خانوادۂ گیلانیہ (سلسلۂ عالیہ قادریہ)

خانوادہ سہروردیہ کی آمد سے اوچ کو جو روحانی اہمیت حاصل ہوئی اس کے اثرات عرصہ دراز تک محسوس کئے جاتے رہے۔ سلاطین و امرا اظہار عقیدت و نیاز مندی کے طور پر یہاں حاضری دیتے اور اس آستانہ کی خاک بوسی کو اپنے لئے مایہ صد عز و افتخار سمجھتے۔ حکومتوں پہ حکومتیں بدلتی رہیں اور بادشاہتوں کی تبدیلی روزمرہ کا معمول بن گئی مگر اوچ کی عظمت کا جو نقش صفحہ تاریخ پر ان بزرگوں کی شب و روز کی دعوت و تبلیغ اور یادِ الٰہی کے حلقہ ہائے تصوف نے ثبت کیا تھا۔ وہ روز بروز نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ بعض دوسرے خانوادہ ہائے تصوف کے ارباب طریقت اور اصحاب علم و فضل بھی اس مرکزِ ثقل کی طرف کھنچنے لگے۔ چنانچہ نویں صدی ہجری میں سلسلہ قادریہ کے نامور بزرگ حضرت سید محمد غوث گیلانی حلبی اوچ میں رونق افروز ہوئے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نوّر اللہ مرقدہٗ کے منتسبین بیعت و خلافت قادری سلسلہ سے معروف ہوئے۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ تصوف بہت مقبول ہوا۔

سندھ میں سلسلہ قادریہ کے اوّلین بزرگ شیخ عیسیٰ علیہ الرحمۃ تھے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے۔ حضرت شیخ عیسیٰ شرف الدین

قتال کے لقب سے معروف تھے اور آپ کا قیام کچھ عرصہ تک سندھ کے مشہور تاریخی شہر ہالہ[1] میں رہا۔

سلسلہ قادریہ کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس سلسلہ عالیہ کے فروغ میں سب سے زیادہ حصہ ان اکابر امت کا ہے جو نسباً بھی صاحب سلسلہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی غرۂ رمضان ۴۷۰ھ میں گیلان میں پیدا ہوئے گیلان آپ کا ننھیالی وطن ہے۔ آپ کی والدہ سیدہ ام الخیر فاطمہ بڑی جلیل القدر بزرگ تھیں۔ حضرت شیخ ابو عبداللہ سومعی کی صاحبزادی تھیں۔ اسی نسبت سے آپ کو گیلانی کہا جاتا ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت سید ابی صالح محمد بن سید موسیٰ بڑے جلیل القدر بزرگ تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا لقب محی الدین تھا۔ آپ والد کی طرف سے حسنی اور والدہ ماجدہ کی جانب سے حسینی ہیں۔ آپ کے مرشد شیخ ابوسعید مخزومی تھے جو اپنے وقت کے مشہور عارف باللہ اور قطب الاقطاب تھے اور شیخ ابوالحسن ہنکاری کے خلیفۂ اجل تھے۔ حضرت شیخ جیلانیؒ نے شیخ تاج العارفین ابوالوفاؒ سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔

چشتیہ سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور سہروردیہ سلسلہ کے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی آپ کے فیض یافتگان صحبت میں شامل ہیں۔ علم و عمل، زہد و تقویٰ اور فقر و استغنا میں بے مثال شخصیت کے حامل تھے مسلکاً حنبلی تھے اور کئی ایک کتابوں کے مصنف تھے جن میں "فتوح الغیب" اور "غنیۃ الطالبین" آپ کی اہم علمی یادگار ہیں۔

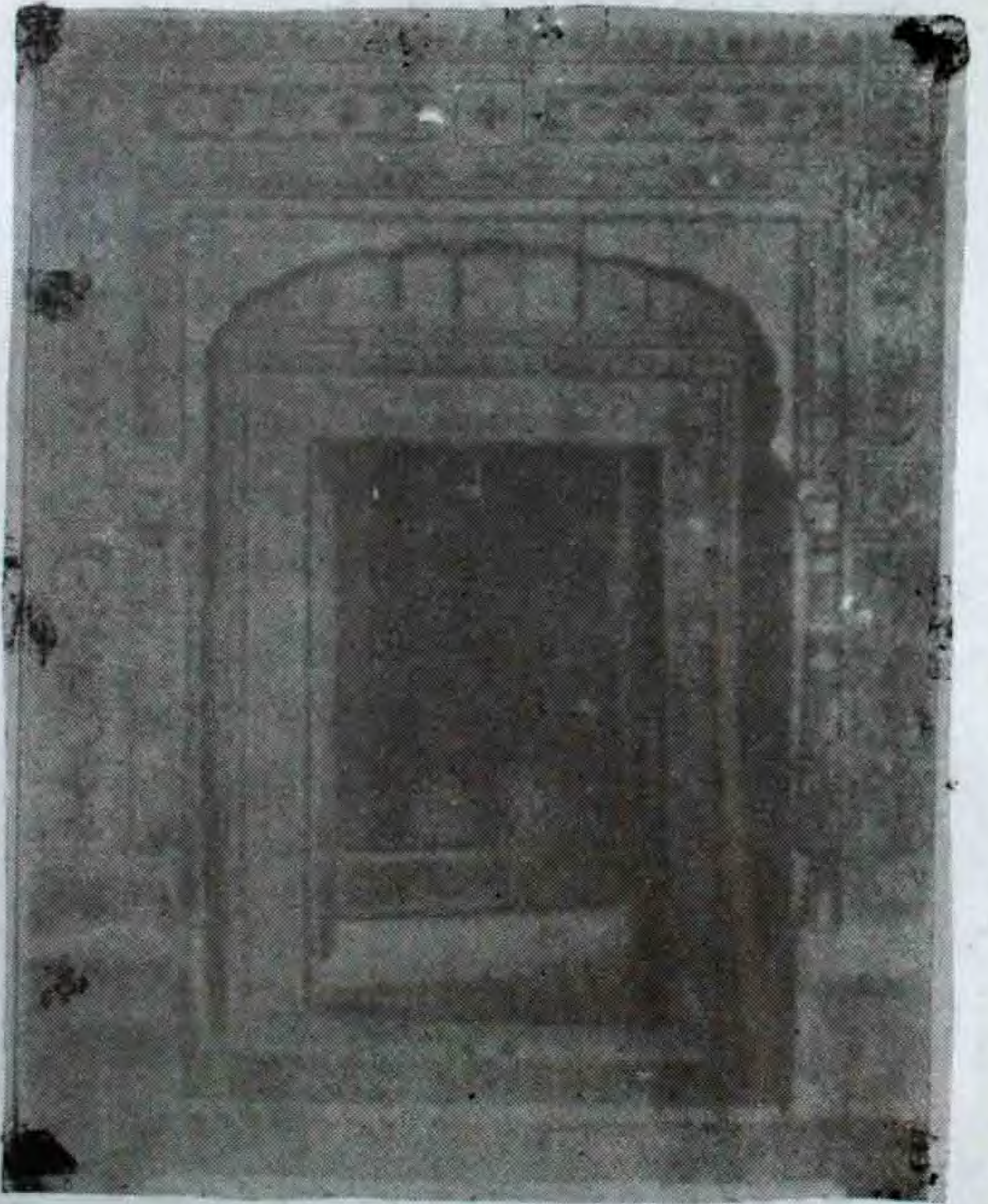
حضرت شیخ کا وصال بغداد میں ۹ ربیع الثانی ۵۶۱ھ میں ہوا۔ مزار مبارک مرجع خلائق اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت سید محمد غوث

حضرت سید محمد غوث اوچی کا اوچ میں ورود

---

[1] ہالہ حیدرآباد سندھ کی تحصیل کا صدر مقام اور پرانا شہر ہے۔



خانوادہ گیلانی اوچ کے اولین بزرگ حضرت بندگی محمد غوث
کے مزار کا بیرونی منظر

۸۸۷ھ میں ہوا۔ آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے تھے۔ شجرۂ نسب حسب ذیل ہے۔

"مخدوم شیخ محمدؒ غوث بن شمس الدین حلبی بن سید شاہ میر بن سید علی بن سید مسعود بن سید احمد بن سید صفی الدین بن سید سیف الدین عبدالوہاب بن سید عبدالقادر جیلانیؒ"

آپ کے اجداد میں سید ابوالعباس احمد بن سید صفی الدین، ہلاکو کے حملہ بغداد میں ترک وطن کر کے حلب (شام) میں اقامت گزیں ہوئے۔ اس نسبت سے آپ کو حلبی کہتے ہیں۔ صاحب شجرۃ الانوار سید اصغر علی گیلانی کے حوالہ سے تحفۃ الابرار[1] میں لکھا ہے۔

"بزرگان حضرت معروف اوّل سید ابوالعباس احمد بن سید صوفی معہ برادر خورد سید ابو سلیمان احمد کہ سلسلہ شیخ سلیم چشتی طریقۂ قادریہ میں آپ کے ساتھ پہنچتا ہے۔ وقتِ ہنگام ہلاکو خاں و قتل عام و تاراج بغداد کے بغداد سے نکل کر روم اور پھر حلب ولایت شام میں جا کر وطن اختیار کیا اور وہاں سید محمد غوث پیدا ہوئے۔"

سید محمد غوث عنفوان شباب میں خراسان و ترکستان اور عرب و عجم کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے اور کچھ عرصہ لاہور اور ناگور میں قیام پذیر رہے۔ پھر وطن واپس تشریف لے گئے اور اپنے والد ماجد سے ہندوستان میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ کے والد ماجد نے فرمایا "میری زندگی تک میرے پاس رہو بعد میں اجازت ہے جہاں چاہو سکونت اختیار کرلو۔ چنانچہ آپ اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد خراسان کے راستے ہندوستان تشریف لائے اور ایمائے غیبی سے اوچ میں قیام فرمایا۔ سلسلہ قادریہ کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے بڑا فروغ نصیب ہوا اور بے شمار بندگان خدا نے آپ سے روحانی فیض پایا۔ سلطان حسین مرزا حاکم سندھ اور سلطان سکندر لودھی بھی آپ کے مرید تھے۔ آپ کے فرزندگان سید عبدالقادر ثانی، سید عبداللہ ربانی مبارک حقانی اور سید محمد نورانی بھی پایہ کے بزرگ گزرے ہیں۔

---

[1] تجلیات جہ ولیہ، احوال اولیاء اللہ موسوم بنام تاریخی تحفۃ الابرار (۱۳۲۳ھ)، ترجمان شمالک فی البیان مغفرت حالوار، حالیہ قادریہ، ...

حضرت سید محمد غوث گیلانی علم و فضل میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ شعر و سخن کا ذوق بھی قدرت کی طرف سے آپ کو ودیعت ہوا تھا۔ آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ قادری تخلص فرماتے تھے۔ اپنے جد اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب میں اکثر قصائد کہے ہیں۔ اخبار الاخیار میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے آپ کے کلام بلاغت التزام کا ایک نمونہ درج کیا ہے، جسے ہم یہاں تبرکاً پیش کر رہے ہیں۔

رندیم و قلندریم و چالاک — مستیم و معربدیم و بے باک
جامیم و صراحیم و بادہ! — دریم و صدفیم و بحر و خاشاک
والی ولایت شش و پنج — حامی بلاد و فہم و ادراک
مجموعہ راز عالم کون — منصوبہ کشائے سر لولاک
بگذشتہ ز خویش بے کدورت — بگذشتہ ز عشق جوہر خاک
آئینہ صاف بے غل و غش — صافی دل و پاک رای و شکاک

گر صاف شوی و پاک دائم!
میگوئی چو قادری تو ناپاک!

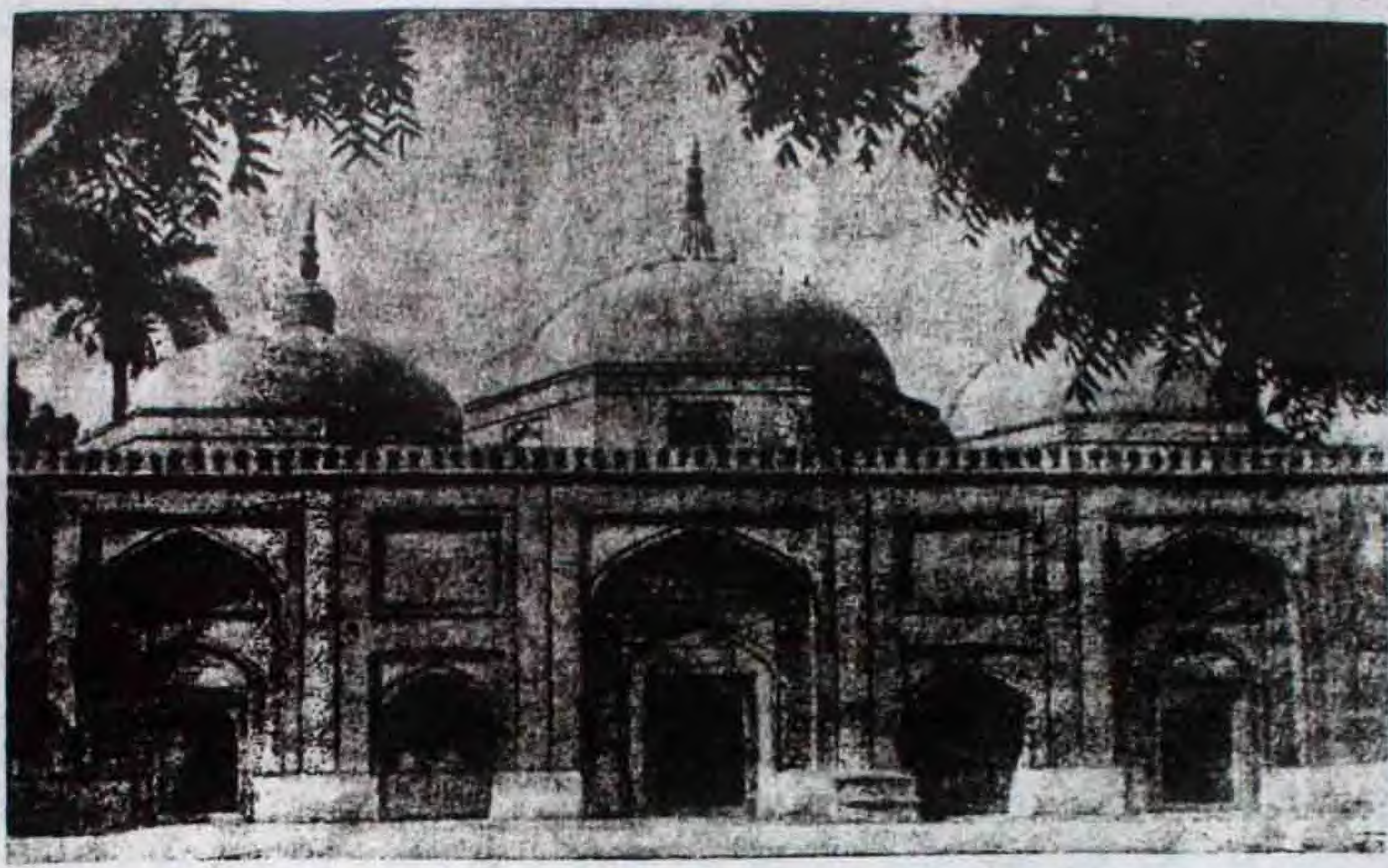
یہ شعر بھی آپ کا ہے

بلبل بوستان تقدیسم — شاہباز سفید دست نعیم

آپ کا انتقال اُچ میں ۹۲۳ھ میں ہوا۔

مخدوم شیخ عبدالقادر جیلانی ثانیؒ

آپ حضرت سید محمد غوث گیلانی حلبی اوچی کے فرزند ارجمند ہیں، علم و عمل کے جامع اور کمالات ظاہری و معنوی کے حامل تھے اور صحیح معنوں میں اپنے جد امجد اور مورث اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ کے حقیقی جانشین تھے۔ جوانی میں طبیعت میں شوخی اور رنگینی تھی۔ عیش و عشرت کے اسباب اور آلات طرب میں بہت زیادہ انہماک تھا۔ حتیٰ کہ سفر تک میں گانے بجانے کا سامان اپنے ساتھ رکھتے تھے۔



جامع مسجد اوچ گیلانی جو حضرت بندگی غوث کے مزار سے ملحق ہے

ایک مرتبہ اوچ کے جنگل میں شکار کی غرض سے گھوم رہے تھے۔ اتنے میں پپیہا نے پی کہاں کی تان اڑائی ایک درویش بھی اس جنگل میں کہیں سے آ نکلا۔ اس نے ماجرا دیکھا تو کہنے لگا۔

"سبحان اللہ! روزے باشد کہ ایں جوان نیز از تعلق محبت مولیٰ جل و علا ہم چو ایں دراج نالہ و فریاد کند۔"

"یعنی ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ نوجوان حق تعالیٰ کی محبت میں بیقرار ہو کر اس پپیہا کی طرح نالہ و شیون کرے گا"

آپ نے درویش کی یہ بات سنی تو دل کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اسی وقت سب کام دھندے چھوڑ کر یادِ حق میں مشغول ہوئے اور پھر ساری زندگی ادھر طرف کا رخ نہ کیا۔ روز بہ روز روحانی کیفیات میں ترقی ہونے لگی اور طبیعت پر جذب و مستی کے اثرات اس درجہ غالب آئے کہ یادِ حق کے سوا اور کسی بات کی سدھ بدھ ہی باقی نہ رہی۔

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیثِ یار کہ تکرار مے کنیم

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شیخ کے والد ماجد حضرت سید غوثؒ کے پاس تحفہ میں مخملی تھان آئے۔ آپ نے وہ کپڑا حضرت سید عبدالقادر کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ وہ اس سے اپنا چغہ تیار کرا لیں لیکن آپ نے چغہ کی بجائے اپنے شکاری کتوں کے لئے گدے بنوا لئے۔ حضرت مخدوم کو علم ہوا تو بہت ناراض ہوئے اور اپنے پاس بلا کر خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اسی روز رات کو خواب میں حضرت جیلانیؒ نے حضرت شاہ محمد غوث کو تنبیہہ کی کہ "عبدالقادر میرا بیٹا ہے۔ اس کی نگہداشت میرے ذمہ ہے۔ تمہارے اور بھی بیٹے ہیں تم ان کی تربیت کرو اور اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو"

خواب کے اس واقعہ کی اطلاع جب سید عبدالقادر ثانی کو ہوئی تو آپ اپنے

تمام مشاغل دنیاوی سے تائب ہو کر ہمہ تن ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے شکاری کتوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ آلات طرب کو دُور ہٹا دیا اور زیب و زینت دنیاوی کے تمام ظاہری اسباب کو بالکل ترک فرما دیا۔ والد ماجد کے وصال کے بعد جب آپ مسند سجادگی پر متمکن ہوئے تو ترک دنیا کا یہ انداز قائم رہا۔ آپ نے بادشاہِ وقت کو لکھ بھیجا کہ تمہاری دی ہوئی جاگیریں اور تمہارے عطیات ہمارے کسی مصرف کے نہیں ہیں۔ اس لئے "عطائے تو بہ لقائے تو" کے مصداق یہ سب کچھ واپس کر رہا ہوں جسے چاہو دے دو۔ مجھے اب ان کی ضرورت نہیں ہے ایک مرتبہ بادشاہ نے آپ کو اپنے حضور طلب کیا اور لکھا کہ اگر حضور میرے پاس تشریف لائیں تو میرے لئے یہ عین سعادت ہو گی۔ اور آپ کی تشریف آوری سے مجھے بے حد مسرت ہو گی۔ اگر خدمت میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کے سلئے میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے جب بادشاہ کا یہ پیغام سنا تو جواب میں یہ دو شعر لکھ کر معذرت چاہی۔

بہ ہیچ باب ازیں باب روئے گشتن نیست!

ہر آنچہ بر سرما می رود مبارک باد!

کسیکہ خلعت سلطان عشق پوشیدہ است

بہ حلہائے بہشتی کجا بود دل شاد

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں بھی یہ روایت ملتی ہے کہ جب سلطان سنجر نے انہیں ایران کے صوبہ نیمروز کی گورنری کی پیش کش کی اور پروانہ تقرری بھیجا تو آپ نے اس کاغذ کی پشت پر یہ دو شعر لکھ کر اس پیش کش کو مسترد کر دیا تھا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد

در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب

من ملک نیم روزہ بہ یک جو نمی خرم

حضرت شیخ عبدالقادر ثانیؒ موصوف نے فقر و استغناء کی اس روایت کو جو ان کے جد بزرگوار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے قائم کی تھی از سر نو زندہ کیا اور بمصداق "الولد سر لابیہ" بادشاہی پر فقیری کو ترجیح دے کر اپنے آباء کرام کی مثال کو برقرار رکھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر ثانی کی والدہ محترمہ بڑی نیک اور پارسا خاتون تھیں۔ وہ سید ابوالفتح کی صاحبزادی تھیں جو سید صفی الدین گازرونی کی اولاد میں سے تھے۔ سید ابوالفتح بھی بڑے پایہ کے بزرگ اور تسخیر جنات اور علم حاضرات کے بڑے ماہر تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر ثانی عبادات و اعمال اور اوراد و اذکار میں بہت زیادہ مشغولیت رکھتے تھے اور مراقبہ و مجاہدہ اور ریاضت و طاعت میں اس درجہ انہماک تھا کہ پہروں کسی سے بات چیت کی نوبت نہیں آتی تھی۔ دن رات مسجد کے بوریئے پر فروکش رہتے۔ بارہا اسی عالم میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے اسی عالم میں مشرف ہوئے۔

جذب دروں کی تاثیر کا یہ عالم تھا۔ ایک نگاہ غلط انداز سے حاضرین مجلس کے دلوں کی کایا پلٹ دیتے۔ ایک مرتبہ ایک قوال خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا۔ "جاؤ توبہ کرو، اور سازوں کو توڑ ڈالو اور سر منڈوا کر درویش بن جاؤ۔" قوال پر حضرت والا کی نصیحت کارگر نہ ہوئی۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در زار بوم خس

نکاہ سرداروں میں سے ایک امیر بھی مجلس میں موجود تھا۔ اس نے یہ بات سنی تو فوراً اٹھا، سر منڈوایا اور تمام گناہوں سے تائب ہو کر حاضر خدمت ہوا اور حضرت موصوف کے سامنے آ کر رونے لگا۔ پھر یکایک کہنے لگا کہ میرا ایک بھائی گجرات میں تھا۔ ابھی ابھی اس کا انتقال ہوا ہے اور لوگ اس کا جنازہ لئے جا رہے ہیں یہ تھی حضرت موصوف کی نگاہ کی تاثیر کہ ایک دنیا پرست امیر کو ایک نظر میں صاحب

کشف و حال بنا دیا۔

حضرت مخدوم شیخ عبدالقادر ثانی نے ۷۸ سال کی عمر میں ۱۸ ربیع الاول ۹۴۰ھ میں انتقال فرمایا اور اپنے والد سید محمد غوث کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اوچ گیلانی میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

میراں سیّد مبارک حقانیؒ

آپ حضرت سید محمد غوث گیلانی کے فرزند ارجمند اور مرید و خلیفہ ہیں۔ طبیعت پر جذب و مستی کا غلبہ تھا اور ہر وقت استغراق کی کیفیت میں رہتے تھے۔ جب طبیعت قابو سے باہر ہو گئی تو آپ اوچ سے روانہ ہو کر کسی جنگل میں رونق افروز ہوئے۔ آپ کی نگاہ کی مستی کا یہ عالم تھا کہ جس پر ایک بار نظر ڈالتے وہ مست و بیخود ہو جاتا۔ جنگل میں قیام کے دوران حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ معروف چشتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپ سے خرقۂ ارادت و خلافت حاصل کیا آپ نے خواجہ معروف چشتی سے فرمایا "تم سے تصوف کا ایک جدید خانوادہ پیدا ہو گا۔ چنانچہ نوشاہیہ قادریہ سلسلہ حضرت خواجہ معروف چشتی کی طرف منسوب ہے۔ آپ کا وصال ۹۵۶ھ میں اوچ میں ہوا اور والد بزرگوار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

سید عبداللہ ربّانی

آپ بھی حضرت شاہ محمد غوث گیلانی کے فرزند ارجمند تھے۔ توکل میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے اور ولایت و کرامت میں اپنے آباؤ اجداد کے صحیح وارث اور جانشین تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ بے شمار بندگان خدا نے آپ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ۹۸۰ھ میں آپ کا وصال ہوا اور اوچ میں اپنے والد مرحوم کے مزار سے متصل دفن ہوئے۔

سید عبدالرزاق گیلانیؒ اور اُن کے فرزند

آپ حضرت سید عبدالقادر ثانیؒ کے فرزند گرامی ہیں۔ اپنے والد کے وصال کے بعد مسند سجادگی پر رونق افروز ہوئے۔ جب آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہوا تو آپ تعلیم کی غرض سے ناگور میں اقامت پذیر تھے۔ ٹھیک اس دن جب آپ کے والد دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ "والد ماجد مجھے بلا رہے ہیں" اور یہ کہہ کر وہاں سے اوچ کے لیے روانہ ہو گئے۔ آپ اوچ اپنے والد مرحوم کی تجہیز و تکفین کے بعد پہنچ سکے۔ سید عبدالقادر ثانیؒ کی وصیت کے مطابق آپ سجادہ نشین بنے۔ آپ نے ۵ جمادی الاخری ۹۴۲ھ میں انتقال فرمایا اور اوچ میں مدفون ہوئے۔

سید عبدالرزاق گیلانی کے بعد آپ کے سجادہ نشین سید حامد گنج بخش ہوئے جو آپ کے فرزند اور جلیل القدر خلیفہ تھے۔ اسباب دنیاوی کا وافر حصہ آپ کو عطا ہوا تھا مگر کبھی صاحب نصاب نہیں ہوئے۔ جو کچھ پاس ہوتا، فقراء و مساکین پر بے دریغ خرچ فرما دیتے۔ ۹۷۰ھ میں اوچ میں انتقال فرمایا۔ حضرت حامد گنج بخش بن سید عبدالرزاق کے بڑے صاحبزادے سید عبدالقادر ثالث تھے مگر حضرت موصوف نے گوناگوں خصائص کی بنا پر اپنے چھوٹے صاحبزادے سید ابوالحسن جمال الدین موسیٰ پاک شہید کو اپنا جانشین نامزد فرمایا۔ والد کی وفات کے بعد سید عبدالقادر ثالث نے والد کی وصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سجادگی کا اعلان کر دیا۔ حضرت موسیٰ پاک شہید ملتان تشریف لے گئے۔

باب پنجم

اوچ، ایک بستی، ایک تحریک، ایک تاریخساز شہر

برِ صغیر ہند و پاک میں گنتی کے چند شہر ایسے بھی ہیں جن کو ہماری ہیزدہ صد سالہ اسلامی تاریخ میں یہ اعزاز و مقام حاصل ہے کہ وہ ایک شہر کی بجائے ایک تحریک کا علامتی مرکز قرار پائے۔ ان شہروں کی تاریخی قدامت سے قطع نظر ان کی آبادیوں میں ہمارے کچھ ایسے بزرگوں کے نقوش پا ثبت ہوئے جو صرف اہم تاریخی شخصیتیں ہی نہ تھیں بلکہ وہ خود ایک "تاریخ ساز ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور گو مرور زمانہ کی دست برد نے ان شہروں کے نقش و نگار مٹا دیئے اور ان کی آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیا۔ تاہم ان بندگانِ حق نے ارشاد و ہدایت کی جو شمعیں روشن کی تھیں ان کی تابانیوں سے ایک عالم منور ہو رہا ہے اور ایک دنیا ان کی ضیا باریوں سے جگمگا رہی ہے۔

کسے کہ محرم باد صبا است مے داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

دہلی اور لاہور ہماری عظمت رفتہ کے بڑے پرانے امانت دار ہیں اور ان دونوں شہروں میں ہماری تاریخ ملی کے ایسے گنجہائے گراں مایہ دفن ہوئے جن پر یہ دھرتی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی لیکن اس باب میں اولیت و قدامت کا

شرف جس سرزمین کو حاصل ہوا وہ سندھ کا خطہ ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جو پہلے پہل انسانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا اور یہی وہ سرزمین ہے جو سب سے پہلے مجاہدین اسلام کے قدموں کی جولانگاہ بنی اور جسے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اس کی مٹی میں کئی ایسے لوگ دفن ہوئے جو اپنے وقت کے بڑے بڑے نامور عالم، محدث، فقیہہ، ادیب، مورخ اور اہل فضل و کمال تھے۔

پھر سندھ کے علاقہ میں جو ایک زمانہ اٹک سے لے کر گجرات کاٹھیا واڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ خصوصی امتیاز اوچ کی بستی کو حاصل ہوا کہ وہ برصغیر میں پیدا ہونے والی مختلف سیاسی، مذہبی اور روحانی تحریکات کا سرچشمہ بنی۔

اس برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی خود مختار ریاست "منصورہ" کا قیام اسی بستی کے ایک شخص عبدالعزیز بن منذر کے سیاسی تدبر کا نتیجہ تھا۔

پھر اسی بستی کو اولیت کا یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس برصغیر میں یہاں پہلی مذہبی اور روحانی درس گاہ قائم ہوئی اور چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں اوچ میں ایک ایسے دارالعلوم اور ایک ایسی خانقاہ کی بنیاد رکھی گئی جو اپنی نوعیت کی پہلی مثالی درس گاہ تھی۔ افسوس کہ قرامطہ کے عروج نے تاریخ کے ان سنہری اوراق کو گم کر دیا ہے جو اس بستی کی علمی اور روحانی اہمیت کی داستان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے تاہم ہم آج بھی سید صفی الدین گاذرونی (وفات ۳۹۸ھ) کا مزار اس کی علمی اور دینی عظمت رفتہ کا گواہ ہے۔ ملتان پر سلطان محمود غزنوی کے حملہ کے بعد اوچ مسلمانوں کے ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی فرقہ "قرامطہ" کی جائے پناہ اور دارالامان بن گیا اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بہت بڑے علمی اور سیاسی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ سندھ کے مشہور قبیلہ سومرہ نے جو قرامطہ کی دعوت کو قبول کر چکا تھا۔ اوچ کی سیاسی اور جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اسے اپنا دارالحکومت مقرر کیا۔

محمود غزنوی نے قرامطہ کی سرکوبی کے لئے جس طرح ملتان کو تاخت و تاراج کیا شہاب الدین غوری نے بھی اوچ کی اسی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے اس پر حملہ

کیا کہ وہ اسلام دشمن قوتوں کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔

شہاب الدین غوری نے اوچ سے قرامطہ کے اثرات کو ختم کر کے یہ علاقہ ملتان سمیت اپنے معتمد سپہ سالار علی کرماخ کے سپرد کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس ملک کی باگ ڈور ناصرالدین قباچہ کے ہاتھ آئی جو شہاب الدین غوری کا معتمد غلام تھا۔

ناصرالدین قباچہ نے اوچ کو اپنی سندھ سے لاہور تک پھیلی ہوئی سلطنت کا پایۂ تخت بنا کر اس کی عظمت و وقعت چار چاند لگا دیئے۔ اس دور میں اوچ اس برصغیر کا ایک خوبصورت اور بہت بڑا شہر تھا جو وسعتِ رقبہ اور کثرتِ آبادی کے اعتبار سے دہلی کا ہم پلّہ بن گیا اور دراصل یہی اس کے عروج و ارتقا کا وہ عہد زریں ہے۔ جب اوچ نے اس برصغیر کی تاریخسازی میں ایک نمایاں امتیاز حاصل کیا اور یہاں ایسے ایسے باکمال لوگ جمع ہو گئے جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے، اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے اور اپنی استعداد و قابلیت کی بنا پر ہندوستان گیر اثرو نفوذ کے حامل تھے۔ اس زمانہ میں روحانی مرکز کی حیثیت سے خانقاہ گازرونیہ اور تعلیمی لحاظ سے درسگاہ فیروزیہ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اوچ ہی کا فیض تھا کہ ہمیں ہندوستان میں عربوں کی آمد کے تاریخی واقعات و حالات کا علم ہوا۔ "چچ نامہ" جو سندھ کے حالات پر پہلی مستند تاریخی کتاب ہے۔ اس کا مرتب اور جامع اوچ ہی کا باشندہ تھا اور اسی کی سرزمین میں آسودہ خواب ہے۔

جامع الحکایات اور لباب الالباب کا مصنف بھی اسی اوچ میں آکر اقامت گزیں ہوا اور یہیں اس نے اپنے علمی کارناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کو جو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور اس کی علمی وجاہت اور دینی قدر و منزلت میں جو چیز اضافہ کا باعث بنی، وہ اوچ کے مدرسہ فیروزیہ سے اس کے تعلق کی رہین منت تھی، اسی نسبت نے اسے شمس الدین التمش کا معتمد عالیہ بنایا اور اسی سبب سے وہ ناگور کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا اور بعد میں دہلی کی علمی مجلسوں اور محافل وعظ و ارشاد کی زینت بنا۔

غرضیکہ اوچ ایک ایسا مردم خیز خطہ تھا جس کی آغوش کتنے ہی نامور اہل علم و

فضل کے لئے وا ہوئی اور کتنے ہی گمنام لوگوں کو اس نے اوج ثریا پر پہنچا دیا۔

مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کا خاندان اسی سرزمین پر پھلا پھولا اور اوج کمال تک پہنچا۔

خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ نے اسی اوچ کی قدیمی مسجد میں جو مسجد حاجاتؒ کے نام سے مشہور ہے۔ ریاضت و مجاہدہ کی مشق بہم پہنچائی اور اس مسجد سے ملحق کنویں میں نماز" معکوس" ادا فرمائی اور یوں مقام ولایت کے ابتدائی مراحل انہوں نے یہیں طے کئے۔ خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلی نے بھی اوچ کی اسی مسجد میں چلہ کشی کی اور اعتکاف فرمایا۔

ہندوستان کا وہ خطہ جو سلاسل تصوف سے پہلے پہل روشناس ہوا اور جہاں تصوف کا قدیم ترین حلقہ قائم ہوا۔ وہ یہی اوچ تھا۔ جب چوتھی صدی ہجری میں بابا ابو اسحاق گازرونی کے بھانجے صفی الدین گازرونی نے یہاں ڈیرا ڈالا۔ دنیا بھر کے قدیم ترین سلاسل تصوف میں سلسلہ گازرونیہ کا شمار ہوتا ہے۔ گویا اس برصغیر میں تصوف کا آفتاب پہلے پہل اسی خطہ پر طلوع ہوا۔ اس کے بعد لاہور اور پھر اجمیر و دہلی کا نمبر آتا ہے۔

تصوف کے ایک اور خانوادہ حسینیہ بخاریہ سہروردیہ کا آغاز بھی اوچ ہی کی مردم خیزی کا ممنون کرم رہا ہے۔ اس خانوادے کے فیوض و برکات سے بعد میں پورے برصغیر نے تمتع اٹھایا اور ہند و بیرون ہند تک اس کے اثرات پہنچے۔

لے اوچ کے آثار قدیمہ کے ضمن میں اس مسجد کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے گا۔ یہ وہی مسجد ہے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مزار سے ملحق ہے۔

ے نماز معکوس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے یہ دراصل ریاضت اور نفس کشی کی ایک تدبیر تھی جو بعض بزرگوں نے بطور خود اختیار کی اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ طبیعت اس راہ کی پیش آمدہ مشکلات کی خوگر ہو سکے۔

اسی خانوادے کے گل سرسبد سید جلال سرخ بخاری تھے جن کے دم قدم سے اوچ کو وہ سرافرازی نصیب ہوئی کہ صفحۂ گیتی پر اس کے نقوش ہمیشہ کے لئے اجاگر ہو گئے اور پھر جو کچھ کمی باقی رہ گئی تھی اس کو مخدوم سید جلال سرخ بخاری کے پوتے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے اس طرح پورا کیا کہ دہلی اور گجرات کے سلاطین اس آستان کی خاک بوسی کو اپنے لئے عزت و شرف کا معیار قرار دینے لگے۔ [1]

اوچ کی عظمت کا سب سے بڑا سبب اور اس کی شہرت کا اصل باعث گروہ صوفیا کے وہ مقدس افراد تھے جنہوں نے اس بستی کو تصوف کی ایک عظیم درسگاہ میں تبدیل کر دیا اور ہند و بیرون ہند کے بے شمار اصحاب صدق و صفا یہاں وارد ہوئے اور یہاں سے تربیت پا کر اپنے اپنے علاقوں میں انہوں نے اسلام کی بھاری خدمات سرانجام دیں۔

اوچ کم و بیش پانچ سو سال تک اس عظیم الشان فلسفہ کا منبع بنا رہا ہے، جسے تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصلاح اخلاق اور درست داریٔ معاشرہ کی یہ عظیم الشان اور عالمگیر تحریک اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے ایک انقلابی تحریک تھی۔ یہی وہ انقلاب انگیز تحریک ہے جسے ویدانت اور گیان کے ازکار رفتہ نظریات کی بجائے اسلام کے قابل عمل نظریات و افکار کی ترویج و اشاعت ایک ایسے تیرہ و تار خطہ میں کی جہاں معرفت الٰہی اور توحید خداوندی کے تصور تک سے

---

[1] ملتان کو اوچ پر جو تفوق اور برتری حاصل تھی۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے زمانہ میں اور آپ کے بعد اوچ کی طرف منتقل ہو گئی چنانچہ یا تو یہ حال تھا کہ اوچ کے لوگ روحانی استفادہ کے لئے ملتان کا رُخ کرتے تھے اور یا پھر اوچ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ خود حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانی کے پوتے شیخ رکن الدین اسماعیل قریشی اوچ میں حضرت سید صدرالدین راجو قتال کی بارگاہ میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوئے۔ سچ ہے "شرف المکان بالمکین"۔

لوگ نا آشنائے محض تھے۔ اس تحریک کے علم برداروں نے اس ظلمتکدۂ شرک و بت پرستی میں انوارِ الٰہیہ کی وہ جوت جگائی کہ یہ برصغیر بجائے خود ایک مینار نور اور ایک چراغ ہدایت بن گیا اور اس کی روشنی سے ایک عالم منور ہوا اور خود مرکزِ اسلام سے لوگ کشاں کشاں اس مطلع ہدایت سے اکتساب نور کے لئے یہاں پہنچے۔

اس سلسلہ میں اوچ کا کردار بڑی امتیازی اہمیت و شان کا حامل ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں سب سے پہلے فلسفۂ تصوف کے قافلہ سالار آئے اور یہاں انہوں نے ایک خانقاہ قائم کی جو برصغیر میں تصوف کی پہلی باضابطہ درس گاہ تھی۔

یہی وہ شہر ہے جہاں سے اہل اللہ کے قافلے اور اہل حق کی جمعیتیں گروہ در گروہ ہو کر نکلیں اور تمام اطراف و اکناف عالم کو انہوں نے اسلام کے پیغام سے روشناس کرایا۔

تحریک تصوف سے وابستہ حضرات کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے سے قبل ہم چند باتیں خود اصل تصوف کے بارے میں عرض کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس باب میں مختلف حلقوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کا ازالہ ہو سکے اور اس نظریہ کی افادیت واضح ہو سکے

تصوف کا مفہوم امام شوکانی کے نزدیک یہ ہے کہ انسان شریعت حقہ کے اصول کی روشنی میں دنیا سے اس حد تک بے تعلق ہو جائے کہ نہ اس پر کسی کی تعریف کا کچھ اثر ہو نہ وہ تنقیص سے دل گرفتہ و ملول ہو اور تمام اغراض و خواہشات نفسانی سے اس حد تک بلند ہو جائے کہ مٹی اور سونا اس کی نگاہ میں برابر ہو جائیں۔ نیز باطنی امراض سے انسان کا دل پوری طرح پاک صاف ہو جائے۔ باطنی امراض سے مراد غرور، حسد، جھوٹ، خیانت، بغض، کینہ، تکبر، نخوت و رعونت، انانیت، ریاکاری اور اسی قسم کی دیگر بیماریاں ہیں۔

تصوف کی اصطلاح اگرچہ قرن اول کے مسلمانوں میں رائج نہیں تھی اور دوسری یا تیسری صدی ہجری میں اس لفظ کا استعمال شروع ہوا۔ تاہم یہ کوئی ایسا نظریہ نہیں

تھا جو در آمد کیا گیا ہو اور بعض دوسرے فلسفیانہ افکار کی مانند اسلام پر ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ یہ درحقیقت اسلامی تعلیمات کا لب لباب اور عطر و جوہر تھا اور ایک ایسے دور میں جب مادی اعتبار سے مسلمان دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوم بن چکے تھے۔ اس نظریہ نے جلائے روح، تصفیۂ قلب اور تزکیہ باطن کی اس کمی کو بہت حد تک پورا کر دیا جو اسباب عیش و تنعم کی فراوانی اور مال و دولت دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی ریل پیل کی وجہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں میں رو بہ آغاز ہو چکی تھی۔

تصوف، جیسا کہ بعض برخود غلط متجددین کا خیال ہے۔ قوم کی صلاحیتوں کے لئے سمِ قاتل ثابت نہیں ہوا بلکہ اسلامی معاشرہ کے روحانی ارتقاء اور سماجی اصلاح میں اس کی خدمات کا ریکارڈ قابل قدر ہے۔

در اصل جن لوگوں نے اسلام کے دورِ زوال میں اسلامی نظریات و افکار کے اس پہلو پر نظر ڈالی۔ ان کے خیال اور ان کی دانست میں ہر وہ نظریہ جو غلط ہاتھوں میں پڑ کر اپنی اصلیت سے محروم ہو گیا۔ وہ ضرور ہی مسلمانوں کے زوال کا موجب بنا ہوگا۔

اس غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر نے تصوف کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دیں اور اس غلط خیال کو تقویت، ان نام نہاد صوفیوں اور پیروں کے رویہ سے پہنچی جو "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک ہی چیز ایک بہتر ماحول میں خوشگوار نتائج پیدا کرتی ہے اور غلط ماحول میں اسی چیز کے اثرات انتہائی ناخوشگوار ثابت ہوتے ہیں۔ تصوف کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ جب مسلمان قوم بڑی تیز رفتاری سے ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھی تو تصوف نے اس قوم کی اخلاقی قدروں اور معاشرتی خوبیوں کو اجاگر کیا اور دنیا طلبی اور زر پرستی کے عالم میں بے نفسی اور بے نیازی کے جذبات کو فروغ دیا لیکن جب مسلمانوں کے انحطاط کا دور شروع ہوا تو گوشہ گیری و عزلت نشینی کو اصلی تصوف قرار دے دیا گیا۔

کر پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند تیرے

احوال وظروف کا یہ تفاوت ہر دور میں اور ہر مکتبہ فکر کے متعلقین میں رونما ہوتا رہا ہے اور یہ بالکل طبعی چیز ہے۔ صوفیا کرام کے حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہوا و ہوس کے ہنگامۂ رستخیز میں خودداری، خدا ترسی، بے نفسی اور بقول اقبال "قلندری و قباپوشی و کلہ داری" کی وضع بڑی آن بان کے ساتھ نباہتے رہے۔ مطامع دنیا سے ان کے دل اچاٹ اور اسباب ظاہری سے ان کی نیتیں بھری ہوئی تھیں۔ بڑے سے بڑا دنیادی لالچ انہیں ان کے جادۂ مستقیم سے منحرف نہیں کر سکا اور عہدہ و جاہ کی بڑی سے بڑی پیشکش انہیں ان کے مقام یقین سے متزلزل نہیں کر سکی۔ عربی شاعر نے شاید انہی کے بارے میں کہا تھا۔

تزول الجبال الراسیات وقلبهم

عن الحب لا یخلو ولا یتزلزل [1]

تاریخ میں بہت کم مثالیں ایسی ملیں گی کہ جب ایک شخص نے اپنی طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہو کر حیات چند روزہ کی آرائش و زیبائش اور راحت و آسائش کو ٹھکرا دیا ہو مگر صوفیا کے باب میں ایسی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں۔[2]

تخت سلطنت پر لات مار کر زہد و قناعت کی زندگی بسر کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور نیمروز (ایران) کے علاقہ کی گورنری کو جو مطلق العنان حکمرانی سے کم نہ تھی پائے حقارت سے ٹھکرا دینا ہر ایک کا مقدر نہیں ہے۔ [3]

---

[1] بڑے بڑے مضبوط پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں مگر ان کے دل محبت سے معمور رہتے ہیں اور تزلزل آشنا نہیں ہوتے۔

[2] ابراہیم بن ادھمؒ اور سید اشرف جہاں گیر سمنانیؒ

[3] یہ واقعہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ہے جنہیں سلطان سنجر نے نیمروز کی گورنری کے عہدہ کی پیشکش کی تھی مگر آپ نے اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ (اخبار الاخیار)

عالم خواب میں پیر و مرشد کے ایماء غیبی پر شیخ الاسلام کے منصب جلیلہ کو تیاگ کر دشت گردی و صحرا نوردی کی راہ پر چل نکلنا انہی لوگوں کا حصہ ہے جو متاع دنیا کی حقیقت سے واقف ہوں اور جن کی نظر ہمیشہ آخرت پر رہتی ہو۔ [1]

سرمدؔ غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار!
ایں دولت سرمدؔ ہمہ کس را نہ دہند

صوفیاء کے باب میں یہ ایک عام غلط فہمی موجود ہے کہ وہ شریعت کو اصحاب ظواہر کا اثاثہ قرار دے کر اس کو چنداں لائق اعتنا نہیں سمجھتے اور ان کا زیادہ زور طریقت اور معرفت پر ہوتا ہے لیکن جن لوگوں کی نظر صوفیاء کے حالات، ان کے کردار اور ان کے اقوال و افعال پر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ جاہل صوفیوں اور نا اہل پیروں کا پروپیگنڈہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے لے کر کسی بھی آج کے دور کے پڑھے لکھے اور پابند شریعت صوفی تک ہر ایک نے سب سے زیادہ زور شریعت کے اتباع پر دیا ہے اور اسی کو تصوف کی جان اور طریقت و حقیقت و معرفت کی اصل الاصول قرار دیا ہے۔ مولانا رومؔ کے پیر و مرشد نے جن کے بارے میں اول الذکر کا یہ شعر زبان زد عام ہے کہ ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے رومؔ تا غلام شمس تبریزی نہ شد

---

[1] حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو جب محمد تغلق نے شیخ الاسلام کا عہدہ تفویض کیا تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کے پیر و مرشد حضرت شاہ رکن عالمؒ نے جو اس وقت وفات پا چکے تھے خواب میں اس عہدے پر آپکے تقرر کو ایک فتنہ قرار دیا اور یوں آپ اس منصب سے دست بردار ہو کر حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اسی ایک نظم میں اتباعِ شریعت کو حاصل طریقت قرار دیا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں۔

شریعت را مقدم دار اکنوں طریقت از شریعت نیست بیروں

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ فرماتے ہیں۔

"علی الدوام باید کہ نفس خود را نصیحت گر باشد تا سعادت ہر دو جہاں یابد و سنت پیغمبر علیہ السلام را متابعت کند تا سعادت و کرامت سرمدی یابد (مقرر نامہ قلمی مکتوبات حضرت مخدوم)"۔

ترجمہ:۔

"ہمیشہ اپنے نفس کو سمجھاتے بجھاتے رہنا چاہئے تاکہ دونوں جہان کی نیک بختی نصیب ہو سکے اور پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی اتباع اختیار کرے تاکہ دائمی خوش نصیبی اور عزت کا مستحق ہو سکے۔"

حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندی اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

نقد سعادت دارین وابستہ بہ اتباع سید کونینؐ است و بس علیہ وعلی آلہ من الصلوٰت افضلہا و من التسلیمات اکملہا۔

ترجمہ:۔ دونوں جہاں کی سعادت کا سرمایہ صرف سرور کائنات حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے۔

حکیم شیراز شیخ سعدیؒ جو بیک وقت عالم باعمل بھی تھے اور صوفی کامل بھی اور جنہیں حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل تھا، فرماتے ہیں۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید !!! کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید
محال است سعدیؔ کہ راہِ صفا توان رفت جز در پئے مصطفےٰ

اور آخر میں ہم اس دور کے مردِ قلندر علامہ اقبالؒ کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جن کا کلام معرفت و تصوف کا شاہکار ہے اور جو خود کو پیر رومی کا

مرید قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

تصوف کی اس انقلاب انگیز فکری و عملی تحریک کو اس پورے برّصغیر میں، پھیلانے اور عام کرنے میں سب سے زیادہ حصہ اوچ کے بزرگانِ طریقت کا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں اس تحریک کو فروغ دیا جب ہندوستان بیرونی حملہ آوروں کی یلغار کا سب سے بڑا ہدف بنا ہوا تھا اور ہر طرف ہوا و ہوس کے جذبات عام تھے۔ اس پُر آشوب دور میں صوفیائے کرام کی خدمات بڑی مفید، کار آمد اور دور رس اثرات و نتائج کی حامل ثابت ہوئیں۔ اوچ کے بزرگانِ دین اور اولیاء و مشائخ کا کام صرف بندگانِ خدا کی اصلاح تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ دوگونہ فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ایک طرف روحانی محاذ پر انہوں نے پورے برّصغیر کو اپنے علمی و عملی فیضان سے سیراب کیا اور دوسری جانب جہاں جہاں مسلمان مادی اعتبار سے کمزور تھے وہاں پہنچ کر انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کی رسم و راہِ پیغمبری کو از سر نو زندہ کیا۔

اس سلسلہ میں حضرت سید جلال مجرّد سلہٹی کی مثال ہمارے سامنے ہے جو حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کے نواسے اور حضرت سید احمد کبیرؒ کے بھانجے اور تربیت یافتہ مرید تھے۔ حضرت سید جلال اپنے ماموں کے زیر سایہ ۳۰ برس تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہے تھے اور جب تصوف و سلوک کی تمام منازل طے کر چکے تو آپ نے اپنے مرشد و بزرگ سے مؤدبانہ درخواست کی کہ "اب جب کہ میں جہادِ اکبر کے مراحل کو بہ خیر و خوبی سر کر چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اعدائے دین کے مقابلہ میں جہادِ اصغر کے فریضہ کو سرانجام دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں"۔ حضرت سید احمد کبیرؒ اپنے سعادت مند مرید کی اس درخواست کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور اوچ کے تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے مریدین و

خلفا کے نام اس مضمون کے خطوط جاری کئے گئے کہ "اس فوجی مہم میں شریک ہونا نہایت مستحسن ہے اور جنہیں جہاد میں حصہ لینے اور راہِ خدا میں تیغ زنی کے جوہر دکھانے کا شوق ہو وہ ایک ہفتہ کے اندر اندر اوچ پہنچ جائیں"۔ چنانچہ بے شمار لوگ اس پیغام کو پا کر اوچ پہنچ گئے۔ اس گروہ مریدین میں سے انتخاب صرف سات سو اہل اللہ کا ہوا کہ ان میں ہر ایک بزرگ اپنے دور کا قطب اور اپنے عہد کا ولی اللہؒ اور مقتدائے انام تھا۔ اس زمانہ میں بنگال میں مسلمانوں کا بڑا بُرا حال تھا۔ ان کے قدم وہاں نہیں جم رہے تھے اور انہیں اپنی مددی قلت کی بنا پر نازک صورتِ حال کا سامنا تھا۔ حضرت سید جلال مجرد سلہٹی نے ایک ہزار میل کی مسافت طے کی[1] اور بنگال کے راجہ گوڑ گوبند[2] کو شکست دے کر اس دُور افتادہ اور دشوار گزار علاقے کو فتح کر لیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اوچ سے سات سو افراد کی جو جمعیت بنگال گئی۔ بنگال پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد صرف تین سو تیرہ رہ گئی تھی۔ باقی حضرات کو حضرت جلال مجرد سلہٹی اثنائے سفر میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر تبلیغ و اشاعت دین کے لئے متعین کرتے گئے جس سے یہ تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تاہم تعداد کی یہ کمی بھی ان حضرات کی مجاہدانہ پیش قدمی پر اثر انداز نہیں ہو سکی اور حضرت موصوف نے اخلاقی اور روحانی قوت سے اعدائے حق کو پے در پے شکستیں دیں۔

---

[1] شاہ جلال الدین سہروردیؒ سلطان شمس الدین فیروز شاہ کے زمانے میں سلہٹ تشریف لائے تھے — شمس الدین فیروز شاہ سلطان رکن الدین کیکاؤس کا لڑکا اور ناصر الدین بغرا خاں کا پوتا تھا۔

[2] گوڑ گوبند کی وجہ تسمیہ کے بارے میں سیل مین کی روایت یہ ہے کہ یہ راجہ گوڑ کا بادشاہ تھا اس لئے اسے گوڑ گوبند کہتے تھے۔ اس کے بارے میں عام شہرت یہ تھی کہ وہ جادو کے فن کا ماہر ہے اور کوئی دنیاوی طاقت اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتی۔ بنگال کا جادو ویسے بھی مشہور ہے۔ حضرت سید جلال مجرد سلہٹی نے تصرف باطنی سے کام لے کر نہ صرف اس کے جادو کو بے کار کر دیا بلکہ اپنی روحانی قوت کے ذریعہ اس کی مادی طاقت کا سارا بھرم بھی ختم کر کے رکھ دیا۔

دیکھا جائے تو یہی وہ نفوس قدسیہ تھے جو ہندوستان میں اسلام کے آثار ابد قرار کو زندہ رکھنے کا باعث بنے اور قیام پاکستان کے تاریخی پس منظر کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ اس برصغیر میں ایک زبردست اور عظیم اسلامی مملکت کو معرض وجود میں لانے والوں میں اوچ کے ان سہروردی بزرگوں کا نام سر فہرست ہے۔

تاریخ بنگال مرتبہ سر جادو ناتھ سرکار میں مختلف مغربی اور غیر مسلم مورخوں نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے چنانچہ مسٹر اسٹیپلٹن لکھتے ہیں۔

"قرون وسطیٰ کے ان اولیاء مجاہدین کا اسلام کی تاریخ میں وہی مرتبہ ہے جو صلیبی جنگوں میں ٹمپلر[۱] مجاہدین کا تھا۔ اگرچہ ان اولیاء کرام کی اخلاقی حالت مسیحی بہادروں سے بدرجہا بہتر تھی"۔ ایک ہندو مورخ نے حضرات صوفیا کی ملی اور قومی کارگزاریوں پر بڑے دلچسپ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ محولا بالا تاریخ بنگال میں ڈاکٹر کالیکا رنجن قانون گو کا یہ بیان مندرج ہے کہ

"بلبنی سلاطین کے عہد حکومت میں نہ صرف بنگال میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ اس کی بنیادیں زیادہ گہری ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اولیا کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے عمل پارسائی، قوتِ عمل اور دور اندیشی میں بڑھ کر تھے، بنگال میں وسیع پیمانہ پر تبلیغ شروع کی۔ ان کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی بلکہ ان کا مذہبی جوش اور ان کی عملی زندگی اس کا باعث تھی۔ وہ نچلے طبقہ کے ان ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جو اس وقت بھی توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ میں گرفتار تھے۔ دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہو کر اسلامی حکومت کے لئے ایک نئی تقویت کا ذریعہ ہو گئے۔ بنگال کی فوجی اور سیاسی فتح کے سو سال بعد صوفیانہ سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے اس سرزمین میں مسلمانوں کے اخلاقی اور روحانی غلبہ کا سلسلہ شروع ہوا۔"

---

[۱] یہ لوگ مسلمانوں سے لڑنے اور عیسائی مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے تھے۔

سرجادو ناتھ سرکار کی رائے اس باب میں بڑی وقیع ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کی فتح بنگال کے وقت (۱۲۳۰ء) سے کئی صدیاں پہلے مشرقی بنگال کے عوام، اور فی الحقیقت بہت سے شرفاء کا مذہب ہندومت کا تن ترک (Tantric Hinduism) طریقہ رائج تھا جو بدھ مت کی ارواح پرستی اور جادو سے جو اب بھی تبت میں رائج ہے کچھ مختلف نہ تھا۔ ہندوؤں کے عہد حکومت میں سنسکرت کے عالم، ہندو وید اور بڑے بڑے ہندو پنڈت مغربی بنگال سے دریا کو عبور کر کے مشرق میں آتے اور مشرقی بنگال میں آباد ہو جاتے۔ اس طرح مشرقی بنگال کے مندروں اور مشہور استھانوں کی زیارت کرتے لیکن وہ سوسائٹی کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور مشرقی بنگال کے بڑے شہروں اور دولت مند استھانوں سے منسلک تھے۔ لیکن جب ندیا اور گوڑ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو یہ تمدنی آمد و رفت بھی ختم ہو گئی اور اس کے بعد عرصہ تک بنسا، برہم پتر کے مشرقی علاقہ میں لوگ ہندو رہے لیکن ان کا مذہب گوڑ کے ہندوؤں کا سا نہ تھا۔ ان کے ہاں نہ تو لکھے پڑھے برہمن پجاری تھے نہ سنسکرت کی مقدس کتابیں تھیں اور نہ ہی ویدک رسومات جاری تھیں۔ تقریب تقریب ہر جگہ ان کی پوجا پاٹھ کی رسمیں ان پڑھ مظاہر پرست پجاری ادا کرتے تھے۔ یہ پجاری بھوت پریت کے ماننے والے اور جادو ٹونے کے ماہر (witch Doctor) سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت مشرقی بنگال کے ہندو عوام کی یہ حالت تھی کہ تعلیم یافتہ آریہ پرست انہیں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے درمیان ایسے برہمن موجود نہیں تھے جو انہیں مذہبی تعلیم دیتے یا ان کی مذہبی رسوم کو پوری طرح بجا لاتے۔ فی الحقیقت کا مردپ اور اراکان کے منگول بدھ مت والوں کی طرح وہ بھی گویا ایک ایسا گلہ تھے جس کا گلہ بان کوئی نہ ہو اس لئے جب سلہٹ کے شاہ جلال اور اسلام کے دوسرے مبلغین وہاں اشاعت مذہب کے لئے پہنچے تو ان کے مقابلہ کے لئے ہندومت کا کوئی لائق پجاری سامنے نہ آیا اور مشرقی بنگال کے ہندو بڑی آسانی سے ارواح پرستی (Tantric)

کو چھوڑ کر گردو در گرد: مسلمان ہو گئے۔ سلہٹ اور راجگیر (جنوبی بہار) کے ابتدائی مسلمان مبلغین اور ان کے ہاتھوں مقامی ہندو پروہتوں یعنی جوگیوں کی زور کرامت سے شکست کا دراصل یہی مطلب ہے۔ ؎

مذکورہ بالا تینوں بیانات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ بنگال بالخصوص مشرقی بنگال میں اسلام کا فروغ و اشاعت مسلمان صوفیا کی تبلیغی کوششوں کا رہین منت ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تصوّف کی تحریک کیسی جامع اور کس قدر اثر انگیز تحریک تھی اور اس تحریک کو عام کرنے میں بزرگان اوچ کا کتنا زبردست حصّہ ہے۔

سید جلال مجرد سلہٹی کے اس واقعہ سے صوفیا کے بارے میں پھیلی ہوئی ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے جو بعض حلقوں میں اس باب میں موجود ہیں۔ تصوف بذاتِ خود ایک زبردست اخلاقی فلسفہ تھا اور بالخصوص ہندوستان جیسے ملک کے لئے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جہاں پہلے ہی سے ویدانت اور روحانیت کا چرچا تھا۔ یہ صوفیاؒ ہی کا گروہ تھا جس نے ہر محاذ پر اسلام کو سرافراز کیا اور اس برِّ صغیر کے دُور دراز کونوں میں تعلیماتِ اسلام کی روشنی پھیلائی اور یہاں کی مذہبی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

اور جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اس انقلاب میں اوچ کی بستی کے باسیوں کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے اور اس کی تفصیلات آئندہ باب "شمعیں جو باہر روشن ہوئیں" میں زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھنے میں آسکیں گی۔

؎ تاریخ بنگال مرتبہ سرجادو ناتھ سرکار صفحہ ۲۲۷، صفحہ ۲۲۸۔

باب ششم

شمعیں جو باہر روشن ہوئیں

اوچ کی حیثیت اس برّ صغیر میں ایک ایسے اسٹور روم کی تھی جہاں دلوں کی دنیا کو منور کرنے کا تمام ذخیرہ موجود تھا۔ یہاں ہر درجہ اور ہر معیار کے لوگ پہنچے، کچھ ایسے تھے کہ بقول حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ تیل بتی ساتھ لے کر آئے تھے، صرف ان کو روشن کرنے کی ضرورت تھی۔ کچھ ایسے تھے کہ گو خود روشن تھے مگر ان کی لو تیز کرنے کی ضرورت تھی، کچھ ایسے بھی تھے کہ انہیں سارا مسالہ یہیں سے فراہم ہوا، بہرحال یہاں جو بھی آیا اور جس ظرف و استعداد کے ساتھ آیا، خالی ہاتھ واپس نہیں پھرا۔

طالبانِ علم و فن ہوں یا سالکانِ طریقت، رہ نوردانِ منزلِ شوق ہوں یا جادہ پیمایانِ جذب و سلوک سب کے لئے اوچ کی بستی ایک ایسا مقام تھا جہاں رُکے بغیر نہ سفر کی درماندگی کم ہو سکتی تھی نہ پیش آئند سفر کے لئے زادِ راہ مہیا ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہر مسافر یہاں رکتا تھا اور ہر واماندۂ شوق کو یہاں پناہ ملتی تھی۔ فیضی نے کشمیر کے بارے میں کہا تھا

ہزار قافلۂ شوق می شود دل گیر
کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

لیکن اوچ کے تپتے ہوئے ریگستان اور جلتے ہوئے صحرا میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ سمرقند و بخارا کے سرسبز و شاداب خطوں کے لوگ یہاں آکر بسے اور ایران و روم کے باسیوں نے اس شہر کی جاروب کشی کو حاصل زندگی قرار دیا۔

اوچ کے علمی و روحانی و تاریخ و حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایسی ایسی شخصیتوں کا ورود ہوا اور اس مرتبہ و شان کے لوگ یہاں آئے کہ چشمِ فلک جن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ان بیرونی شخصیتوں میں کچھ لوگ تو یہاں آئے اور ایسے آئے کہ پھر یہیں کی مٹی میں آسودہ ہو گئے ان میں علماءُ و فضلاءُ بھی تھے، اہل رائے و تدبیر بھی تھے اقطاب و ابدال بھی تھے، ارباب فکر و فن بھی تھے اور اصحاب کمال بھی۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کے بہترین نمائندہ لوگوں کا یہاں ایک زمانہ میں جمگھٹا رہا ہے۔

لیکن اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو یہاں کی روحانی درس گاہوں میں تربیت پانے کے لئے آئے انہوں نے یہاں کی خانقاہوں اور یہاں کے مدرسوں میں بڑا وقت گزارا اور پھر اپنے اساتذہ اور پیرانِ طریقت کی ہدایت کے مطابق برصغیر کے مختلف مرکزی مقامات پر جا بسے اور ہدایت و اصلاحِ خلق کے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور نہ صرف اپنا اور اپنے خانوادۂ طریقت کا نام روشن کیا بلکہ اوچ کی عظمت و شہرت میں بھی اضافہ کا موجب بنے۔

ہندوستان کا کوئی قابل ذکر خطہ ایسا نہیں ہے جہاں اوچ کے منتسبینِ بارگاہ کی خانقاہیں موجود نہ ہوں کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر شہر اور ہر بستی میں کسی نہ کسی ایسے بزرگ کا سراغ ضرور ملے گا جو یا تو حسب و نسب کے اعتبار سے اوچ سے نسبت رکھتا ہو گا یا پھر اوچ کی کسی علمی یا روحانی درسگاہ کا تربیت یافتہ ہو گا۔ بالخصوص خانوادۂ بخاریہ اوچ کے منتسبین سے تو اس برصغیر کا شاید ہی کوئی شہر خالی رہا ہو۔ ہم یہاں ان نامور علمی اور روحانی شخصیتوں کا مختصر سا تذکرہ کر رہے ہیں جن کی لوحِ تقدیر پر اوچ کا نام کندہ ہے اور جو اس مرکز علم و عرفان

اور اس چشمہ روحانیت سے فیضیاب و سیراب ہوئے اور اس برصغیر کے مختلف گوشوں میں خود ان کا وجود چشمۂ خیر و برکت ثابت ہوا۔

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما!!

سید اشرف جہانگیر سمنانی

اسم گرامی محمد اشرف اور لقب جہانگیر تھا۔ ولادت با سعادت سمنان (شیراز) میں ہوئی۔ آپ کے والد محمد ابراہیم سمنان کے حاکم تھے۔ والدہ ماجدہ کا نام خدیجہ بیگم تھا جو خواجہ احمد یسوی کی صاحبزادی تھیں۔ سید اشرف سمنانی نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک تجوید کے ساتھ حفظ کر لیا اور چودہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ التحصیل ہو گئے۔ اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد سمنان کے تخت سلطنت پر بیٹھے لیکن طبیعت ابتدا ہی سے فقر و درویشی کی طرف مائل تھی آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت سے بادشاہت چھوڑ کر درویشی اختیار کی اور مسند حکومت اپنے چھوٹے بھائی سلطان محمد کے سپرد کر کے اوچ کا قصد کیا جو اس زمانہ میں تصوف و روحانیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جب آپ اوچ پہنچے اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کی خدمت میں باریابی نصیب ہوئی "لطائف اشرفی" کی روایت کے مطابق حضرت مخدوم نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔

"بعد از مدتے بوئے طالب صادق بہ دماغ رسیدہ و بعد از روزگارے نسیم از گلزار سیادت وزیدہ فرزندا بسیار مردانہ برآمدہ ای مبارک باد زود قدم در راہ نہ برادرم علاؤ الدین منتظر مقدم شریف ہستند زینہار در راہ جائے نمانی" (لطائف اشرفی ج ۲ صفحہ ۹۴)

"ایک مدت کے بعد ایک سچے طلبگار حق کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا ہے اور ایک عرصہ کے بعد چمنستان سیادت کی باد خوشگوار

کا جنونکا آیا ہے۔ بیٹے تم نے بڑی ہمت کی ہے۔ مبارک ہو اس راہ میں جلد سے جلد قدم بڑھاؤ۔ میرے بھائی علاؤالدین تمہاری آمد کے منتظر ہیں، راستے میں کہیں نہ رکنا۔"

شیخ علاؤالدین علاؤالحق بن اسعد لاہوری خانوادہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے اور بنگال میں مقیم تھے۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اوچ سے سیدھے بنگال کا رُخ کیا اور اپنے پیر و مرشد کی صحبت میں رہ کر اسرار باطنی سے بہرہ یاب ہوئے۔ خانوادہ سہروردیہ میں آپ کو خلافت و اجازت حضرت مخدوم جہانیاں سے حاصل تھی۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کا انتقال ۲۷ محرم ۸۰۸ھ میں کچھوچھہ شریف میں ہوا۔ انتقال کے وقت عمر عزیز ایک سو بیس برس تھی۔ حضرت موصوف کے حالات و کوائف پر ایک کتاب "لطائف اشرفی" ملتی ہے جو آپ کے مرید خاص حضرت نظام الدین یمنی ملقب بہ حاجی غریب یمنی نے ترتیب دی تھی اس کا ایک نسخہ احمد آباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں موجود ہے۔

شیخ قوام الدین لکھنوی

آپ حضرت شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کے اکابر خلفاء میں سے تھے لیکن ان کے وصال کے بعد اپنے پیر بھائی حضرت خواجہ مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کے مرید ہو کر خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مرض الموت کے ایام میں آپ اوچ میں موجود تھے اور آپ ہی کی سفارش اور مشورے سے حضرت مخدوم نے مسند سجادگی اپنے صاحبزادہ مخدوم ناصرالدین محمود کی بجائے اپنے چھوٹے بھائی سید صدرالدین راجن قتال کے سپرد کی اس پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی اہلیہ اور حضرت مخدوم ناصرالدین محمود کی والدہ آپ سے ناراض ہو گئیں اور فرمایا جس طرح قوام الدین نے میرے بیٹے کو سجادگی سے محروم کر دیا ہے۔ اسی طرح اس کی اولاد بھی اس نعمت سے محروم رہے

ملتے گی۔ چنانچہ شیخ قوام الدین کے صاحبزادے نظام الدین محمد باوجودیکہ بڑے عالم و فاضل تھے مگر نعمت فقر و درویشی سے محروم رہے اور خلافت و سجادگی شیخ سارنگ کو نصیب ہوئی۔ شیخ قوام الدین کا انتقال ۸۴۰ھ میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

سید علم الدین پلائین

سید علم الدین پلائین سادات ترمذ میں سے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد میں سے میر سید کمال نام کے ایک بزرگ سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت (۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۵ء) میں ہندوستان تشریف لائے اور قصبہ کھنبل میں اقامت اختیار کی پھر سید علم الدین کے جد امجد نے کھنبل سے نقل مکانی کی اور مستقل رہائش قنوج میں اختیار کر لی۔ میر سید علم الدین نے حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا اور اپنے مرشد کے ایما پر جون پور تشریف لے گئے، جون پور کے حکمران سلطان ابراہیم مشرقی کے دربار میں پہنچے اور درباری امراء میں شمار ہونے لگے۔ پلاؤں کا قصبہ بطور جاگیر آپ کو دیا گیا۔

سید علم الدین اور سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مابین گہرے دوستانہ روابط تھے سید علم الدین کا انتقال ۸۰۸ھ میں ہوا اور اپنی جاگیر پلاؤں ہی میں دفن ہوئے۔

شیخ اخی راجگیری

ان کا اصل نام جمشید تھا لیکن چونکہ ان کو حضرت مخدوم جہانیاں "اخی" (میرے بھائی) کے خطاب سے یاد فرماتے تھے اس لیے اخی کے نام سے مشہور ہو گئے شیخ اخی کا وطن موضع زہرا پرگنہ دریا باد (صوبہ اودھ) میں تھا۔ جوانی میں ترک دنیا کر کے حضرت مخدوم جہانیاں کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور آپ سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے قنوج میں مقیم ہوئے۔ قنوج جانے اور وہاں اقامت گزیں ہونیکا

حکم خود حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے دیا تھا۔ تروج میں آپ کی جانب رجوع خلق اس قدر زیادہ ہوا کہ آپ وہاں سے تنگ آ گئے۔ اور دریائے گنگا کے کنارے موضع راجگیر میں عزلت گزیں ہو گئے اور اسی موضع میں رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا۔ شیخ اخی راجگیری نے ۱۱ شوال بروز بدھ ۷۸۱ھ میں وفات پائی۔

(خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۶۳)

سید شرف الدین مشہدی

سید علاؤالدین مشہدی کے فرزند ارجمند اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ رشتہ دامادی بھی اپنے مرشد سے قائم تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے انہیں ایک مسواک دے رکھی تھی اور ہدایت فرمائی تھی کہ جہاں یہ مسواک زمین میں گاڑنے سے سرسبز ہو جائے وہیں قیام کرو۔ چنانچہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے جب بھروج (گجرات) پہنچے تو یہ مسواک سرسبز ہو گئی اور آپ مستقل طور پر وہیں مقیم ہو گئے۔ ایک عالم کی سیاحت فرمائی تھی اور مختلف بزرگوں سے فیضیاب ہوئے تھے۔ لوگوں کا رجوع آپ کی جانب بہت زیادہ تھا۔ گجرات کے اکثر و بیشتر مشائخ آپ کے فیض روحانی سے مستفیض ہوئے۔ ۱۸ رجب ۸۰۸ھ بروز اتوار ظہر و عصر کے درمیان اس جہان فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا۔ آپ کا مزار بھروج سے ایک کوس کے فاصلہ پر احمد آباد کی سڑک پر واقع ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

سید سکندر بن مسعود ترمذی

ترمذ کے رہنے والے تھے۔ ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب میں ٹھٹھہ (سندھ) پہنچے اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں رہ کر باطنی فیوض سے بہرہ ور ہوئے۔ پیر و مرشد نے آپ کو منگلور (کاٹھیاواڑ) جانے کا حکم دیا آپ

دہلی سے ملک عزیز الدین یحییٰ اعظم الملک بن آرام شاہ کے ساتھ منگلور پہنچے ۔ یہاں کافروں اور مسلمانوں میں خونریز جنگ ہوئی ۔ راجہ مارا گیا اور منگلور پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ۔ یہ واقعہ فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کا ہے ۔ سید سکندر بن مسعود منگلور میں اقامت گزیں ہوئے اور یہیں ۱۷ ربیع الثانی ۷۶۸ھ میں انتقال فرمایا ۔

مشہور ہے کہ آپ اپنی والدہ مریم خاتون کے ہمراہ حضرت مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت مخدوم نے آپ کو بہ طور خادم مقرر فرمایا ۔ ایک روز خواب میں حضرت مخدوم جہانیاں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی حضورؐ نے مخدوم جہانیاں سے مخاطب ہو کر فرمایا ۔

" تم نے تو عہد کیا تھا کہ کسی سید زادے سے خدمت نہیں لو گے ۔ پھر ایک سید زادے کو اپنی خدمت پر کیوں مامور کیا ہے ۔"

مخدوم جہانیاں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں عرض کیا حضور! کون سیدزادہ میری خدمت میں ہے ؟"

فرمایا " اس کا نام سکندر ہے ۔"

صبح بیدار ہوئے تو ان کو بلا کر پوچھا کہ " تم نے ظاہر کیوں نہیں کیا کہ تم سادات میں سے ہو ۔"

انہوں نے عرض کیا کہ " مرشد کی خدمت سعادت ہے ۔ خاندان کا فخر اس سعادت کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتا تھا ۔"

حضرت مخدوم یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور کمال محبت اور انتہائی شفقت سے آپ کی تربیت کی اور خلافتِ باطنی کا خرقہ عطا فرمایا اور چند ایک تبرکات جو حضرت والا کے پاس تھے آپ کے سپرد فرمائے اور زبان مبارک سے فرمایا " اساں بھی جہانیاں تساں بھی جہانیاں " ۔ اس دن سے آپ سید سکندر ثانی مخدوم جہانیاں کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ کاٹھیا واڑ کا علاقہ آپ کے فیض روحانی سے اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور ہوا اور لاکھوں بندگان آپ

کے ذریعے ہدایت یاب ہوئے۔ منگلور میں آپ کی تعمیر کردہ مسجد جس کی تاریخ بنا ۷۰۰ھ ہے آج بھی موجود ہے۔ برّ صغیر کی تقسیم تک ریاست منگلور پر جو مانگرول کے نام سے مشہور ہے آپ ہی کی اولاد حکمران تھی۔

مخدوم عالم بن سیّد اسماعیل

آپ بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے خلیفہ اجل تھے۔ پٹن میں قیام تھا جو اس زمانہ میں گجرات کا دارالحکومت تھا۔ گجرات کے گورنر راستی خاں نے جب علم بغاوت بلند کیا تو سلطان فیروز شاہ تغلق نے اس کی سرکوبی کے لئے اپنے معتمد سردار ظفر خاں کو گجرات بھیجا۔ یہ وہی ظفر خاں ہے جو بعد میں سلطان مظفر شاہ کے نام سے گجرات کا خود مختار حکمران بنا۔ اس کا مختصر تذکرہ ہم حضرت مخدوم جہانیاں کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ ظفر خاں جب پٹن پہنچا تو مخدوم عالم بن سید اسماعیل نے حضرت مخدوم جہانیاں کی جانب سے اس کو گجرات کی حکمرانی کی بشارت دی اور ایک خنجر بھی عنایت فرمایا۔ یہ خنجر بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا عطیہ تھا۔

شیخ سراج الدینؒ حافظ

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے وہ خلفاء و مریدین جنہیں حضرت موصوف سے خصوصی تعلق تھا اور جو مرشد کی خدمت میں برسہا برس کی ریاضت و مجاہدہ سے ایک امتیازی مقام حاصل کر گئے۔ ان میں حافظ شیخ سراج الدین کی شخصیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ ایک عرصہ تک حضرت مخدوم جہانیاں کی نماز پنجگانہ کے امام رہے۔ حضرت مخدوم کو ان کے حال پر خاص توجہ اور شفقت و عنایت تھی۔ آپ کے بعض دوسرے ساتھی جو علم و فضل اور فقہ و حدیث و تفسیر میں آپ سے زیادہ مہارت رکھتے تھے؛ آپ پر رشک کرتے

تھے۔ اور جی میں سوچتے تھے کہ آخر حضرت مخدوم کو ان کے ساتھ خصوصی تعلق کیوں ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو جب اس صورت حال کی خبر ہوئی تو فرمایا :۔

" سراج الدین جب تک کعبے کو نہیں دیکھ لیتا تکبیر تحریمہ نہیں کہتا ۔"

شیخ سراج الدین اپنے مرشد کے وصال کے بعد اوچ سے کالپی چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ پھر جون پور میں کچھ مدت رہے اور بالآخر قنوج میں سکونت اختیار فرمائی اور ۸۴۰ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت کے دیگر خلفاء

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے منتسبین بیعت و خلافت کی تعداد حیطہ تحریر سے باہر ہے اور ان سب حضرات کے نام معلوم کرنا اور ان کے حالات سے پوری پوری واقفیت ایک مشکل معاملہ ہے۔ جامع العلوم میں ایک مختصر سی فہرست ان حضرات کی پیش کی گئی ہے جنہیں ایک مرتبہ جامع العلوم کے مرتب سید علاؤ الدین علی بن سعد حسینی نے حضرت مخدوم کی خدمت عالیہ میں شرفیاب دیکھا تھا انکے اسمأ گرامی حسب ذیل ہیں۔

سید صدر الدین محمد ، سید شرف الدین ، سید شمس الدین مسعود ، سید راستین ، سید رکن الدین راجا ، شیخ رفیع الدین[۱] ، سید معین الدین ، مولانا مختار ، مولانا تاج الدین محمد ، مولانا نجم الدین ، شیخ زادہ مولانا حسام الدین بھکری ، مولانا تاج الدین مانکپوری ،

---

[۱] یہ غالباً شیخ امام رفیع الدین ہیں جو حضرت شیخ مجدد الف ثانی احمد سرہندیؒ کے پانچویں جد تھے۔ ان کے متعلق حضرت مجدد کے خلیفہ و مرید محمد ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

" حضرت شیخ مجدد الف ثانی احمد سرہندیؒ کے پانچویں جد شیخ امام رفیع الدین حضرت جلال الدین

مولانا مسعود مہونی ، مولانا محمد مہونی ، مولانا نظام الدین ابراہیم ، خواجہ بدرالدین بہزاد درویش ، مسعود درویش ، خواجہ خسرو دہلوی ، خواجہ مظفر سامانی ، خواجہ نصرت ، ملک زادہ نصیرالدین ، مولانا رکن الدین دیپالپوری ، مولانا علاؤالدین مانک پوری ، ملک زادہ شہاب الدین ، خواجہ مسعود باخرزی ، مولانا خواجگی ، مولانا سالار سرسی اور مولانا شمس الدین ۔ [1]

یہ نام " مشتے نمونہ از خروارے " ہیں ورنہ کسب فیض کرنے والوں کی

بخاری (مخدوم جہانیاں) کے مرید و خلیفہ تھے ۔ اپنے مرشد کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے ۔ جب یہ دونوں بزرگ موضع سرائس پہنچے جو سرہند سے پانچ چھ کوس ہے تو وہاں کے باشندوں نے درخواست کی کہ جب دہلی میں رونق افروز ہوں تو سلطان فیروز شاہ (مرید جلال الدین بخاری) سے فرما دیں کہ سرائس سے سامانہ آنے والوں کے لئے راستہ پُر خطر ہے کیونکہ جنگل میں وحشی درندے ہیں ۔ اس لئے ان دونوں موضعوں کے درمیان ایک شہر آباد کیا جائے تاکہ جو لوگ سامانہ سے مالیہ جمع کرانے سرائس آنا چاہیں تو ان کو تکلیف نہ ہو ۔ دہلی پہنچ کر حضرت جلال الدین بخاری نے سلطان فیروز شاہ (تغلق) سے سرائس والوں کی سفارش کر دی ۔ چنانچہ سلطان نے شیخ امام رفیع الدین کے بزرگ کلاں خواجہ فتح اللہ کو حکم دیا کہ وہ اس مقام پر جا کر شہر آباد کریں ۔ چنانچہ موصوف دو ہزار سوار لے کر یہاں پہنچے اور قلعہ کی تعمیر شروع کر دی ۔ لیکن یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ ایک دن میں قلعہ جتنا تعمیر ہوتا دوسرے دن وہ سب منہدم پایا جاتا ۔ حضرت جلال الدین بخاری کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے امام رفیع الدین کو سنام لکھا کہ وہ جا کر خود قلعہ کی بنیاد رکھیں اور شہر میں آباد ہوں ۔ چنانچہ آپ نے قلعہ تعمیر کیا اور یہیں متوطن ہو گئے ۔ یہ قلعہ پہلے موجودہ شہر سے دور تھا ۔ اب آبادی کی وجہ سے شہر کے اندر آگیا ہے ۔ اس کو " سہرند " کہا جاتا تھا جس کے معنی " بیشۂ شیر " (کچھار) کے ہیں ۔ استداد زمانہ سے سہرند سرہند ہو گیا ۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ کی ولادت باسعادت اسی شہر میں ہوئی ۔

زبدۃ المقامات از محمد ہاشم کشمی ، مطبوعہ کانپور ، ۱۳۰۷ھ ، ۱۸۹۰ء صفحہ ۸۹ - ۹۱

[1] صفحہ ۲۹۵ الدر المنظوم

جماعتیں ملک اور بیرون ملک سے سینکڑوں کی تعداد میں آتی تھیں اور ہر ایک اس معدن ارشاد و ہدایت سے بقدر ظرف اپنا حصہ پاتا تھا۔ ترمذ سے ایک درویش فخرالدین حاضر ہوئے اور خرقہ خلافت سے بہرہ ور ہو کر واپس ہوئے۔ [1]

ایک دفعہ عرب سے ایک بزرگ خواجہ محمد غفاری خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تہجد کے وقت باریابی ہوئی۔ عربی میں عرض کیا "اے مخدوم! میں ایک رات ذکر خفی کر رہا تھا کہ ایک آدمی میرے داہنے طرف سے آیا اور بولا کہ تو یہ دعا پڑھ کہ اے رب تو معبودِ عالم ہے، میں جاہل ہوں مجھ کو علم دے تاکہ علم کے ساتھ تیری عبادت کروں ورنہ ہلاک ہو جاؤں گا۔ اس واقعہ کی کیا تاویل ہے؟" آپ نے فرمایا تم ابھی علم دین حاصل کرو۔ [2]

ایک مرتبہ عراق کے سادات حاضرِ خدمت ہوئے اور کچھ تحفے تحائف بھی نذر لائے۔ آپ نے انہیں عوارف کے درس میں شریک کیا اور شیرینی کھلائی

بخارا سے شیخ زادہ معظم تیس رفقا کی معیت میں حاضر خدمت ہوئے اور تربیت باطنی کی استدعا کی۔ آپ نے ان کی عرضداشت کو بھی شرفِ قبولیت سے نوازا۔

ایک بار عرب سے چند ایک درویش حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے انہیں تلقین فرمائی کہ شریعت سے واقفیت حاصل کرو۔ سنت کی پابندی اور بدعت سے احتراز کو معمول بناؤ۔

شیخ سارنگ چشتی

آپ ایک ہندو امیر کے لڑکے تھے۔ فیروز شاہ نے اپنے بیٹے محمد شاہ کی شادی ان کی بہن سے کی۔ اس تعلق نے رفتہ رفتہ انہیں اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا اور پھر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے فیض صحبت نے انہیں وادی

---

[1] الدرالمنظوم ص ۲۶۰ [2] الدرالمنظوم ص ۵۸۶ [3] الدرالمنظوم ص ۱۳۱

سلوک کا رہ نورد بنا دیا۔

شیخ سارنگ چشتیؒ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مخدوم صدرالدین راجن قتال کے علاوہ حضرت مخدوم جہانیاں کے ایک مرید حضرت شیخ قوام الدین لکھنوی کے فیض صحبت سے بھی مشرف ہوئے اور ان کو خلافت و اجازت شیخ قوام الدین لکھنوی سے حاصل ہوئی۔ شیخ سارنگ کے نام سے ایک قصبہ سارنگ پور بھوپال کے قریب آباد ہے۔ آپ کی وفات ۸۵۵ھ میں ہوئی۔ شیخ سارنگ چشتی کے خلیفہ پیر مینا لکھنوی تھے جن کا مزار لکھنو میں ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے۔

ہر کہ خواہد چشمِ دل بینا کند
سرمۂ خاک درِ مینا کند

اردو کے مشہور شاعر امیر مینائی آپ ہی کی اولاد میں سے تھے۔

ان مذکورہ بالاحضرات کے علاوہ یوپی کے خطہ میں کئی ایسے اہل اللہ کے مزارات اور خانقاہیں موجود ہیں جن کا شجرۂ طریقت اوچ پر منتہی ہوتا ہے۔ ان میں خیر آبادی بزرگوں میں شیخ سعدالدین خیر آبادی اور ان کے خلیفہ اجل شیخ صفی الدین سائی پوری اور پھر شیخ صفی الدین کے خلفا میں سید محمد طاہر بلگرامی، میر عبدالواحد بلگرامی سہروردی، میر عبدالجلیل بلگرامی کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سندیلہ کے شیخ مبارک بھی اسی آستانہ عالیہ سے وابستہ تھے یعنی وہ سید صفی الدین کے مرید تھے۔ الہ آباد میں شاہ اجملؒ کی خانقاہ بہت مشہور و معروف ہے۔ آپ کے والد ماجد شاہ محمد ناصر الہ آبادی تھے جو نو واسطوں سے حضرت مخدوم سید صدرالدین راجن قتال کے مرید و خلیفہ تھے۔ سلسلہ رسول شاہیہ اور سلسلہ دولت شاہیہ جو تصوف کے مشہور خانوادے ہیں۔ وہ بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے انتساب رکھتے ہیں۔ سلسلہ دولت شاہیہ کے مؤسس مخدوم شاہ دولت فردوسی المنیری ہیں۔ آپ حضرت مخدوم شیخ یحییٰ سہروردی

کی اولاد میں سے تھے۔ چار واسطوں سے آپ کا سلسلہ حضرت مخدوم سید صدرالدین راجن قتال سے مل جاتا ہے۔ سلسلہ رسول شاہیہ کے بانی سید رسول شاہ بارہ واسطوں سے حضرت مخدوم راجن قتال کے مرید و خلیفہ تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے تین صاحبزادے تھے۔ ناصرالدین محمود، سید عبداللہ اور سید محمود۔ آخرالذکر سید محمود الملقب بہ جلال اکبر کی اولاد دکن، مدراس، میسور اور ملتان کے علاقوں میں آباد ہوئی۔ سید عبداللہ بخاری دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کی اولاد دہلی اور اطراف دہلی میں ہے۔ کرنول میں بھی ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ موجود ہیں۔

سید ناصرالدین بخاری کے ۲۵ بیٹے تھے جن میں سے مندرجہ ذیل صرف ۷ صاحبزادوں کا سلسلۂ اولاد باقی ہے۔

۱۔ **سید حامد کبیر بخاری** ——— بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں انہی کی اولاد میں سے تھے۔

۲۔ **سید علم الدین** ——— سید میراں محمد شاہ المعروف بہ "موج دریا" بخاری جن کا مزار لاہور میں ہے انہی کی پشت میں سے تھے۔

۳۔ **سید اسماعیل بخاری** ——— قطب العالم سید شہاب الدین جو سادات بخاریہ شکارپور کے مورث اعلیٰ ہیں ان کی اولاد میں سے تھے۔

۴۔ **سید فضل الدین اوچی** آپ کی اولاد اوچ اور اس کے مضافات میں آباد ہے۔

۵۔ **قطب العالم سید برہان الدین گجراتی**۔ ان کی اولاد بٹوا (احمد آباد، انڈیا) حیدر آباد دکن، گلبرگہ، مدراس اور گجرات میں موجود ہے۔

۶۔ **سید علاؤالدین بخاری کشمیری**۔ کشمیر کے مشہور و معروف بزرگ سید حاجی مراد، سید علاؤالدین کے بڑے بیٹے سید فخرالدین کے فرزند تھے۔ ان کی اولاد کشمیر میں بکثرت آباد ہوئی۔

۷۔ **سید شرف الدین بخاری** —— سید پیر کمال بخاری نکوی کا سلسلہ نسب انہی سے ملتا ہے۔ سید پیر کمال کی اولاد اضلاع گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور ڈیرہ غازی خاں میں آباد ہے۔

حضرت مخدوم کے فرزندان معنوی کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے اور بلاد اسلامیہ کا شاید کوئی قابل ذکر خطہ ایسا ہوگا کہ جہاں حضرت مخدوم کی معنوی اولاد موجود نہ ہو۔ ہند و پاکستان کے علاوہ ایران، ترکی، عراق اور مصر و حجاز میں آپ کے تلامذہ اور مریدین کی تعداد کچھ کم نہیں تھی۔

سید محمد اسماعیل بخاری سہروردی

آپ حضرت سید حامد کبیر کے فرزند ارجمند اور مرید تھے۔ تبلیغ اسلام کے لئے اوچ سے چنیوٹ[1] منتقل ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان دنوں چنیوٹ پر ایک ہندو راجہ حکمران تھا۔ مسلمان اس کے ہاتھوں سخت تنگ تھے۔ سید اسماعیل بخاری نے اپنے تصرفات باطنی سے اس راجہ کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا اور اسی راجہ کی لڑکی آپ کے عقد میں آئی۔ آپ نے اس علاقہ کے لاکھوں بندگان خدا کو مشرف بہ اسلام کیا۔ سیال، رجبانہ، جھجیانہ، سرمانہ، کملانہ، سرگانہ وغیرہ قبائل جو اس علاقہ کے قدیم باشندے تھے۔ آپ کی تبلیغی مساعی کی بدولت اسلام کے حلقہ بگوش بنے۔ اس علاقہ کے ناموں کی نسبت سے آپ کی اولاد جو راجکماری کے بطن سے تھی۔ شیخ سملانہ کہلاتی ہے۔ آپ کے فرزند سید فتح شاہ تھے۔ سید فتح شاہ کے ایک لڑکے سید زین العابدین تھے جو پیر محل علاقہ کمالیہ ضلع لائلپور میں آباد ہوئے اور بے شمار لوگوں کی ہدایت کا موجب بنے۔

---

[1] چنیوٹ ضلع جھنگ میں ایک مشہور پرانا شہر لب دریائے چناب واقع ہے۔

سید بہاالدین

سید حامد بخاری کے تیسرے فرزند تھے۔ سید بہاؤالدین کے فرزند ارجمند سید محمود تھے۔ سید محمود کے وارث سجادہ ان کے بڑے لڑکے سید عثمان ہوئے جو شاہ جھولا بخاری کے نام سے معروف تھے۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے سید عثمان کو بٹالہ کا علاقہ جاگیر میں ملا۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں ان کا انتقال لاہور کے قلعہ میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ سید عثمان کی تاریخ وفات ۱۸ ربیع الاول ۹۱۲ھ ہے۔ سید عثمان کی نسل میں بڑے بڑے اہل اللہ اور اصحاب طریقت بزرگ پیدا ہوئے جن میں آپ کے فرزند سید شاہ محمد، سید عمادالملک بن شاہ محمد اور سید محمود مشہور بہ شاہ نورنگ جھولہ بخاری کے اسمأ گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ لاہور کے قرب و جوار میں مدفون ہیں۔

سیّد علم الدین بخاری

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پوتے اور حضرت مخدوم سیّد ناصرالدین محمود کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی اولاد میں سید جلال الدین، سید ابوالخیر اور سیّد جمال الدین تین فرزندان گرامی سے اولاد کا سلسلہ چلا۔ سید جمال الدین نے بٹالہ میں توطن اختیار فرمایا۔ سید ابوالخیر کے پانچ فرزند تھے۔ ان میں سید ابوبکر جلالپور پیر والا کے سادات کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس خاندان میں سید سلطان احمد قتال بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ سید جلال الدین بخاری بھی سید علم الدین کے فرزند ارجمند اور مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کی اولاد میں میراں محمد شاہ الملقب بہ موج دریا بخاری کو سب سے زیادہ شہرتِ نصیب ہوئی۔ موج دریا بخاری کے خلفأ میں ایک بزرگ سید عبدالرزاق ایک نئے سلسلہ طریقت رزاق شاہیہ کے بانی تھے۔ سید اسماعیل قطب بخاری بھی حضرت مخدوم سید ناصرالدین محمود کے فرزند گرامی تھے۔

آپ کا مزار مبارک اوچ میں ہے۔ آپ کے صاحبزادہ گرامی سید کبیرالدین کی ساتویں پشت میں ایک بزرگ سید عبدالوہاب دین پناہ علیہ الرحمۃ تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید حسین بخاری تھا۔ مظفر گڑھ کے علاقہ میں دائرہ دین پناہ آپ ہی کے لقب پر آباد ہوا ہے۔ ۱۰۰۷ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ ؎

سیّد احمد مجنوں بخاری

اوچ کے بخاری خاندان کے ایک نامور بزرگ سید احمد مجنوں بنگال کے ایک ضلع بیر بھوم کے ملحقہ جنگل میں عبادت و ریاضت میں مصروف ہوئے۔ آپ کی تشریف آوری سے اس جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہاں ایک بستی آباد ہو گئی جو حضرت موصوف کی مناسبت سے حضرت پور کے نام سے مشہور ہوئی۔ سید احمد مجنوں دور شاہجہانی میں اوچ سے بنگال تشریف لائے۔ مجنوں آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے اس لئے کہ آپ ہمہ وقت عشق و محبت الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حیاتِ سرمد میں کیا خوب لکھا ہے۔

"عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہوتی ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو لیکن مجنوں تو ضرور ہوتا ہے۔"

سید احمد مجنوں بخاری، سید علم الدین ثانی کے پوتے تھے۔ آپ کے والد گرامی سید ناصر الدین تھے۔ سید علم الدین ثانی سید علم الدین اول بن حضرت مخدوم سید ناصر الدین محمود کے پوتے تھے۔ آپ کے اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے درمیان آٹھ واسطے ہیں۔ بنگال کے اس خطہ میں سہروردیہ سلسلۂ طریقت کے فروغ کا باعث آپ کی ذات گرامی بھی تھی۔

؎ حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار صـ ۲۶۹ و تحفۃ السادات صـ ۲۳۹

شاہ محمد مجیب اللہ

صوبہ بہار میں پھلواری شریف ایک مشہور خانقاہ ہے جو بڑے بڑے اہل اللہ اور اصحابِ طریقت کی آماجگاہ رہی ہے۔ اس خانقاہ کے موسس اول حضرت شاہ محمد مجیب اللہ بھی اوچ کے خانوادہ سہروردیہ بخاریہ کے منتسبین میں سے تھے شجرہ طریقت حسب ذیل ہے،

شاہ محمد مجیب اللہ۔ شاہ عتیق اللہ۔ شاہ عبدالمقتدر۔ شیخ عبدالنبی، محمد شبیر عزت شاہ: سید برہان۔ سید شاہ عالم، مخدوم عبداللہ، سید ناصرالدین محمود، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔

شاہ محمد مجیب اللہ کا انتقال ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء میں ہوا۔ [1]

بہار کی ایک مشہور خانقاہ قصبہ منیر میں واقع ہے۔ اس خانقاہ کے شیخ طریقت شاہ محمد مبارک بھی اوچ کے بخاری خاندان کے توسط سے سلسلہ عالیہ سہروردیہ سے منسلک تھے۔ آپ شاہ نعمت اللہ کے خلیفہ تھے اور شاہ نعمت اللہ سید محمد مقبول کے مرید و خلیفہ تھے جو حضرت شاہ عالم گجراتی کی چھٹی پشت میں تھے بہار کے ایک اور مشہور بزرگ حضرت سید محمد عرف حضرت پیر دمڑیا عظیم آبادی بھی خانوادہ بخاریہ اوچ کے فیوض باطنی سے مستفیض ہوئے

"سید محمد قدس سرہ المشتہر بہ پیر دمڑیا آں بزرگ وار مشرب سہروردیہ داشت و نعمت از خاندان جہانیاں جہاں گشت" قدس سرہ یافتہ"۔ [2]

"سید محمد پیر دمڑیا کے عرف سے معروف ہوئے۔ سہروردی مسلک کے بزرگ تھے انہوں نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے خاندان سے نعمت باطنی کا

---

[1] تذکرہ حضرت ابو النجیب عبدالقاہر سہروردی از مولانا حسن پھلواری ص۶۔

[2] " " ایضاً ص۶

فیض پایا تھا:

امروہہ (یو۔پی انڈیا) کے مشہور بزرگ حضرت شاہ امانت علی سہروردی بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے سلسلہ عالیہ سے وابستہ تھے۔ شاہ امانت علی اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے درمیان ۱۴ واسطوں کی نسبت ہے

شیخ ابو سعید گنگوہی، خواجہ نظام الدین بلخی، مولانا جلال الدین تھانیسری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور شاہ اجمل بہرائچی بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے خانوادۂ عظمت کے متعلقین ہیں۔ شاہ اجمل بہرائچی تو حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت کے براہِ راست فیض یافتگان میں سے تھے۔ مذکورہ بالا تمام شخصیتیں اپنی عظمت و جلالت شان کے لئے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کے فیوض علمی و عملی سے بے شمار بندگانِ حق متمتع ہوئے اور ہزاروں گم گشتگان بادیہ ضلالت کو راہِ نجات اور صراطِ مستقیم کی دولت ملی۔

شیخ سعدالدین خیرآبادی

آپ حضرت پیر مینا لکھنوی کے خلیفہ اجل تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی قاضی بڈھن تھا جو اناؤں کے باشندے تھے۔ کم سنی ہی میں شیخ سعدالدین کے والد انتقال کر گئے۔ والدہ ماجدہ نے آپ کی تربیت کی۔ چھوٹی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اس کے بعد علوم متداولہ کی تعلیم کے لئے مولانا اعظم لکھنوی کی خدمت میں رہے۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد سلوک و تصوف کی تربیت حضرت شیخ مینا لکھنوی خیرآبادی سے پائی اور مرشد کے ایماء پر خیرآباد میں اقامت گزیں ہوئے اور وہیں ۴ صفر ۹۲۲ھ کو انتقال فرمایا۔ شیخ سعدالدین خیرآبادی بڑے پایہ کے عالم تھے۔ انہوں نے کئی درسی کتابوں کی شرح بھی تالیف کی جن میں بزدوی، حسامی، کافیہ، مصباح کی شرحیں قابل ذکر ہیں۔ آپ کی ایک کتاب مجمع السلوک تصوف کے موضوع پر بیش بہا تصنیف ہے جس میں شیخ مینا کے

ملفوظات اور حالات درج ہیں۔ کتاب کا اسلوب یہ ہے کہ جہاں کہیں اپنے پیر و مرشد سے کوئی بات روایت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔" قال شیخی مینا اداامہ اللہ فینا" (میرے شیخ حضرت شیخ مینا اللہ تعالیٰ انہیں قائم و دائم رکھے، فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی زندگی ہی میں انہوں نے یہ کتاب مکمل کر لی تھی۔ آپ کا مزار خیر آباد میں مرجع خلائق اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ آپ کے خلفاء میں شیخ صفی الدین سائی پوری اور شیخ مبارک سندیلوی کے نام ملتے ہیں۔ شیخ سعدالدین خیر آبادی عمر بھر مجرد رہے۔

شیخ صفی الدین سائی پوری

شیخ علم الدین سائی پوری کے فرزند ارجمند تھے۔ علم و فضل میں یگانہ اور زہد و اتقاء میں یکتائے روزگار تھے۔ پیر سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور تمام امور دینی و دنیاوی میں ان کی اتباع کا بہ طور خاص خیال رکھتے تھے۔ اخبار الاخیار میں ہے "شیخ صفی بر قدم پیر محصور و مجرد زیست" (شیخ صفی الدین سائی اپنے مرشد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ساری عمر مجرد رہے) صفحہ ۱۹۴

میر عبدالواحد بلگرامی اپنی کتاب " حل شبہات " میں شیخ کی جلالت شان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ابتدائے احوال میں شریعت اور طریقت کے بارے میں چند شبہات پیش آئے۔ اکثر مشائخ کی طرف رجوع کیا مگر طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ آخر میں نے سوچا کہ آفاق گردی اور جادہ پیمائی کے ذریعے اس مشکل کو حل کروں شاید کوئی ایسا درویش مل جائے جو ان شبہات کا ازالہ کر سکے۔ چنانچہ میں سفر پہ روانہ ہو گیا۔ اثنائے سفر میں ایک جگہ قیام کیا۔ دوپہر کا وقت تھا میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ صفی الدین سائی موجود ہیں اور میرے حال پر خصوصی توجہ فرما رہے ہیں۔ دل میں سوچا کہ اب مجھے سفر پہ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ شیخ موجود

ہیں اور ان سے استفسار کروں گا۔ جب میں نیند سے بیدار ہوا تو سفر اور اقامت کے بارے میں متذبذب تھا۔ آخر میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اگر دوبارہ یہی خواب نظر آیا تو سفر کے ارادے سے باز رہوں گا۔ دوبارہ وہی خواب دکھائی دیا جس پر میں فوراً واپس لوٹا اور حضرت شیخ صفی الدین کے مزار پر چالیس روز معتکف رہا۔ میرے تمام اشکالات کا اس دوران مجھے شافی جواب مل گیا۔" شیخ کا وصال ۱۹ محرم ۹۲۲ھ کو ہوا اور سائی پور میں دفن ہوئے۔ "شیخ پاک" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

سیّد محمّد طاہر بلگرامی

آپ حضرت شیخ صفی الدین سائی پوری کے اکابر خلفاً میں سے تھے۔ ان کے ایک قریبی عزیز میر عبدالواحد بلگرامی نے اپنی مشہور تصنیف "سنابل" میں لکھا ہے:۔

"مغل بادشاہ بابر کے عہد میں چند مغل حضرت مخدوم شیخ صفی الدین سائیپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اثنا گفتگو میں سادات کا ذکر چھڑ گیا۔ مغل اصرار کر رہے تھے کہ ہندوستان میں کوئی صحیح النسب سیّد نہیں ہے۔ حضرت موصوف نے انہیں قائل کرانا چاہا مگر وہ اپنی بات پر بہ ضد رہے اور کہنے لگے کہ صحیح النسب سید کی نشانی یہ ہے کہ اگر ان کے بال کو آگ میں ڈالا جائے تو اسے آنچ نہیں آتی۔ حضرت موصوف نے فرمایا کہ ہندوستان میں بھی ایسے سید موجود ہیں۔ مغلوں نے کہا۔ کسی ایک سید کی نشان دہی کیجئے۔ حضرت شیخ سید صفی الدین نے میرے بزرگوار چچا سید محمد طاہر بلگرامی کو جو سید طاہا کے نام سے مشہور تھے۔ پاس بلایا۔ ان کے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر جلتی ہوئی آگ میں ڈال دی مگر آگ نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ جب آگ سے نکالی گئی تو اسی طرح ٹھنڈی برآمد ہوئی۔ یہ دیکھ کر مغل شرمندہ ہوئے اور شیخ صفی الدین اور سید محمد طاہر کے قدموں پر گر گئے۔" سید

محمد طاہر بلگرامی کا انتقال ۹۵۰ھ میں ہوا۔

شیخ حسین سکندری

شیخ حسین سکندری بھی سید صفی الدین سائی پوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کا انتقال سکندرہ میں ۹۷۶ھ میں ہوا۔ آپ کے خلفاء میں میر سید عبدالواحد بلگرامی بڑی باعظمت علمی شخصیت تھے۔ تصوف پر ان کی کتاب "سبع سنابل" بڑی جامع تصنیف ہے۔ میر عبدالواحد بلگرامی کی جلالت و عظمت پر ان کے ایک ہم عصر مؤرخ منتخب التواریخ کے مصنف مُلا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے۔

"شیخ عبدالواحد بلگرامی بسیار صاحب فضائل و کمالات و ریاضت و عبادات است و باخلاق سنیہ و صفات رغیبہ وارد و مشرب او عالی است۔ دریں ایام خود را از گزرانیدہ و شرحے بر نزہۃ الارواح[1] نوشتہ محققانہ و ہم چنیں در اصطلاحات صوفیہ خیلے رسائل نوشتہ ازاں جملہ "سنابل" نام و غیر آں تصانیف لائقہ نیز دارد۔"

"شیخ عبدالواحد بے شمار خوبیوں اور کمالات کے بزرگ تھے۔ ریاضت و عبادات میں ہمہ وقت مشغول رہتے تھے۔ اعلیٰ اخلاق اور عمدہ صفات کے حامل تھے۔ بڑے بلند مشرب صوفی تھے۔ آپ نے نزہۃ الارواح کی محققانہ شرح لکھی ہے اور اصطلاحات صوفیہ پر کئی رسائل مرتب کئے۔ ان میں سنابل خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی ایک عمدہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔"

میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں کہ "۱۱۳۵ھ میں جب میں دہلی پہنچا اور حضرت شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادیؒ کی خدمت میں حاضری

---

[1] نزہۃ الارواح شیخ حسن محمد تجاتی کی تالیف ہے۔ شیخ موصوف علامہ کمال الدین قزوینی کی اولاد میں سے تھے۔ ۹۴۰ھ میں وفات پائی۔

کا شرف حاصل کیا تو انھوں نے میر عبدالواحد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک رات میں مدینہ منورہ میں سو رہا تھا۔ خواب میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑی شفقت و محبت کے ساتھ ایک شخص سے مصروفِ گفتگو ہیں۔ میں نے سید صبغۃ اللہ سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ انھوں نے فرمایا۔ یہ شیخ عبدالواحد بلگرامی ہیں۔"

یہ خواب بیان کرنے کے بعد شاہ کلیم اللہ نے فرمایا کہ "خواب کے اس واقعہ کے بعد شیخ عبدالواحد سے میری ارادت و عقیدت بہت بڑھ گئی ہے۔"

میر عبدالواحد بلگرامی نے طویل عمر پائی اور سو برس سے زیادہ کے ہو کر ۳ رمضان ۱۰۱۷ھ جمعہ کی رات کو انتقال فرمایا۔ مزار مبارک بلگرام میں مرجع خلائق ہے آپ نے اپنے پیچھے چار فرزند چھوڑے۔ چاروں صاحبزادے نیکی اور تقوی و طہارت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کے اسماء گرامی یہ تھے۔ میر عبدالجلیل، میر سید فیروز، میر سید یحییٰ، میر سید طیب۔

شیخ الاسلام ادھن بلگرامی

مولانا سعدالدین خیر آبادی کے نامور خلفاء میں شیخ صفی الدین سائی پوری کے علاوہ ایک نام شیخ مبارک سندیلہ کا بھی آتا ہے۔ شیخ مبارک کے بارے میں اخبار الاخیار کے مؤلف حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

"شیخ مبارک سندیلہ باحکام شریعت و آداب طریقت موصوف بود۔"

شیخ مبارک کے خلفاء میں سب سے زیادہ مشہور بزرگ شیخ ادھن بلگرامی تھے جن کے بارے میں مآثر الکرام کے مصنف مولانا غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:-

"شیخ ادھن از اعاظم خلفائے شیخ مبارک سندیلوی است۔ مقتدائے عنصر و مفتی

شہر بود در زہد و تقویٰ و حفظ شرائع و حل وقائع طلاب ظاہری و باطنی نظیرسے نہ داشت"۔

(مآثر الکرام دفتر اوّل صفحہ ۶۵)

شیخ ادھن شیخ مبارک سندیلوی کے بڑے خلفاء میں سے تھے۔ بہت بڑے پیشوا اور مفتی شہر تھے۔ زہد و تقویٰ، شریعت کی پاسداری اور علوم ظاہر و باطن کے طلبا کی مشکلات کو حل کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

مرآۃ المبتدین کے مصنف نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"شیخ ادھن استاد شہر تھے۔ دنیا بھر کے مبتدی اور منتہی دونوں قسم کے طلباء آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ملا محمد خرازی جو مُلّا احمد جنیدی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ جب ہندوستان تشریف لائے تو وہ بھی آپ کے شاگرد اور شریک درس ہوئے۔ شیخ ادھن بلگرامی کا ارشاد تھا کہ

"درویشی میں خلافِ شرع بات یہ ہے کہ آدمی کسی فعل کے مرتکب ہونے کے بعد پشیمانی کا اظہار کرے یعنی چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"۔

کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ سب سے بڑی عبادت کون سی ہے؟۔ فرمایا" ملاحظہ ادب در جمیع اوقات"۔ (ہر وقت ادب پیشِ نظر رہے)

شیخ موصوف کا معمول یہ تھا کہ ہمیشہ اپنی خانقاہ میں معتکف رہتے تھے۔ اور عیدین کی نماز کے سوا کبھی کسی ضرورت سے باہر تشریف نہیں لاتے تھے۔ یہ طریقہ آج بھی اس خانقاہ کے سجادگان کا دستور چلا آ رہا ہے۔

شیخ ادھن حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مرشد طریقت تھے۔ شیخ مبارک سندیلہ کے ایک خلیفہ سید صفی تھے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ

"سید صفی مردے بود از ابنا لہ بہ اوصاف درویشاں موصوف و بہ احوال ایشان

متحقق و در لباس اخفا مستور مرید شیخ مبارک سندیلہ بود۔"
سید صفی انبالہ کے ایک مردِ درویش تھے۔ فقر و درویشی کی تمام خوبیوں کے حامل اور صوفیا کی تمام کیفیات سے بہرہ ور تھے مگر اپنے احوال باطنی کا اخفاء کرتے تھے۔ شیخ مبارک سندیلہ کے مرید تھے۔

قطبُ العالم بُرہان الدّین گجراتی

آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پوتے اور حضرت مخدوم ناصرالدین محمود کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی ولادت ۱۴ رجب ۷۹۰ھ میں اوچ میں ہوئی۔ دس سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت حضرت سید صدرالدین راجن قتال کے زیر سایہ ہوئی۔ پھر انہی کے حکم سے آپ اپنی والدہ ماجدہ بی بی ہاجرہ کے ساتھ جو سعادت خاتون کے لقب سے مشہور تھیں۔ پٹن تشریف لائے۔ پٹن اس زمانہ میں گجرات کاٹھیا واڑ کا دارالحکومت تھا۔ یہاں ان دنوں حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے نواسے شیخ رکن الدین کی خانقاہ موجود تھی۔ آپ کچھ عرصہ حضرت موصوف کے زیر تربیت بھی رہے۔ پٹن میں ایک بہت بڑے عالم مولانا علی شیر کا مدرسہ قائم تھا۔ علوم ظاہری کی تکمیل ان کی خدمت میں رہ کر کی۔

سلطان احمد شاہ خانوادہ بخاریہ کا بڑا معتقد تھا۔ جب اس نے احمد آباد شہر کی بنیاد رکھی تو اس نے اس شہر کی آبادانی کے سلسلہ میں حضرت قطب العالم سے دعا کی درخواست کی اور عرض کیا کہ آپ کے جد امجد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے ہمارے خاندان کے حق میں دعا فرمائی تھی جس کے صدقہ میں ہمیں بادشاہت نصیب ہوئی۔ آپ اس شہر کی آبادی اور سرسبزی و شادابی کے لئے دعا فرمائیں۔ احمد شاہ کو آپ کی ذات سے اس درجہ عقیدت تھی کہ جب آپ شہر کی سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کے لئے تشریف

لائے تو بادشاہ نے بنفس نفیس آپ کی شان میں کھڑے ہو کر ایک قصیدہ مدحیہ پڑھا جس کا مطلع یہ تھا۔

قطب زمانۂ ما برہاں بس است۔ مارا
برہان او ہمیشہ چوں نامش آشکارا

حضرت قطب العالم صاحب کرامات و تصوف بزرگ تھے۔اس کا ایک ثبوت وہ عجیب و غریب پتھر نما لکڑی کا ٹکڑا ہے جس کے بارے میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ

"عجائب چیزیست کہ بہ مشاہدہ تعلق دارد۔"

یعنی عجیب و غریب شے ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رات کو آپ تہجد کے لئے مسجد میں تشریف لائے۔ راستے میں کسی چیز سے پاؤں کو ٹھوکر لگی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا "کیا چیز ہے، پتھر ہے، لوہا ہے کہ لکڑی ہے۔" صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ اس میں یہ تینوں صفات موجود ہیں۔ یہ عجیب و غریب پتھر کا ٹکڑا جو بیک وقت لوہا، لکڑی اور پتھر دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی بڑا میں حضرت [redacted] کے سجادگان کے پاس موجود ہے اور کافی وزنی ہے۔ حضرت قطب العالم[1]

---

[1] حضرت قطب العالم کے گیارہ فرزندان گرامی تھے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

سید محمود، سید محمد، سید احمد، سید حامد، سید صالح، سید امین اللہ، سید محمد زاہد، سید صادق محمد، سید عالم، سید راجو اور سید محمد اصغر۔

ان تمام حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے والد کے فیوض باطنیہ سے پوری طرح بہرہ ور فرمایا اور حدیث نبوی علیہ السلام کے مصداق کہ "الولد سر لابیہ" (بیٹا باپ کی عظمت کا آئینہ دار ہوتا ہے) ان بزرگوں نے اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق زندگی بسر کی اور علوم دینیہ کے اس ورثہ کی پوری طرح نگہداشت فرمائی جو انہیں "اباً عن جدٍ" ملا تھا۔ ان فرزندان گرامی میں سے بعض صاحبزادگان کا مختصر سا تذکرہ ہم آئندہ اوراق میں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالے ان سب کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی کرے۔

نے ۸ ذی الحجہ ۸۵۰ھ کو ۶۸ برس ۴ ماہ اور ۲۴ دن کی عمر میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ۔

حضرت شاہ عالمؒ

آپ کا اسم گرامی محمد لقب سراج الدین اور شاہ عالم تھا۔ آپ حضرت قطب العالم سید برہان الدین بخاریؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ والدہ ماجدہ کا نام بی بی آمنہ تھا جو کریم خاں بن عماد الدین خداوند خاں کی صاحبزادی تھیں۔ کریم خاں گجرات کے درباری امرا میں سے تھا۔ حضرت شاہ عالم کی ولادت باسعادت ۱۷ ذی قعدہ ۸۱۷ھ شب دوشنبہ میں ہوئی۔ کلمہ "وارث علی" سے آپ کی تاریخِ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے والد مرحوم کے علاوہ گجرات میں مغربی سلسلہ کے نامور بزرگ حضرت گنج احمد[1] مغربی سے بھی خرقہ خلافت و اجازت حاصل کیا۔

---

[1] حضرت گنج احمد مغربی گجرات کے نامور بزرگان طریقت میں سے تھے۔ آپ بابا اسحاق مغربی کے مرید و خلیفہ تھے۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ہمعصر تھے اور انہی کے مشورہ سے کھٹو میں قیام پذیر ہوئے۔ بابا اسحاق مغربی کا مزار کھٹو ضلع ناگور میں ہے جو ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ مزار پر خطِ کوفی میں کتبہ لگا ہوا ہے۔ مغربی سلسلہ کے بزرگوں نے بڑی طویل عمریں پائیں۔ حضرت گنج احمد مغربی کی عمر بھی ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ ہوئی۔ انہوں نے دہلی کے زمانہ قیام میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بھی فیض باطنی حاصل کیا۔ حضرت گنج احمد مغربی رحمۃ اللہ کو یہ خصوصی امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کے اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف ۶ واسطوں کی نسبت ہے (اخبار الاخیار) آپ کے بارے میں یہ عام شہرت ہے کہ علم کیمیا کے زبردست ماہر تھے۔ حضرت گنج احمد مغربی حضرت قطب العالم کے ہم عصر بزرگوں میں سے تھے۔ عمر بھر مجرد رہے ان کا مزار احمد آباد سے سات کوس کے فاصلہ پر سرخیز نام کی بستی میں ایک پُرفضا مقام پر واقع ہے مزار پر حاضری سے ایک خاص روحانی کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور طمانیت قلب کا احساس دل و دماغ پر چھا جاتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مزار کسی ولی کامل اور عارف باللہ کا ہے۔

حضرت شاہ عالم گجرات کے بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ فرقہ ملامتیہ سے بھی نسبت حاصل تھی۔ ہر وقت استغراق و جذب کی کیفیت میں رہتے۔ سلاطین گجرات پر آپ کا زبردست اثر تھا اور شاہی خاندان آپ کا حد درجہ معتقد تھا۔ حضرت شاہ عالم نے ۶۳ برس کی عمر میں ۲۰ر جمادی الاخری ۸۸۰ھ میں وفات پائی۔ مزار مبارک احمد آباد کے محلہ رسول آباد میں ایک وسیع و عریض احاطہ میں واقع ہے۔ احمد آباد کے ہمعصر سلاطین پر آپ کا بڑا اثر تھا اور سلطان محمود بیگڑھ آپ کا بڑا معتقد تھا۔

حضرت شاہ عالم کے پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ خلفاء و مریدین کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ [1]

حضرت شاہ عالمؒ کے تصرف باطنی اور خرق عادات کے قصوں کی بڑی شہرت ہے لیکن چونکہ ہمارا مقصد ان بزرگوں کا اجمالی تعارف کرانا ہے اس لئے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ [2]

---

[1] حضرت شاہ عالمؒ کے خلفاء مجاز میں آپ کے چھوٹے بھائی سید محمد زاہد قاضی محمود دریائی بیرپوری، قاضی سید اسماعیل اصفہانی، شریف ابوبکر عیدروسی، شیخ حسام الدین متقی ملتانی، قاضی نجم الدین گجراتی، ملک عبداللطیف واد رالملک اور خواجہ احمد بن ڈودسن کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بزرگ صاحب طریقت اور صاحبِ سلسلہ ہوا۔

[2] حضرت شاہ عالمؒ کی ایک کرامت زبان زد عام ہے کہ ایک بڑھیا کا اکلوتا بیٹا قضا الہی سے فوت ہوگیا اور وہ اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور فریاد کی۔ آپ پہلے تو اسے ٹالتے رہے مگر جب اس کا نالہ و شیون حد سے بڑھ گیا تو آپ اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے باہر تشریف لائے اور آسمان کی طرف بچہ اچھال کر فرمایا "وہ نہیں تو یہ سہی"۔ اتنا کہنا تھا کہ مردہ بچہ کے جسم میں حرکت پیدا ہوگئی اور آپ کا بچہ انتقال کرگیا۔

شیخ حسام الدین متقی ملتانیؒ

حضرت شاہ عالم محمد بن برہان الدین قطب العالم گجراتی کے نامور خلفاءؒ میں ایک عالم باعمل اور زاہد بے ریا شیخ حسام الدین ملتانی تھے جن کا مزار گیلے والہ ضلع ملتان کے ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر مال مشتبہ سے اپنے حلق کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ جب کبھی ملتان اپنے پیران طریقت کے مزارات کی زیارت کے لئے جاتے تو حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم ملتانیؒ کے مقبرے کے سایہ میں بھی کھڑے نہ ہوتے اور اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ مزار کی تعمیر پر جو روپیہ صرف ہوا ہے وہ بیت المال کا تھا اور بیت المال کی رقم سے استفادہ درست نہیں ہے۔ [۱]

شیخ حسام الدین ملتانیؒ کے تلامذہ میں شیخ علی متقی بڑی نامور شخصیت ہو گزرے ہیں۔ شیخ علی متقی آپ سے بیعت تھے۔ وہ ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور وہیں دسویں صدی ہجری میں انتقال فرمایا۔

شیخ علی متقی کے فیض یافتگان صحبت میں مولانا محمد طاہر پٹنی کا نام ملتا ہے جو اپنے عہد کی عظیم علمی شخصیت تھے۔ شیخ عبدالقادر حضرمی نے "النور السافر" میں لکھا ہے کہ "علماء گجرات میں سے کوئی بھی ان کے مقام کی عظمت کا ہمسر نہیں بن سکا" حقیقت یہ ہے کہ گجرات کے وہ علماء و محدثین جن کے نام کی برکت سے یہ خطہ ہمیشہ ایک علمی سرزمین کی حیثیت سے شہرۂ آفاق رہے گا۔ ان میں علامہ مجد الدین محمد بن طاہر گجراتی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے لغت حدیث پر ایک مستند اور جامع کتاب تالیف فرمائی جو مجمع البحار کے نام سے

---

[۱] شاہ رکن عالم کا مزار سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے لئے تعمیر کرایا تھا مگر خود یہاں دفن نہیں ہو سکا۔ مقبرہ کا گنبد پاکستان بھر میں سب سے اونچا ہے۔

علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اور فنِ لغت و حدیث میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ کتاب کا پورا نام "مجمع بحار الانوار" ہے۔ یہ نہ صرف لغت حدیث کی جامع ہے بلکہ اگر اسے صحاح ستہ کی ادبی شرح کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ نواب سید صدیق حسن خاں نے "اتحاف النبلا" میں اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ

"کتاب متفق علی قبوله بین اهل العلم منذ ظهر فی الوجود وله منۃ عظیمۃ مبذالک العمل علی اهل العلم"

یعنی جب سے یہ کتاب تالیف ہوئی ہے اہل علم نے اسے ہر دور میں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو تصنیف فرما کر اہلِ علم پر بڑا احسان کیا ہے۔"

مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ انہوں نے اسماء رجال میں "المغنی" اور موضوع حدیثوں کے باب میں "تذکرۃ الموضوعات" بھی تصنیف کیں۔ ان کے اساتذہ میں شیخ علی متقیؒ کے علاوہ شیخ ابن حجر مکیؒ، شیخ ابو الحسن بکری، شیخ جار اللہ بن فہد اور شیخ علی بن العراق جیسی بزرگ ہستیاں شامل تھیں۔ [1]

شیخ حسام الدین متقیؒ کے خلفاء گرامی میں شیخ علی متقیؒ کے علاوہ شیخ میلونؒ بھی ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ شیخ میلون کی خلافت مخدوم چننؒ کے حصہ میں آئی۔ مخدوم چنن سے مخدوم برہان نے کسب فیض کیا۔ مخدوم برہان کے خلیفہ مخدوم طیب تھے۔ مخدوم طیب سے یہ نعمت باطنی شیخ عبدالکریم سہروردیؒ کو حاصل ہوئی۔ شیخ عبدالکریم کے دو جلیل القدر خلفاء تھے۔ ایک شاہ حبیب ملتانی جن سے ایک فرقہ حبیب شاہیہ مشہور ہے۔ ان کا مزار شاہ شمس سہروردی کے

---

[1] مولانا محمد بن طاہر پٹنی کو ۹۸۶ھ میں مہدویوں نے قتل کر دیا۔ مزار مبارک پٹن (گجرات انڈیا) میں ہے۔

[2] شیخ حسام الدین متقی کے سلسلے کے ان بزرگوں کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہیں۔

مقبرہ کے قریب واقع ہے۔ دوسرے مولانا اسماعیل جو میاں وڈہ کے نام سے مشہور ہوئے اور جن کا مدرسہ " درس میاں وڈہ " کے نام سے لاہور میں آج بھی مشہور ہے مولانا اسماعیل کا انتقال اورنگ زیب کے عہد میں ۵ شوال ۱۰۸۵ھ کو لاہور میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ مولانا اسماعیل کا مدرسہ حفظِ قرآن کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اب بھی جس کا حافظہ کمزور ہوتا ہے وہ آپ کی قبر کی گھاس کھاتا ہے۔ اور اسے قرآن شریف جلد حفظ ہو جاتا ہے۔ [1]

مولانا اسماعیل کے خلفا میں شیخ محمد صالح، میاں جان محمد لاہوری، حافظ فتح محمد خوشابی وغیرہ بڑے مشہور ہوئے اور ایک مخلوق ان سے فیضیاب ہوئی۔

مخدوم شیخ محمود دریا نوش

آپ حضرت قطب العالم برہان الدین بخاریؒ کے سب سے بڑے فرزند گرامی اور سجادہ نشین تھے۔ ۸۰۹ھ میں پٹن (نہروالہ) میں پیدا ہوئے اور ۷۵ برس کی عمر میں ۸۸۴ھ میں بٹوا میں آپ کا وصال ہوا۔ حضرت قطب العالم کو آپ سے اپنی تمام اولاد میں سب سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔ چونکہ تصوف و سلوک میں آپ کا مقام بہت اونچا تھا۔ اس لئے حضرت قطب العالم آپ کو بھائی محمود کہہ کر پکارتے۔ حضرت قطب العالم کو جو خرقۂ خلافت اپنے جد امجد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ورثہ میں ملا تھا وہ آپ نے حضرت محمود کو عطا فرما کر خلافت سے سرفراز فرمایا، آپ کا لقب دریا نوش تھا۔ مشہور ہے کہ ایک بار حضرت شاہ عالم پر مستی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حضرت قطب العالم کو پتہ چلا تو فرمایا۔ دیکھو تمہارے بھائی محمود کو ہم نے معرفت الٰہی کے خم کے خم پلا دیئے اور

---

[1] آپ نے یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ حفظِ قرآن کا فیض میرے انتقال کے بعد میری قبر کی خاک سے بھی جاری رہے گا۔

عشقِ خداوندی کے سمندر پی کر بھی وہ اپنے آپ میں رہا مگر تم ایک قطرہ بھی ہضم نہ کر سکے۔ اس واقعہ کے بعد آپ "دریا نوش" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

بجام ہر کسے ہرگز شراب عشق کے گنجد
خوشا رندے کہ خم خم نوشد و ناید ز وے بوئے

آپ کا مزار اپنے والد ماجد کے پہلو میں دائیں جانب واقع ہے۔

مشہور روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے مریدین و معتقدین کا ایک گروہ سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ مال تجارت جو چاول کے ذخیرے پر مشتمل تھا، کشتی میں لدا ہوا تھا۔ کشتی سمندر کے سینے پر رواں تھی کہ ایک جگہ اچانک خود بخود رک گئی۔ باوجود کوشش کے بھی ایک قدم اپنی جگہ سے نہ ہلی، کشتی میں ایک بزرگ موجود تھے جو حضرت شاہ محمود دریا نوش کے مرید خاص تھے اور جنات کے عامل تھے۔ انہوں نے تصرف باطنی سے معلوم کیا کہ یہ حرکت جنوں کی ہے۔ کشتی روکنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہم شاہ محمود دریا نوش کے مرید ہیں۔ ان کا عرس قریب ہے اس لئے یہ چاول درکار ہیں ہم ان کی قیمت ادا کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق چاول سمندر میں گرا دیئے گئے اور مقررہ قیمت انہوں نے ادا کر دی۔ (مناقب برہانی قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن سے ماخوذ)

مخدوم شیخ عبداللطیفؒ

آپ حضرت قطب العالم کے خلیفہ اعظم تھے۔ حضرت قطب العالم کو آپ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ فرماتے تھے کہ عبداللطیف میرا بارھواں بیٹا ہے۔ جب کبھی آپ پٹن سے اپنے پیر و مرشد حضرت قطب العالم کی زیارت و قدم بوسی کے لئے بٹوا تشریف لاتے تو سب سے پہلے جو شخص قطب العالم کو آپ کی آمد کی خبر دیتا۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو آپ اسے ایمان پر خاتمہ کی دعا سے نوازتے اور اگر غیر مسلم ہوتا تو

سونے کا سکہ عنایت فرماتے۔

شیخ عبداللطیف انتہائی عابد و زاہد اور اللہ پر توکل رکھنے والے بزرگ تھے مشہور یہ ہے کہ حضرت قطب العالم کے بعد علاقۂ گجرات کی قطبیت آپ کو عطا ہوئی۔ آپ بہت بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ کی جملہ تصنیفات کی تعداد نو ہے جن میں سے چند ایک کتابیں اب بھی مخطوطہ کی شکل میں موجود ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف 'لطائف برہانی' کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں ہے ایک اور معرکہ آرا کتاب 'منشور خلافت' ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بھی گجرات میں ملتا ہے۔ آپ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے صاحبزادگان نے فقر و فاقہ سے تنگ آکر آپ کے خادم خاص عبدالملک سے کہا کہ ہمارے کھانے پینے کا کوئی بندوبست کرو کہ بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ جب بچوں کا اصرار حد سے بڑھا تو عبدالملک نے تنگ آکر کہا کہ میں بازار میں حلوا بیچ کر تو نہیں آ رہا ہوں کہ اس کے پیسوں سے تمہیں کھانا کھلاؤں۔ اپنے والد سے جا کر کہو کہ وہ شاہی وظیفہ قبول کر لیں تاکہ دو وقت کی روٹی تو میسر آئے۔ صاحبزادگان نے آپ سے آکر عرض کیا آپ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا۔ میں بادشاہوں سے نذر نیاز قبول کرنے کا روادار نہیں ہوں۔ جب بچوں نے بہت تنگ کیا تو آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ آپ نے فقر و قناعت کو اختیار فرمایا۔ ہم جو حضورؐ کی بارگاہ کے گتے ہیں (ما کہ سگاں آں درگا ہیم) ہمیں کہاں یہ زیب دیتا ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ حضرت قطب العالم نے بارہا مجھے خزانۂ خداوندی میں تصرف کا اختیار عطا فرمایا مگر میں نے اسی لئے قبول نہیں کیا۔ اب تم نہیں مانتے تو حجرے میں جا کر جتنا روپیہ چاہیئے، لے لو۔ دیکھا تو سارا حجرا زرِ خالص سے بھرا ہوا تھا یہ دولت گیارھویں صدی ہجری تک اس خاندان میں رہی۔ آپ کا مزار پٹن میں ہے۔ وفات ۴ رمضان ۱۰۰۵ھ میں ہوئی۔ (مناقب برہانی)۔

سید عثمان شمع برہانی

آپ بھی حضرت قطب العالم برہان الدین بخاری سہروردی کے خلفا میں سے ہیں۔ حضرت قطب العالم نے آپ کو شمع برہانی کا خطاب مرحمت فرمایا۔ عمر بھر پیر کی خدمت میں مصروف رہے اور ظاہری و باطنی فیوض سے بہرہ ور ہوئے۔ نہایت عابد و زاہد اور متوکل و قانع بزرگ تھے۔ آپ کی درگاہ کے خادم نے ایک مرتبہ شکایت کی کہ لنگر کا خرچہ پورا نہیں پڑتا۔ آپ نے فرمایا " سابرمتی دریا کے کنارے جا کر وہاں سے روزانہ کا خرچ لے آیا کرو۔" خادم حکم کے مطابق دریا پر جاتا اور دیکھتا کہ بجائے پانی کے اشرفیاں بہہ رہی ہیں۔ ضرورت کے مطابق رقم وہاں سے لے آتا۔ یہ برکت آپ کے خاندان میں ایک عرصہ تک قائم رہی۔

حضرت قطب العالم نے آپ کو اپنے صاحبزادہ حضرت شاہ عالم کی طرح خزانۂ الٰہی میں تصرف کی طاقت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ سابرمتی کے کنارے وضو کے لئے تشریف لائے۔ سوچ رہے تھے کہ اگر کوئی برتن ہوتا تو اہلیہ کے لئے بھی وضو کا پانی لے جاتے۔ اتنے میں ایک ہندو لڑکا جس کا نام کرادھو تھا، تانبہ کے برتن میں پانی بھرنے کے لئے دریا کے کنارے پہنچا۔ آپ نے اسے دیکھا تو فرمایا اگر یہ برتن مجھے دے دو تو میں پانی گھر پہنچا کر برتن واپس کر دوں گا۔ اس نے آپ کی بات مان لی۔ آپ پانی لے کر گھر پہنچے اور اس لڑکے کو برتن واپس دیتے ہوئے اس سے فرمایا "تم بھی ہمارے پاس ہی آ جاؤ گے اور یہیں رہو گے۔" اس وقت تک آپ کے مکان کے ارد گرد دور دور تک کوئی بستی نہیں تھی اس لئے بچہ آپ کی یہ بات سن کر متعجب ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ اس اجاڑ جگہ پر کون آ کر رہے گا۔ جب وہ دریا پر دوبارہ برتن بھرنے کے لئے گیا تو دیکھا کہ بجائے

ف دریائے سابرمتی جس کے کنارے ہندوستان کا مشہور صنعتی شہر احمد آباد آباد ہے۔

پانی سکے اشرفیاں بہہ رہی ہیں۔ جب اس واقعہ کا چرچا ہوا تو لوگ دھڑا دھڑ آپ کے پاس آنے لگے۔ اور بہت جلد یہاں ایک بستی بس گئی جو عثمان پورہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ آپ کی طرف رجوعِ خلق بہت زیادہ تھا۔ بے شمار غیر مسلم آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۸۶۲ھ میں احمد آباد محلہ عثمان پورہ میں آپ کا انتقال ہوا۔[1]

غوث الوریٰ حسن فقیہہ ؒ

آپ بھی گجرات کے جلیل القدر مشائخ میں سے ہیں۔ حضرت خواجہ فریدالدین گنجشکرؒ کے پوتے حضرت شاہ رکن الدین کان شکر کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کے والد ماجد قاضی قطب الدین بھی بہت بڑے صاحب فیض بزرگ تھے۔ آپ نے ان سے بھی نعمتِ خلافت حاصل کی۔ بعد ازاں حضرت گنج احمد مغربی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔ پھر حضرت قطب العالم برہان الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔ علوم شریعت و طریقت کے زبردست عالم تھے۔ گجرات میں ایک عالم آپ کا مرید و معتقد تھا۔ آپ نسباً سادات باقریہ میں سے تھے۔ ۲۸ رجب ۸۴۹ھ میں انتقال فرمایا۔ مزار مبارک پٹن میں ہے۔

شیخ علی خطیب ؒ

آپ بھی حضرت قطب العالم برہان الدین کے خلیفہ مجاز اور نہایت عابد و

---

[1] حضرت سید عثمان شمع برہانی بڑے قادر الکلام اور نغز گو شاعر تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

عرش فرش است کہ در خلوت درویشانست   رنج گنج است کہ ہم صحبت درویشانست

خلعت دولت جاوید اگر می خواہی   خرقہ باکسوت عظمت درویشانست

قصد غرق شدن عالم و آں طوفاں را   خواندہ باشی کہ ہم از ذہنت درویشانست

زاہد بزرگ تھے۔ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ ۱۲ برس کی عمر میں سلوک کی اعلیٰ منازل طے فرما چکے تھے۔ خود رو غلہ اور سبزی کا استعمال فرماتے باقی ہر قسم کے کھانوں سے پرہیز کرتے تھے۔ حضرت شیخ علی خطیب کو نوجوانی کے ایام میں ایک مجذوب اکثر کہا کرتا شیخ علی! مسلمان ہو جاؤ۔ جس کی تعبیر آپ نے یہ کی کہ کس بزرگ سے بیعت ہونے کا حکم ہوا ہے چنانچہ آپ ایک روز حضرت گنج احمد مغربی کی خدمت میں بیعت کی نیت سے سرخیز کی جانب روانہ ہوئے۔ دل میں خیال آیا کہ حضرت قطب العالم کی صحبت میں بھی حاضر ہوں مگر پھر اس خیال سے باز رہے کہ حضرت قطب العالم کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی ہے اور چونکہ آپ سماع کے قائل نہ تھے اس لئے بٹوا جانے سے باز رہے۔ اثناء سفر میں اچانک ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے آپ کی بیل گاڑی کا رُخ سرخیز کی بجائے بٹوا کی طرف موڑ دیا چنانچہ آپ بٹوا پہنچ کر حضرت قطب العالم کے مرید ہوئے اور خلافت واجازت سے سرفراز ہو کر سلوک کے مراتب عالیہ پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد آپ بھی سماع کے قائل ہو گئے۔ بڑے صاحب ذوق اور اہل نظر بزرگ تھے۔ نسباً صدیقی ہیں۔ آپ کا وصال احمد آباد محلہ قدن پورہ میں ہوا۔ وہیں آپ کا مزار مبارک ہے۔ سن وفات غالباً ۱۴ ربیع الاول ۸۷۰ھ ہے۔

مولانا سماء الدین سہروردیؒ

اوچ کے خانوادہ بخاریہ سہروردیہ کے منتسبین میں جو لوگ "نام نیک رفتگان" کی عظمت کے نگہدار ثابت ہوئے۔ ان میں حضرت مولانا سماء الدین سہروردی کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا ذات کے کمبوہ[1] تھے۔ ان کے جد امجد حاجی جمال

سینہ بے کینہ عثمان شدہ گنجینہ عشق — ایں فتوح از مژدۂ ہمت درویشانست

[1] کمبوہ ملتان کا پرانا قبیلہ ہے جو حضرت مخدوم شیخ الاسلام بہاؤ الحق زکریا ملتانیؒ کی تبلیغی کوششوں

حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے خدام اور مریدین خاص میں سے تھے۔ حاجی جمال کے ایک فرزند شیخ فخرالدین احمد تھے جو اپنے والد کی طرح حضرت سید صدرالدین راجو قتال کے مرید ہوئے مگر خرقہ خلافت خانوادۂ بخاریہ کے ایک بزرگ سید کبیرالدین حامد بخاریؒ سے حاصل کیا۔

مولانا سماءالدین سہروردیؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ حق شناسی اور حق گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سلطان بہلول لودھی جب آپ کی زیارت کی غرض سے حاضر خدمت ہوا تو آپ نے حاضرین مجلس کی موجودگی میں اس سے مخاطب ہو کر فرمایا :۔

اے سلطان ! تو بڑھاپے میں تخت و تاج کا مالک بنا ہے تیرا دل خوفِ خدا سے شناسا ہے اپنے آپ کو جھوٹ اور گناہوں سے بچا کر رکھ اور منعم حقیقی کے شکریہ سے کبھی غافل مت رہ تاکہ "لئن شکرتم لا زیدنکم" (اگر تم شکرگزار ہو گئے تو ہم تمہاری نعمتوں میں اضافہ کر دیں گے) کی بشارت کے مستحق بن سکو۔ ایسا نہ ہو کہ " ولئن کفرتم ان عذابی لشدید " (اور اگر ناسپاسی کروگے تو میری گرفت بڑی سخت ہے) کی وعید کے سزاوار ٹھہرو۔

سلطان پر اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ دیر تک روتا رہا اور آنسوؤں سے اس کی داڑھی بھیگ گئی۔ عرض کیا۔

مخدوما ! باوجود ایک گنہگار انسان ہونے کے درویشان حق کی محبت سے

سے مشرف بہ اسلام ہوا۔ " کاشف الاستار " کی روایت کے مطابق یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں متوطن ہوئے لیکن جو کھوہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے وہ صرف ملتان اور اس کے اطراف کے اضلاع میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ بھی باوجود ہندو ہونے کے نہایت معقول ہیں۔ (اما روش ایشاں ہمہ پسندیدہ و شرافت لازم ذات ایں فرقہ است۔

(مقدمہ کاشف الاستار صفحہ ۲۲)

میرا دل معمور ہے اور امید رکھتا ہوں کہ اس گروہ اولیاء اللہ کی محبت کے صدقہ میں آخرت کے عذاب سے بچ سکوں۔ [1]

مولانا سماءالدین ایک عرصہ تک ملتان میں اقامت پذیر رہے۔ بعد ازاں رنتھمبور اور بیانہ میں بھی کچھ عرصہ قیام فرمایا اور پھر دہلی تشریف لے گئے اور وہیں ۱۷ ار جمادی الاولیٰ ۹۰۱ھ میں انتقال فرمایا اور قطب صاحب میں حوض شمسی کے کنارے دفن ہوئے۔

مولانا سماءالدین بڑے فیاض، دریا دل اور قانع و شاکر شخص تھے "شیخ ہرگز درمے و دینارے در ملک خود نمے گزاشت" ہزاروں کی آمدنی کے باوجود اپنے پاس ایک حبہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ تسخیر قلوب کا ملکہ قدرت کی جانب سے ودیعت ہوا تھا۔ آپ کے خلفا و مریدین ہزاروں کی تعداد میں تھے مگر سب سے زیادہ شہرت مولانا جمالی کو ہوئی جن کی کتاب سیر العارفین ایک مستند تاریخی تذکرہ ہے۔

مولانا جمالی سہروردیؒ

مولانا سماءالدین سہروردیؒ کے تین صاحبزادے تھے۔ تینوں اپنے والد کے حقیقی جانشین تھے۔ ان کے اسماگرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ عبداللہ بیابانی جن کا مزار قلعہ مانڈو سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے شیخ نصیرالدین سہروردی تھے جو اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ تیسرے شیخ عبدالغفور تھے جن کے بارے میں مولانا سماءالدین فرمایا کرتے تھے کہ "عبدالغفور چراغِ خانہ ماست"۔ ان تینوں فرزندان حقیقی کے علاوہ آپ کے فرزندان معنوی ہیں شیخ زین العابدین سہروردیؒ دہلوی اور مولانا جمالی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر یعنی مولانا زین العابدین شیخ ادھن کے لقب سے

---

[1] سیر العارفین قلمی ص ۲۲۳

سے مشہور تھے۔ اخبار الاخیار کے مصنف حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ آپ کے نواسے تھے۔ مولانا زین العابدین اہل اللہ میں سے تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ سلطان ابراہیم لودھی نے آپ کو حجابت کا عہدہ پیش کیا تھا مگر آپ نے معذرت فرما دی۔ آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل مولانا عبداللہ تلمبی کی خدمت میں رہ کر کی۔ ۸۴۴ھ میں انتقال ہوا اور آپ اپنے پیر و مرشد کے مزار سے متصل دفن ہوئے۔

مولانا جمالی حضرت شیخ سماالدین سہروردیؒ کے خلیفہ اجل تھے۔ اپنے پیر سے دامادی کا رشتہ بھی رکھتے تھے۔ ذات کے اعتبار سے بھی اپنے پیر کے خاندان یعنی کمبوہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جلال الدین نام تھا اور اسی نسبت سے اپنا تخلص رکھا، لیکن پھر اپنے مرشد کے حکم سے جمالی تخلص رکھ لیا۔ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے اور شاعری کی کسی صنف میں بند نہیں تھے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل ہر زمین میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ سیر و سیاحت کے شوقین تھے۔ جب سفر حجاز کے لئے روانہ ہوئے تو اثنائے سفر میں رہزنوں کے ہتھے چڑھ گئے انہوں نے جسم کا لباس تک اتروا لیا۔ ایک تہہ بند باندھے ہوئے ہرات پہنچے اور مولانا عبدالرحمان جامیؒ سے اسی عالم میں ملے۔ انہوں نے ایک مفلوک الحال اور غبار آلود شخص کو دیکھا تو از راہِ تفنن فرمایا۔ میاں تو و خر چندیں فرق است (تم میں اور گدھے میں کیا فرق ہے)؛ مولانا جمالی حاضر جواب غضب کے تھے فوراً اپنا اور مولانا جامی کا فاصلہ ناپا اور کہا۔ یک بالشت (صرف ایک بالشت کا فاصلہ ہے) مولانا جامی چپ ہو گئے۔ پھر پوچھا کون ہو؟ کہنے لگے کہ از خاکسارانِ ہند (ہندوستان کے خاک نشینوں میں سے ہوں) مولانا جمالی کے کلام کی شہرت مولانا جامی تک پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے دریافت کیا۔" از سخنانِ جمالی چیزے یاد داری؟ (جمالی کا کوئی شعر یاد ہے) مولانا جمالی نے یہ دو شعر پیش کئے جو ان کے حسب حال بھی تھے۔

دو سہ گز بوریا و پوستکے ۔۔۔ دلکے پر ز درد دوستکے

ننگے زیر و ننگے بالا ! نے غم دزد و نے غم کالا !
ایں قدر بس بود جمالی را عاشق رند و لا ابالی را !

مولانا جامی متاثر ہوئے پوچھا۔ طبع شیرداری بلا شعر کا ووق رکھتے ہو! انہوں نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا

مارا ز خاک کویت پیراہن است برتن
آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بہ دامن

یہ شعر پڑھا اور آب دیدہ ہو گئے۔ مولانا جامی سمجھ گئے بڑی عزت و تکریم سے پیش آئے۔[1]

مولانا جمالی اپنے پیر و مرشد کی محبت سے سرشار اور اہل دنیا سے لاتعلق رہے سلطان سکندر لودھی آپ کا بڑا عقیدت مند تھا چنانچہ اس نے آپ کی شان میں ایک قصیدہ بھی کہا جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

اے مخزنِ گنج لا یزالی | وے سالک راہ دین جمالی
در گرد جہاں بسے زدی سیر | در منزل خود رسیدی بالخیر
بودی تو مسافر زمانہ | الحمد کہ آمدی بہ خانہ
در مکہ و در مدینہ گشتی | گوہر بودی خزینہ گشتی
اے شیخ بہ ما برس بہ زودی | بسیار مسافرت نمودی
بکشا بسوئے در گہم کام ! | تا دریابی ز مکرخی کام !
چشم بہ جمال تو طپاں است | دل مرغ مثال در فغان است
منم اسکندر و تو خضر مائی | آں بہ کہ بہ سوئے ما بیائی!
و شیخ زدوستاں نشد سیر | تشریف نمودنش کنند دیر
از مہر کشد دو دیدہ را نور ! | آں مہ نشود ز دیدہ ام دور

---

[1] دربار اکبری

مولانا جمالی کو بھی سکندر لودھی سے خصوصی تعلق تھا تاہم اس تعلق میں کوئی دنیاوی غرض پوشیدہ نہ تھی جیسا کہ ایک شعر میں، انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے۔

میان ما و شما دوستی براہ خدا ست

نہ از برائے متاع زمانہ غدار

مولانا جمالی کے بعض اشعار کو قبول عام کی سند عطا ہوئی ان کا یہ نعتیہ شعر اہل دل کا سرمایہ ہے۔

موسیٰؑ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات

تو عین ذات می نگری در تبسمی

ان کا یہ شعر بھی بے مثال معنوی لطافت کا حامل ہے۔

عشق را طرفہ لسانے است کہ صد سالہ سخن

دوست با دوست بیک چشم زدن می گوید

مولانا جمالی کا یہ قطعہ بھی بڑا مقبول اور زبان زد خواص ہے

طال شوقی الی منازلکم ایہا الغائبون عن نظری

روز و شب مونسم خیال شماست فاسئلوا عن خیالکم خبری:

مولانا جمالی صاحب تصنیف بزرگ تھے انہوں نے سہروردی بزرگان طریقت کے حالات پر ایک ضخیم کتاب سیر العارفین لکھی ہے جو اس موضوع پر بڑی جامع اور مستند خیال کی جاتی ہے۔ ایک مثنوی 'مہر و ماہ' کے عنوان سے سپرد قلم کی ہے۔ یہ مثنوی انہوں نے تبریز میں بیٹھ کر لکھی ہے جس میں شہزادہ مہ اور شہزادہ ماہ کی داستان محبت نظم ہے۔ مثنوی کا یہ شعر کتنا زوردار ہے۔

مرا تا دل بہ ایمان و یقین است

محبت مذہب است و عشق دین است

مولانا جمالی ۱۰ ذیقعدہ ۹۴۲ھ کو گجرات میں فوت ہوئے۔ وہ ان دنوں ہمایوں بادشاہ کی فوجی مہم میں اس کے ہم رکاب تھے اور دہلی میں دفن ہوئے۔ مولانا سے دو

صاحبزادے تھے دونوں شاعر اور اصحاب طریقت میں سے تھے۔ایک شیخ گدائی سہروردی دوسرے شیخ عبدالغنی حیاتی سہروردی، دونوں باکمال بزرگ تھے۔

سید عبدالوہابؒ بخاری سُہروردیؒ

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے فرزند اکبر مخدوم سید ناصرالدین محمود کو اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے فرزندان گرامی عطا فرمائے جو سلسلہ عالیہ، بخاریہ، سہروردیہ کے چشم و چراغ ثابت ہوئے۔ان میں شیخ عبدالوہاب بخاری کا نام نمایاں عظمت کا حامل ہے۔آپ نے تربیت باطنی اپنے جد امجد کے خلیفہ اعظم حضرت سید صدرالدین راجن قتال سے حاصل کی۔ خرقہ خلافت بھی ان سے حاصل کیا۔پیر و مرشد سے رشتہ مصاہرت بھی تھا۔حضرت مخدوم سید صدرالدین راجن قتال کی آپ پر خصوصی نظر عنایت تھی۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ ایک روز حضرت صدرالدین راجو قتال نے گفتگو کے دوران فرمایا کہ اس دنیا میں دو نعمتیں ایسی ہیں کہ دنیا جہان کی نعمتیں ان کے مقابلہ میں ہیچ ہیں مگر لوگ ان کے حصول کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔

ایک نعمت تو حضور سرور کائنات حضرت پیغمبرِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود ہے۔ مدینہ منورہ میں بعفت حیات آپ کا فیض عام جاری ہے مگر لوگ اس سعادت عظمیٰ کے حصول میں غفلت شعاری کے مرتکب ہیں۔

دوسرا قرآن مقدس ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر لوگ خدا سے ہمکلامی کے اس شرف سے محروم رہتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالوہاب بخاری نے یہ ارشاد گرامی سنا تو مدینہ منورہ کی حاضری کے لئے دل بے تاب ہوگیا۔ فوراً مرشد سے اجازت طلب کی اور خشکی کے راستے عازم حرمین شریفین ہو گئے۔ کچھ عرصہ حجاز میں قیام کرنے کے بعد واپس آئے۔ زیادہ تر

وقت نہیں گزرا تھا کہ مخدوم سید صدرالدین راجن قتال کا انتقال ہو گیا۔ لنگاہوں کے ابتدائی دور حکومت میں اوچ اور ملتان قحط سالی کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس زمانہ میں آپ نے دہلی کا قصد کیا اور وہاں اقامت اختیار کی۔ سلطان سکندر لودھی کی حکمرانی کا عہد تھا اس سے آپ سے حد درجہ تعلق خاطر ہو گیا اور وہ آپ کی خدمت میں بڑی نیاز مندی کے ساتھ حاضر ہو کر آداب بجا لاتا۔[1] سلطان سکندر لودھی بزرگوں سے عقیدت کے باوجود اتباع سنت کا زیادہ پاس نہیں رکھتا تھا اور داڑھی منڈواتا تھا۔ حضرت شیخ عبدالوہاب بخاری نے سید صدرالدین راجن قتال کی آنکھیں دیکھی تھیں وہ شریعت کی اس بے حرمتی کو کب گوارا کر سکتے تھے اس لئے اس بات پر بادشاہ کو ٹوکا۔ بادشاہ نے شروع شروع میں تو حیلے بہانے سے بات ٹالنی چاہی مگر جب حضرت موصوف کی فہمائش بڑھی تو بادشاہ کو یہ بات ناگوار گزری شیخ نے بادشاہ کے تیور بگڑے دیکھے تو آداب شاہی کی پرواہ کئے بغیر دربار سے اٹھ کر آ گئے۔ شیخ کے ایک بھتیجے سید عبدالجلیل بھی دربار میں موجود تھے۔ بادشاہ نے انہیں مخاطب ہو کر کہا کہ لوگ ہماری وجہ سے ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ ہماری اس رعایت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حضر سید عبدالوہاب سہروردی کو جب بادشاہ کی اس بات کا علم ہوا تو فرمایا "جس حلق سے یہ بات نکلی ہے، وہ حلق بند ہو جائے گا۔" تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ بادشاہ حلق کی بیماری میں مبتلا ہوا اور اسی جان لیوا مرض میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ سید عبدالوہاب بخاری حضرت مخدوم صدرالدین راجن قتال کے بعد شیخ عبداللہ سہروردی کی صحبت میں بھی رہے۔ شیخ عبداللہ سہروردی شیخ محمد یوسف قریشی سہروردی فرمانروائے ملتان کے فرزند اکبر تھے۔ سید عبدالوہاب نے اپنی مشہور تفسیر میں شیخ عبداللہ کو "مرشدی" (میرے پیر) لکھا ہے۔ شیخ کی علمی یادگار قرآن مقدس کی تفسیر ہے جو عربی زبان میں

---

[1] خزینۃ الاصفیا ج ۲

ہے اور جس میں ہر آیت کریمہ کے مطالب و معانی سے عشق و محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال کیا ہے۔ شیخ کا انتقال اخبار الاخیار کی روایت کے مطابق ۹۴۲ھ میں ہوا اور شیخ عبداللہ کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔

سید جمال الدین بخاری سہروردیؒ

کشمیر کے خطۂ جنت نظیر میں اسلام کا پھیلاؤ مشائخ سہروردیہ کی تبلیغی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ کشمیر کے سہروردی مشائخ میں مخدوم شیخ حمزہ بڑی شہرت و ناموری کے حامل تھے۔ شیخ حمزہ سید جمال الدین بخاری سہروردی کے خلیفۂ اجل تھے۔ سید جمال الدین بخاری سید عبدالوہاب بخاری کے چھوٹے بھائی اور مرید و خلیفہ تھے۔ جن دنوں کشمیر پر چک خاندان کی حکومت تھی

سید جمال الدین بخاری

سہروردی کشمیر تشریف لے گئے۔ سید موصوف کی کشمیر میں آمد کی غرض و غایت یہ تھی کہ مسالک حنفیہ اہلسنت کی تقویت ہو۔ چنانچہ کشمیر میں آپ کے وجود گرامی کی برکت سے طبقہ اہل سنت کی مساجد جو ایک عرصہ سے بند پڑی تھیں یا بہ طور گودام استعمال ہوتی تھیں۔ نہ صرف وا گزار ہوئیں بلکہ ان میں باقاعدہ نماز باجماعت کا اہتمام کیا گیا۔

حضرت سید جمال الدین بخاری سہروردی کی تبلیغی کوششوں سے کشمیر کی کایا پلٹ گئی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ آپ کے حلقہ بگوش ہوئے۔ کشمیر میں آپ کے نامور خلفاء میں سرِ فہرست مخدوم شیخ حمزہ کا نام آتا ہے جن کے فیض روحانی سے مسلک اہلسنت اور طریقہ سہروردیہ کو کشمیر میں فروغ نصیب ہوا۔ سید جمال الدینؒ ایک عرصہ تک کشمیر میں قیام پذیری کے بعد وہاں واپس تشریف لے آئے اور وہیں ۱۰۸ھ میں انتقال فرمایا۔

مخدوم شیخ حمزہ کا وصال ۹۸۴ھ میں ہری پربت کے مقام پر ہوا جہاں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ شیخ حمزہ کے مریدین باصفا میں بڑے جلیل القدر بزرگان گرامی کے نام ملتے ہیں ان میں علامہ فیروزالدین مفتیؒ کاشمیر، بابا داؤد خاکی اور بابا ردبی ریشیؒ کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بابا داؤد خاکی نے اپنے مرشد کے حالات و کوائف پر ایک کتاب "وردالمریدین" کے نام سے تحریر کی ہے پھر اس کتاب کی شرح بھی خود ہی دستورالسالکین کے نام سے تالیف کی۔ وردالمریدین کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

شکر اللہ حال من ہر لحظہ نیکو تر شد است
شیخ شیخاں شیخ حمزہ چوں مرا رہبر شد است

بابا داؤد خاکی کا سن وفات ۹۹۴ھ ہے۔ آپ کے خلفا میں بابا نصیب الدین کشمیری سہروردی بڑی شان کے بزرگ ہوئے ہیں۔ بابا نصیب الدین کشمیری کے خلفا میں شیخ عبدالرحیم سہروردی کا نام ملتا ہے جو اس سے پہلے حضرت میاں میر لاہوریؒ کے خلیفہ اجل تھے۔ مولانا حیدر کشمیری بھی آپ کے وابستگان دامن میں سے تھے۔ مولانا حیدر کو حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے نسبت تلمذ حاصل تھی۔ کشمیر کے بزرگوں میں ایک شخصیت شیخ حسن لالو کشمیری قدس سرہٗ کی تھی جو حضرت خواجہ فریدالدین عطار کی اولاد میں سے تھے۔ انہوں نے بھی حضرت شیخ جمال الدین بخاری اور مخدوم حمزہ کشمیری اور بابا نصیب الدین سہروردی سے اکتساب فیض کیا۔ عمر کا بیشتر حصہ تجرد میں گزرا۔ عمر طویل پائی۔ آخری عمر میں متاہل ہوئے۔ مدرسہ ملا ابوالفتح میں درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ مسائل دینی پر گہری نظر تھی۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کا انتقال ۱۰۹۹ھ میں ہوا۔ اور مخدوم حمزہ کے مزار سے متصل دفن ہوئے۔

یہ ایک نا تمام سا تذکرہ ہے ان مشہور و معروف شخصیتوں کا جو اپنے اپنے دور میں قطبیت کے مدارج عالیہ پر فائز ہوئیں اور احوال و کیفیاتِ باطنی کا

درس انہوں نے اوچ کے مکتبِ طریقت سے حاصل کیا۔ یہ صرف خانوادۂ بخاریہ کے چند ایک منتسبین کا ذکر جمیل ہے۔ ابھی اوچ کے خانوادۂ گیلانیہ سے شرفِ نسبت رکھنے والے بزرگوں کا ذکر باقی ہے اور اس کے لئے بھی ایک طویل دفتر درکار ہے۔ اگلے صفحات میں اس سلسلے کے چند بزرگوں کا ذکر کیا جائے گا۔

خانوادۂ گیلانیہ

حضرت سید ابوالحسنؒ جمال الدین موسیٰ پاک شہیدؒ

اوچ کے خانوادہ گیلانیہ کے شیخ الکل حضرت شاہ محمد غوث علیہ الرحمۃ کے مریدین و منتسبین اور خلفاء میں بڑے بڑے نامی گرامی علماء ارباب زہد و تقویٰ اصحاب فضل و کمال اور اہل اقتدار و حشم کے نام ملتے ہیں۔ آپ کے بعد آپ کی مسند سجادگی پر آپ کے جلیل القدر فرزند سید عبدالقادر ثانی متمکن ہوئے۔ سید موصوف کے سجادہ نشین ان کے صاحبزادۂ گرامی سید عبدالرزاق گیلانی تھے۔ سید عبدالرزاق گیلانی کے بعد ان کے فرزند سید حامد گنج بخش علیہ الرحمۃ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کے بعد ان کے فرزند سید ابوالحسن جمال الدین موسیٰ پاک شہید کو آپ کا جانشین بنایا جائے لیکن سید حامد گنج بخش کے بڑے صاحبزادے سید عبدالقادر ثالث کو یہ امر ناگوار گزرا اور انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑا شروع کر دیا جس سے دل برداشتہ ہو کر حضرت موسیٰ پاک شہید ملتان تشریف لے آئے اور وہیں سکونت اختیار فرمائی۔ ۱۰۰۱ھ میں لانگاہ قوم کے ایک بد باطن شخص نے آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کا مزار مبارک ملتان میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت موسیٰ پاک شہید بڑے جلیل القدر عالم اور صاحب ارشاد و طریقت بزرگ تھے آپ کے مریدین و خلفا میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا نام ملتا ہے۔ شاہ عبدالحقؒ محدث دہلوی اخبار الاخیار کے مصنف، حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کے شارح اور اپنے زمانہ کے نامور اور مشہور محدث ہیں، آپ کا انتقال دہلی میں ۲۱۔ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں ہوا۔

سید خلیلؒ بھی سید حامد گنج بخش کے فرزند ارجمند اور حضرت موسیٰ پاک شہید کے برادر اصغر تھے۔ شیر شاہ سوری آپ ہی کا مرید تھا۔ سید حامد گنج بخشؒ کے خلفاؒ میں شیخ داؤد کرمانی ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں آپ کا مزار شیر گڑھ ضلع ملتان میں ہے۔ سن وفات ۹۸۲ھ ہے۔ شیخ داؤد کرمانی کے خلیفہ اجل آپ کے حقیقی بھتیجے شاہ ابوالمعالیؒ ہوئے جن کا مزار لاہور میں بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب میں ایک کتاب تحفۂ قادریہ تصنیف فرمائی۔ آپ صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ آپ کا سن وفات ۱۰۲۴ھ ہے۔ حضرت حامد گنج بخشؒ کے ایک فرزند سید محمد شریف تھے ان کے تیسرے فرزند سید محمد زمان کی اولاد تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خاں کے گاؤں جمال دین والی میں آباد ہوئی۔ مخدوم الملک غلام میراں شاہ اور ان کے جو انسال صاحبزادے سید حسن محمود سابق وزیر اعظم ریاست بہاولپور انہی بزرگ کی اولاد میں سے ہیں۔ ملتان کے قریب کراچی کی جانب دوسرا اسٹیشن شیر شاہؒ ہے یہاں حضرت شیر شاہؒ کا

ۛ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ماہ محرم ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شیخ کے والد ماجد شیخ سیف الدین بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے جدامجد شیخ محمد سعداللہ بھی بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے۔ شیخ موصوف کے مورث اعلیٰ آغا محمد ترک تاتاریوں کی شورش کے دوران ہندوستان تشریف لائے۔ یہ سلطان علاؤالدین خلجی کا عہد حکومت تھا۔ آغا محمد ترک کو سلطان گجرات کی فوجی مہم پر بھیجا، آغا موصوف کا انتقال محمد تغلق کے عہد میں ۷۳۹ھ/۱۳۳۸ء میں ہوا۔

مزار ہے وہ بھی حضرت حامد گنج بخش کے خلفا میں سے تھے۔

شیخ داؤد کرمانیؒ کے ایک اور مرید و خلیفہ شیخ ابواسحاق قادری تھے۔ آپ کا قیام بھی لاہور میں مزنگ کے محلہ پیر عزیز میں رہا۔ فقہ و حدیث و تفسیر کے بہت بڑے علامہ تھے۔ بے شمار لوگوں نے آپ سے ظاہری اور باطنی فیض پایا۔ آپ کا انتقال ۵، محرم ۹۸۵ھ میں مزنگ میں ہوا۔

حضرت خواجہ معروف چشتیؒ

حضرت سید محمد غوث اوچی کے فرزند گرامی سید مبارک حقانی پر جن دنوں جذب و سکر کی کیفیت طاری تھی اور آپ آبادی کو چھوڑ کر کسی جنگل میں اقامت پذیر تھے تو اس زمانہ میں حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد میں سے ایک بزرگ حضرت خواجہ معروف چشتیؒ اسی جنگل میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی صحبت میں رہ کر خرقہ ارادت و خلافت حاصل کیا۔ حضرت سید مبارک حقانی نے اپنے اس مرید کو بتایا تھا کہ تم سے تصوف کا ایک جدید خانوادہ پیدا ہو گا۔ چنانچہ قادریہ سلسلہ کی ایک مشہور شاخ نوشاہیہ قادریہ حضرت خواجہ معروف چشتیؒ کی طرف منسوب ہے۔ حضرت خواجہ معروف چشتیؒ کا انتقال ۹۸۷ھ میں ہوا۔ مزار مبارک خوشاب ضلع سرگودھا میں واقع ہے۔

سید اسماعیل گیلانیؒ

آپ حضرت سید محمد غوث کے پوتے تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید عبداللہ ربانی تھا مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے آپ کو لاہور میں ایک وسیع جاگیر عطا کی۔ آپ نے لاہور میں کسی محل متصل مزنگ میں سکونت اختیار فرمائی۔ فیروز پور کے علاقہ میں بھی ایک ہزار بگیہ زمین آپ کو بطور جاگیر ملی تھی۔ آپ کا مزار کسی محل مزنگ لاہور میں حضرت شاہ موج دریا بخاری کے مزار سے متصل واقع ہے۔ انتقال ۹۷۸ھ میں ہوا۔

سید میر میراںؒ

آپ سید مبارک بن سید محمد غوث اوچی کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا مزار قبرستان میانی لاہور میں ہے۔ ۹۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ اپنے عہد میں مرجع خلائق اور مرکز عقیدت بنے رہے۔ خلقِ خدا کی ہدایت و اصلاح میں شب و روز کوشاں رہتے تھے۔ بے شمار بندگانِ حق آپ کے فیوض سے بہرہ ور ہوئے۔

سید محمد غوث بالا پیرؒ

سید عبدالقادر ثانی بن سید محمد غوثؒ کے ایک فرزند گرامی سید زین العابدین تھے سید زین العابدین کا وصال بنگال میں ہوا۔ آپ کفار سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ سید زین العابدین کے ایک فرزند سید محمد غوث بالا پیر تھے جو اپنے جد محترم سید عبدالقادر ثانی کے زیر تربیت رہے اور انہی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ سید عبدالقادر ثانی کے وصال کے بعد جب سید حامد گنج بخش مسند نشین ہوئے تو آپ نے اوچ سے نقل مکانی فرما کر قصبہ ستگھر ضلع ساہی وال میں سکونت اختیار فرمائی اور وہیں ۹۵۹ھ میں انتقال فرمایا۔

سید محمد غوث بالا پیر کے فرزند گر[illegible] سید عبدالقادر تھے جو عبدالقادر ثالث کے نام سے مشہور ہوئے اور سید جیون کے لقب سے معروف تھے۔ آپ کے فرزند معنوی سید عبدالوہاب گیلانی تھے اور سید عبدالوہاب گیلانی کے فرزند ارجمند سید عبدالرزاق گیلانی تھے جو شاہ چراغ کے نام سے مشہور ہیں۔ لاہور میں ہائیکورٹ کی عمارت سے متصل مسجد شاہ چراغ واقع ہے جہاں آپ کا مزار مبارک ہے۔

سید زین العابدین بن سید عبدالقادر ثانیؒ کے ایک فرزند سید محمد گیلانی کے فرزند سید اللہ بخش گیلانی تھے۔ اول الذکر کا مزار لاہور میں ہے اور سید اللہ بخش گیلانی بنگال میں فوت ہوئے۔

ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اوچ کے خانوادہ گیلانیہ کے دیگر کئی ایک منتسبین لاہور کی خاک میں آسودہ ہوئے۔ ان میں حضرت حاجی محمد ہاشم گیلانی اور ان کے صاحبزادگان حضرت سید جعفر سید محمد متوکل اور سید عمر اسی آستانہ عالیہ سے ظاہری اور باطنی نسبت رکھتے تھے۔

استدراک

شیخ الاسلام رکن الدین اسماعیل قریشی

حضرت مخدوم بہاؤالحق ذکریا ملتانی نوراللہ مرقدہٗ کے فیوض باطنیہ سے اوچ کی سرزمین شریعت و معرفت کی ایک عظیم درس گاہ بنی اور ایک وقت وہ آیا جب اس آستانہ عالیہ کے ایک سجادہ نشین کو اکتساب فیض کے لئے اوچ کی اس درسگاہ کا رخ کرنا پڑا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مرشد حضرت شاہ رکن عالمؒ کے وصال کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق مسند سجادگی حضرت شیخ عمادالدین اسماعیل کے فرزند گرامی شیخ صدرالدین محمد کو تفویض ہوئی۔

شیخ رکن الدین اسماعیل قریشی انہی بزرگ کے اکلوتے بیٹے تھے اور حضرت شاہ رکن عالمؒ کی مسند خلافت کے وارث تھے۔ آپ ۷۶۶ھ میں اپنے والد گرامی کے انتقال کے بعد ملتان کی اس عظیم سہروردی خانقاہ کے زیب سجادہ ہوئے شیخ رکن الدین کی روحانی تربیت اوچ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے برادر خورد اور خلیفہ اعظم حضرت سید صدرالدین راجن قتال کے زیر سایہ ہوئی۔ سید صدرالدین راجن قتال نے پیر خانے کے اس ہونہار فرزند کی تربیت میں بڑی دلچسپی لی اور کمال محبت و شفقت سے انہیں علوم باطنی کا درس دیا اور خرقۂ خلافت و بیعت سے سرفراز فرمایا۔

شیخ رکن الدین اسماعیل قریشیؒ کے بعد آپ کے فرزند شیخ عمادالدین صاحب سجادہ ہوئے۔ شیخ عمادالدین کی خلافت و نیابت شیخ الاسلام حضرت صدرالدین

حلیم کے حصہ میں آئی اور ان سے یہ نعمت شیخ محمد یوسف قریشی کو ملی۔ شیخ محمد یوسف کچھ عرصہ تک ملتان اور اوچ کے خود مختار حکمران بھی رہے۔ مخدوم محمد یوسف قریشیؒ کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ شہر اللہ سجادہ نشین ہوئے۔ شیخ شہر اللہ نے اپنے پوتے شیخ کبیر کو اس نعمت باطنی سے نوازا۔

شاہ دولا گجراتیؒ

گجرات (پنجاب) میں ایک مشہور مزار حضرت شاہ دولا علیہ الرحمۃ کا ہے۔ اس مزار کی شہرت کا ایک سبب وہ عجیب و غریب شکل و صورت کے انسان ہیں جنہیں شاہ دولا کا چوہا کہا جاتا ہے ان لوگوں کے سر پچکے ہوئے اور چہرے نہایت مختصر ہوتے ہیں۔ باقی جسم عام انسانی ساخت کے مطابق ہوتا ہے۔ مخبوط الحواس اور از کار رفتہ انسانوں کی یہ قسم پنجاب میں اور بعض دوسرے خطوں میں پیشہ ور بھکاریوں کے لئے اچھا خاصا ذریعہ آمدنی ثابت ہوتی ہے۔ مشہور روایت کے مطابق جو لوگ اولاد سے محروم ہوں وہ حضرت شاہ دولا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استدعا کرتے کہ انہیں اولاد کی دعا سے نوازا جائے۔ آپ ان سے یہ عہد لیتے کہ تمہیں اس صورت میں اولاد مل سکتی ہے کہ پہلوٹھی کا بچہ ہماری نذر کرو چنانچہ پہلا بچہ اس شکل و صورت میں پیدا ہوتا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ شاہ دولا گجراتی کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ آپ سلطان بہلول لودھی کی اولاد میں سے تھے۔ بچپن میں آپ کو کسی نے اغوا کر کے ایک ہندو کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آپ کی نیک سیرت کو دیکھ کر اس ہندو نے آپ کو کچھ عرصہ بعد آزاد کر دیا۔ ان دنوں شاہ سرمست کی بزرگی کا بڑا چرچا تھا۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پیر کی خدمت میں رہ کر مقامات جذب و سلوک طے کئے طبیعت پر جذب و سکر کا غلبہ تھا اور بے شمار خوارق عادات آپ کی طرف منسوب ہیں۔

شاہ سرمستؒ شاہ جونگاؒ کے خلفاء میں سے تھے اور شاہ جونگا کو یہ نعمت

باطنی حضرت شیخ کبیر قریشی سے حاصل ہوئی تھی اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ شیخ کبیر کا شجرۂ طریقت چند واسطوں سے حضرت سید صدرالدین راجن قتال سے جا ملتا ہے۔

ریاست کشمیر کے اکثر و بیشتر علاقوں میں شاہ سرمستؒ کے منتسبین کی خانقاہیں موجود ہیں شاہ سرمست کا مزار سیالکوٹ میں ہے۔ شاہ سرمست کے ایک اور خلیفہ سیدالسادات خانؒ تھے جن سے ایک نیا سلسلہ طریقت سدو شاہی شروع ہوا۔

صاحب معارج الولایت شاہ دولا گجراتی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حسن ابدال کے سفر کے دوران شاہ دولا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت قوالی ہو رہی تھی اور آپ مراقبہ کی حالت میں تشریف فرما تھے شاہ صاحب نے مراقبہ سے سر اٹھایا، میری طرف متوجہ ہوئے اور شیرینی عطا فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ نعمت باطنی سے کچھ بہرہ نصیب ہو۔ مسکرائے اور فرمایا:

"یہ قبول کیجئے وہ بھی دیتا ہوں"۔ اس کے بعد باطنی توجہ سے سرفراز فرمایا۔

حضرت شاہ دولا علیہ الرحمۃ کا انتقال ۱۰۷۵ھ میں ہوا۔ تاریخ وفات "بجنت رسید شہ دولا" سے برآمد ہوتی ہے مزار مرجع خلائق ہے۔

خانقاہِ جمالیہ

اوچ میں سہروردی سلسلہ طریقت کی ایک اور خانقاہ بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ یہ حضرت شیخ جمال الدین خنداں رو کی خانقاہ ہے۔ حضرت موصوف بہاؤالحق ذکریا ملتانی کے فیض یافتہ اور حضرت صدرالدین عارفؒ کے ممتاز خلیفہ تھے۔ آپ کی خانقاہ اوچ میں مخدوم سید جلال سرخ بخاری کی خانقاہ سے نسبتاً قدیم ہے۔ حضرت شیخ جمال الدین خنداں رو علم و فضل میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ آپ کے شاگردان رشید میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

جیسے جلیل القدر بزرگوں کا نام ملتا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں کے والد گرامی حضرت سید مخدوم کبیرالدین احمد بھی کچھ عرصہ آپ کے زیر تربیت رہے تھے۔

حضرت مخدوم شیخ جمال الدین خنداں رو با ایں ہمہ علم و فضل بہت کم لوگوں کو اپنا مرید بناتے تھے۔ آپ کے خلفاء صرف دو تھے۔ ایک غیاث الدین تغلق جو اپنی خوش اعتقادی کی بدولت بعد میں ایک معمولی عہدہ سے اٹھ کر ہندوستان کا بادشاہ بنا اور دوسرے شیخ فہیم الدین تھے۔

شیخ فہیم الدین سلسلہ جمالیہ سہروردیہ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور انہی کے وجود کی برکت سے اوچ کی خانقاہ جمالیہ کو فروغ نصیب ہوا۔

شاہ جمال لاہوریؒ

حضرت شیخ فہیم الدینؒ کے وابستگان سلسلہ میں ایک بزرگ حضرت شاہ جمالؒ کا نام ملتا ہے۔ حضرت شاہ جمال لاہوری اور حضرت شیخ فہیم الدین کے درمیان پانچ واسطے ہیں۔ شیخ فہیم الدین کے خلیفہ شیخ خفیف الدینؒ تھے ان سے شاہ معروف نے فیض پایا۔ شاہ معروف سے خلافت شاہ شرف کو ملی شاہ شرف کے خلیفہ مجاز گرا بیگ تھے اور گرا بیگ کے مرید خاص حضرت شاہ جمال لاہوریؒ تھے۔ خزینۃ الاصفیاء میں مفتی غلام سرور لاہوری نے لکھا ہے۔

> "شاہ جمال سہروردی شیخ بود۔ جامع کمالات ظاہری و باطنی و جمال صوری و معنوی مظہر جلال و مصدر کمال مرید شیخ گرا بود و سلسلہ عالیہ وے بہ چند واسطہ بہ شیخ الاسلام صدر الدین عارف می رسد و حضرت وے از سادات کرام حسینی بود کہ تا حال اولاد و امجاد وے در سیالکوٹ سکونت می دارد۔"

حضرت جمال سہروردی ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع اور صوری و معنوی خوب صورتی کے حامل تھے طبیعت میں جلال تھا اور صاحب کمال بزرگ

تھے۔ شیخ گرا کے مرید تھے۔ آپ کا سلسلہ عالیہ چند واسطوں سے حضرت شیخ الاسلام صدر الدین عارف تک پہنچتا ہے۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے۔ آپ کی اولاد سیالکوٹ میں اب بھی موجود ہے۔ حضرت شاہ جمال کا وصال ۴۔ ربیع الثانی ۱۰۴۹ھ کو ہوا۔ بارش کے سبب گھر کی چھت کے نیچے دب کر آپ کی موت واقع ہوئی اور وہی کمرہ ان کا مزار بنا[1] مزار مبارک اچھرہ (لاہور) کے قریب واقع ہے۔

حضرت شاہ جمال کے برادر بزرگ مولانا کمال کاشمیری بھی اپنے وقت کے بہت بڑے علامہ تھے۔ ان کی جلالت شان کے لئے یہی بات کفایت کرتی ہے کہ ان کے تلامذہ گرامی میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، عبدالحکیم سیالکوٹی اور نواب سعداللہ خاں چنیوٹی جیسے جلیل القدر لوگ شامل تھے[2] شاہ کمال کا مقبرہ اچھرہ کے قریب ایک بستی راواں میں واقع ہے۔ شیخ جمال کے خلفاء میں شیخ حسن گنج گر[3] تھے ان کا مزار بھی لاہور میں ہے۔

---

[1] حضرت شاہ جمال خنداں رو کی موت کا سبب بھی یہی ہوا کہ مدرسہ کی چھت منہدم ہو گئی اور اس کے نیچے دب کر آپ انتقال فرما گئے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے۔

[2] مرآۃ المناقب۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ ص ۹۹

[3] شیخ حسن گنج گر شیخ حسو تیلی کے نام سے عوام میں مشہور ہیں۔

باب ہفتم

اوچ کے آثارِ قدیمہ

اوچ کے آثار قدیمہ کی نوعیت دو گونہ ہے۔ آثار قدیمہ کی ایک قسم تو وہ شکستہ دیواریں ہیں جو دریائے گھارا کی قدیم گذرگاہ کے اندر کھڑے ہو کر شمال کی طرف دیکھنے سے تہہ بہ تہہ نظر آتی ہیں ان کی عمر کا تعین کرنے سے اوچ کی تاریخ کے بہت سے اسرار درون پردہ کی نقاب کشائی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اوچ کے وہ ٹیلے بھی جن کی کھدائی سے تاریخ کی شکستہ کڑیوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ٹیلوں پر قبروں کی ڈھیریاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں جن میں بیشتر مزارات بڑے بڑے اہل اللہ اور اصحاب طریقت کے ہیں اس لئے ان کی کھدائی بڑا مشکل مسئلہ ہے اور اس سے ایک مذہبی تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے تاہم فنِ تاریخ کے حتمی تقاضے یہی ہیں کہ ان ٹیلوں کی چھان بین کی جائے اور اس کے مختلف طبقات کا جائزہ لے کر ان کے مدفون خزینوں کا پتہ چلایا جائے۔ اوچ میں اس قسم کے ٹیلے کافی تعداد میں ہیں اور دعویٰ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان میں سے ہر تودۂ خاک و خشت اپنے اندر عروج و زوال کی ہزاروں داستانیں سمیٹے ہوئے ہے سب سے بڑا ٹیلہ حضرت سید جلال سرخ بخاری کے مزار کے قرب و جوار میں واقع ہے اور قبروں

سے ڈھکا ہوا ہے۔

حضرت سید صفی الدین گازرونی کے مزار سے متصل بھی اونچائی کے مقامات ڈھیریوں کی شکل میں موجود ہیں اوچ گیلانی میں بھی زمین کی سطح نسبتاً بلند ہے۔

اوچ سے ملحقہ آبادیاں جو کسی زمانہ میں اوچ ہی کے مرکزی شہر کے حصے تھے یا اس دور دور تک پھیلے ہوئے شہر کی ذیلی آبادیاں تھیں ان میں بھی اس قسم کے ٹیلے پائے جاتے ہیں۔

اوچ کی ہم عصر بستیاں بھی جو دریائے گھارا کے کنارے آباد ہیں آثار قدیمہ کے ماہروں کو دعوت فکر و نظر دے رہی ہیں ان میں بھی اس قسم کے ٹیلے بہ کثرت موجود ہیں جو کھدائی کے بعد اپنے سینہ کے تمام رازوں کو اُگل سکتے ہیں۔

یہ بات محض قیاس اور اندازے سے نہیں کہی جا رہی کہ یہ علاقہ پرانے تاریخی آثار سے اٹا پڑا ہے بلکہ اس کے دستاویزی ثبوت بھی موجود ہیں۔ مولوی حفیظ الرحمان مرحوم نے اس علاقہ سے یوچی خاندان کے مشہور راجہ کنشکا کے عہد کے سکوں کی دستیابی کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"گزشتہ سے پیوستہ سال (یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی ہے اس حساب سے یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کا ہوا) راقم کے والد ماجد مولوی حاجی محمد عزیزالرحمان صاحب کو جو' جدید انہار (ستلج والی پراجیکٹ) کے سپیشل جوڈیشل افسر کی حیثیت سے قائم پور کے قریب مقیم تھے۔ نہر بہاول کنال کے کنارے کئی ایک سکے ملے تھے جو سونے اور چاندی کے مخلوط بنے ہوئے تھے۔ ان سکوں کی نسبت سرکار دولت مدار بہاولپور نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ سکے راجہ کنشکا کے عہد کے ہیں جن کو اب قریباً دو ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے"۔ (تاریخ اوچ صفحہ ۴۰)۔ یہ سکے نواب صاحب بہاولپور کے ذاتی میوزیم میں آج بھی محفوظ ہیں اور انہیں وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

اوچ کے آثار قدیمہ میں دو عمارتیں ایسی ہیں جنہیں زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں مندر کی عمارتیں ہیں جن میں ایک گوپی ناتھ جی کا ہے اور دوسرا لکشر پال جی کا۔

یہاں ایک ایسے تالاب کا ذکر بھی تاریخی تذکروں میں ملتا ہے جسے کسی رانی نے کھدوایا تھا اور جس کی شکستہ عمارت کی از سرِ نو تعمیر راجہ چچ برہمن کے عہد میں ہوئی تھی غالباً اس تالاب کا محل وقوع سید صفی الدین گازرونی کے مزار کے قرب وجوار میں تھا۔ اس کے علاوہ زمین میں دھنسی ہوئی بعض بوسیدہ دیواروں کا سراغ بھی ملتا ہے اور حضرت سید جلال سرخ بخاری کے مزار کے قریب چاروں طرف دور تک اس کے نشانات نظر آتے ہیں۔ یہ غالباً کسی پرانے قلعہ کی شکستہ فصیل ہے۔ یہ قلعہ دریائے گھاگھرا کے کنارے واقع تھا۔ قدیم آریائی عہد کے قلعوں میں یہ بات ہر جگہ دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ عموماً دریاؤں کے کنارے تعمیر کئے گئے ہیں جیسے اوچ کی ہمعصر بستی اجمیر کا قلعہ دریائے گھاگھرا کے کنارے بنایا گیا۔ اسی طرح دہلی کا پانچ ہزار سالہ پرانا قلعہ اور لال قلعہ، یہ دونوں بھی دریاؤں کے عین کناروں پر آباد تھے۔ کم و بیش تمام مورخوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اوچ کسی بہت پرانے شہر کے کھنڈروں پر جو ٹیلوں میں آباد ہو گئے تھے۔ آباد ہوا، بار بار بسا اور کئی بار اجڑا۔[1]

اس کے بناؤ اور بگاڑ میں غیر ملکی اور ملکی فاتحین کے علاوہ دریائے گھاگھرا

---

[1] چارلس میسن یورپین سیاح نے لکھا ہے کہ "یہ مقام اپنے قدیم کھنڈرات کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا جو بہت وسیع ہے۔ ڈبلوڈراس نے اپنی کتاب " دی لینڈ آف فائیو ریورس اینڈ سندھ" میں لکھا ہے کہ پرانے شہر کے کھنڈرات کے ٹیلوں پر اوچ کا شہر آباد ہوا ہے۔" مخزن پنجاب میں مفتی غلام سرور صاحب قریشی نے لکھا ہے کہ

"یہ آبادیاں اونچے ٹیلے کے اوپر ہیں جو پہلے کھنڈرات سے بنے ہیں۔"

کی ترکتازیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

جب کبھی دریا کی آنکھ بھر آئی تو سیلاب نے اس تاریخی بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ ابھی یہ دریا کی تھپڑیوں سے پوری طرح سنبھلنے نہ پایا تھا کہ کسی فاتح حکمران کی نگاہ ہوس خیز کو اس نے تاکا اور وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت اس پر چڑھ دوڑا اور اس طرح شہر سمٹتا چلا گیا اور ٹیلے اونچے ہوتے گئے اور کھنڈرات کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

"ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کا اطلاق اس بستی پر بھی ہوا۔ ہر نئے آنے والے نے ٹیلوں اور کھنڈروں میں جان کھپانے اور وقت ضائع کرنے کی بجائے نئی نئی عمارتوں کی طرح ڈالی اور پرانی عمارتوں کے ڈھیر پہ نئی نئی عمارتیں کھڑی کر دیں۔ عمارتوں سے جو ٹیلے بچے وہاں ایک شہر خموشاں آباد ہوتا چلا گیا۔

آثار قدیمہ کی دوسری قسم وہ ہے جو تاریخ کے روشن عہد سے تعلق رکھتی ہے لیکن اوچ کے سیاسی زوال نے ان عمارتوں کے تمام نقش و نگار مٹا دیئے اور پھر گردش زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے ان کا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا اور حادثات وقت کے تھپیڑوں نے ان آثار کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ آج اوچ میں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ قلعہ ہے مگر دیواروں سے محروم، دیواریں ہیں مگر بام و در کا کہیں ڈھونڈنے سے بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس بستی کا بھی وہی حشر ہوا جو غالبؔ کے خانۂ ویران کا تھا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہاں مگر ایک چیز جو اس خراب آباد اوچ کی ساری شکستگیوں اور ویرانیوں کی تلافی کرتی ہے۔ وہ یہاں ان نفوسِ قدسیہ کا قیام ہے کہ جب دنیا اپنی تمامتر رعنائیوں اور رنگینیوں کے باوجود ان کے لئے ایک ویرانہ بنی تو

رحمت حق کی بہانہ جوئیوں نے بڑھ کر ان کے دلوں پر دستک دی اور پھر جب ان کے دلوں کی دنیا آباد ہوئی تو نہ جانے کتنی ہی بستیاں ان حضرات کے دم قدم سے آباد ہو گئیں۔ اس برصغیر کے بے شمار شہر اور لاتعداد بستیاں اوچ کی اس تباہ حال بستی کی رہینِ منت ہیں کہ اگر ان شہروں کو اس ویرانہ سے نسبت نہ ہوتی تو آج کوئی ان کا نام آشنا بھی نہ ہوتا بلکہ ان میں بہت سے شہر تو شاید معرضِ وجود ہی میں نہ آتے۔[1]

جدھر نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آجتک
وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گزر گیا

اسلامی عہد کے آثارِ قدیمہ میں سب سے قدیم خانقاہ حضرت سید صفی الدین گاذرونیؒ کی ہے جو اوچ بخاری کے محلہ خوجہ میں واقع ہے۔ اس خانقاہ سے ملحق ایک مسجد بھی ہے جو اوچ کی قدیم العہد مساجد میں سے ہے۔ سید صفی الدین گاذرونیؒ چوتھی صدی ہجری کے نامور صوفی بزرگ تھے۔ اس خانقاہ کی تعمیر نو مرمت اوچ گیلانی کے مدارالمہام میاں شاہ محمد نے کرائی اور اس پر کتبہ وغیرہ بنایا۔

اوچ کی مسجد حاجات بھی برصغیر کی قدیم ترین مساجد میں سے ہے۔ یہ مسجد غالباً محمد بن قاسم کے عہدِ فتوحات کی یادگار ہے اور یہاں کئی تابعین اور تبع تابعین کے نقوشِ پا ثبت ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسجد کی زیارت

---

[1] اوچ کے روحانی تصرفات کا ایک نمونہ ہندوستان کا مشہور شہر احمد آباد ہے جس کی بنیاد احمد شاہ اول نے رکھی۔ احمد شاہ کا دادا سلطان مظفر خاں جو سلطان گجرات کا بانی تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مریدین میں سے تھا اور آپ ہی کے ہاتھ پر شرف اسلام سے مشرف ہوا تھا۔ احمد آباد کی آبادی اور سرسبزی کے لئے خاص طور پر سلطان احمد شاہ نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے پوتے قطب العالم حضرت برہان الدین نور اللہ مرقدہٗ سے دعا کروائی۔ اس شہر کا سنگ بنیاد بھی انہوں نے رکھا۔ خاندیس کا مشہور شہر اور بہمنی سلطنت کا دارالحکومت برہان پور بھی اوچ کے خانوادۂ بخاریہ کی نظرعنایت کا آباد کردہ ہے۔

اور اس میں عبادت کی بجا آوری بڑے بڑے اولیا اور اقطاب نے دور دراز علاقوں سے آ کر کی ہے۔ خانزادہ چشتیہ کے گل سرسبد حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمۃ نے اس مسجد میں چلہ کشی کی اور اسے اعتکاف کے لئے منتخب فرمایا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس مسجد سے ملحقہ کنوئیں میں نماز معکوس ادا فرمائی تھی۔ حضرت خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلی کی بابت مشہور ہے کہ وہ بھی اس مسجد میں معتکف رہے

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بھی اسی مسجد میں عبادت و ریاضت فرماتے رہے۔ آپ کا قیام بھی اسی مسجد ہی کے حجروں میں تھا۔ حضرت مخدوم کا مزار بھی اس مسجد کے پہلو میں جانب جنوب واقع ہے۔

جس زمانہ میں اوچ ہندوستان کی ایک اہم دریائی بندرگاہ تھی۔ یہاں سے دریائے سندھ کے راستے حجاج کے قافلے آتے جاتے رہتے تھے تو یہ مسجد مسجد حجاج کے نام سے مشہور ہو گئی اور رفتہ رفتہ مسجد حجاج کی بجائے غلط العام کا شکار ہو کر مسجد حاجات کے نام سے موسوم ہوئی اور اب یہی نام معروف ہے۔ حضرت سید جلال سرخ بخاری کی خانقاہ بھی سادگی و پرکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ سید جلال سرخ بخاریؒ کا مقبرہ پہلے پہل 'چناب رسول پورہ' میں تعمیر ہوا تھا۔ مگر دریا کی طغیانی سے اس عمارت کو صدمہ پہنچا۔ یہاں سے آپ کے جسد مبارک کو "سونک بیلہ" کے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ دریا نے اس جگہ کو بھی متاثر کیا تو آپ کو آپ کے پوتے سید صدرالدین راجو قتال کی خانقاہ میں عارضی طور پر دفن کر دیا گیا۔ ۱۰۲۶ھ میں مخدوم حامد نوبہار اول نے آپ کا مزار موجودہ جگہ پر بنایا۔ ۱۲۶۱ھ میں بہاولپور کے فرمانروا نواب محمد بہاول خاں عباسی ثانی نے یہاں ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔ یہیں آپ کے فرزند حضرت سید احمد کبیرؒ کا مزار بھی ہے۔

اوچ بخاری کے شمال میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ان کے چھوٹے بھائی اور خلیفہ حضرت مخدوم سید صدرالدین راجن قتال کے مزارات دو علیحدہ علیحدہ مقبروں میں واقع ہیں۔ دونوں عمارتوں پر ملتانی کاشی کا بڑا نفیس کام ہوا ہے۔

دیدہ زیبی، عمدگی، نفاست اور خوب صورتی کے اعتبار سے بی بی جیوندیؒ اور بہاول حلیمؒ کے مقبرے خاص طور پر قابل دید ہیں اور ساتھ ہی عبرت کا نمونہ بھی، دریائے گھارا کی شوخ لہروں نے ان دونوں مزاروں کا نصف حصہ مسمار کر دیا ہے اور باقی نصف اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہے۔ حضرت مخدوم ناصرالدین محمود بن مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی اہلیہ محترمہ بی بی تگنی جو سلطان حسین لنگاہ والی ملتان کی لڑکی تھیں۔ ان کا مزار بھی شکستہ حالت میں حضرت مخدوم راجن قتال کی خانقاہ کی غربی جانب اوچ کے شمالی حصہ میں واقع ہے صرف عورتوں کو اندر جانے کی اجازت ہے۔ بی بی تگنی کے مزار سے متصل حضرت سید فضل اللہ کا مزار ہے جو حضرت مخدوم ناصرالدین محمود کے فرزند گرامی تھے۔ یہ محلہ دیوان صاحباں کے نام سے مشہور ہے۔

اوچ گیلانی میں حضرت سید محمد غوث علیہ الرحمۃ کا مزار بھی خوب صورتی اور دلکشی کے اعتبار سے ملتانی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ پہلے یہ عمارت گنبد والی تھی مگر بعد میں اسے ضرورتاً وسیع کرنے کے لئے مسطح و مسقف بنا دیا گیا۔ اس مقبرہ میں اپنے والد

لہ بی بی جیوندی کا اصل نام بی بی جند وڈی تھا جو غالباً ان کا عرف تھا۔ یہ حضرت سید جلال بن سید حمید کی دختر عالیہ تھیں جو حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کے فرزند سید بہاؤالدین کی اولاد میں سے تھے۔ بی بی جیوندی بڑی عابدہ وزاہدہ اور مستجاب الدعوات صالحہ خاتون تھیں۔ ان کا انتقال ۸۰۵ھ میں ہوا۔ مقبرہ کی عمارت ۸۰۰ھ / ۱۲۹۴ء میں خراساں کے بادشاہ محمد دلشاد نے تیار کروائی۔ ۱۲۳۳ء کی طغیانی نے اس شاندار مقبرہ کا نصف حصہ گرا دیا۔

ٹہ حضرت بہاول حلیم دراصل علامہ بہاؤالدین اچی کا عرف عام ہے۔ یہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے استاد اور بڑے قابل بزرگ تھے ان کا مزار بھی ۱۲۳۳ء کی طغیانی کی نذر ہوگیا۔ اس مقبرہ کی عمارت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے زمانہ میں تیار ہوئی۔ ملتانی کاشی کا باقاعدہ کام ہوا ہے۔ ان عمارتوں میں ٹھٹھہ کے فن تعمیر کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے جہاں حضرت مخدوم اپنی شیخ الاسلامی کے زمانہ میں قیام پذیر رہے تھے۔

ماجد کے پہلو میں سید عبدالقادر ثانی بھی مدفون ہیں اس کے علاوہ قطب الدین لنگاہ والی ملتان و اوچ کا مزار بھی اسی عمارت کے اندر واقع ہے۔

جس زمانہ میں اوچ گیلانی کے سجادہ نشینوں اور والیان ریاست کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہوا تو مخدوم سید فضل علی نے جو مخدوم حامد گنج بخش ثالث کے لقب سے معروف ہیں۔ سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑہ کی امداد و اعانت سے یہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ تو شکست و ریخت ہو گیا مگر اس کا ایک دروازہ آج بھی بے ثباتی دنیا کا نوحہ خواں ہے۔ اسے ہاتھی دروازہ کہا جاتا ہے اور اس پر ذیل کا قطعہ ثبت ہے۔

در زمان جانشین غوث اعظم گنج بخشؒ — رخ نمودہ قلعۂ دارالامان قادری!

ہاتفم دربارہ بدخواہ آں تاریخ گفت — از یزید آمد عدوِ خاندان قادری

اوچ گیلانی کے مشرقی جانب حضرت سید کبیرالدین حسن دریا کا روضہ بھی بڑا خوب صورت بنا ہوا ہے۔ اس کا گنبد دور دور سے نظر آتا ہے۔ اوچ بخاری اور اوچ گیلانی کے علاوہ اوچ جمالی میں بھی کئی آثار شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ اوچ جمالی اوچ موغلہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں حضرت شیخ جمال خنداں رو اور ان کے فرزند گرامی حضرت رضی الدین گنج علم کا مزار واقع ہے۔ اس مزار سے متصل ایک قدیم شہر کے کھنڈرات موجود ہیں جو خانقاہ جمالیہ کے دور عروج کی بچی کھچی یادگاریں ہیں۔

قبریں اگر آثار قدیمہ میں شامل ہیں تو ایسی بے شمار قبریں یہاں موجود ہیں، جہاں بڑے بڑے اصحاب طریقت و معرفت آسودہ خواب ہیں۔ ان میں گامن سچار کی قبر ہے جو اپنی سچائی اور راست بازی کی وجہ سے سچار کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہاں شیخ صالح محمد کا مزار ہے جو حضرت سید جلال سرخ بخاری کے خلفاء میں سے تھے اور اپنی صلح کل طبیعت کی وجہ سے پیر میان کے نام سے معروف ہوئے۔ یہاں بعض مجاذیب کے تکیے بھی ہیں جو کافی کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ ان کافیوں میں کافی جہانگیر سرمست خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جہاں گیر سرمست

حضرت جلال سرخ بخاری کے آستانہ عالیہ سے منسلک تھے۔ یہ تکیہ حضرت سید جلال سرخ بخاری کے مزار کے مشرق میں واقع ہے۔ آستانہ بخاریہ کے سجادہ نشینوں کے پاس مشہور سکھ رہنما باباگرونانک کی کھڑاؤں موجود ہیں پہلے یہ کھڑاؤں اسی تکیہ پر رکھی رہتی تھیں مگر اب انہیں دیگر تبرکات کے ساتھ ساتھ مخدوم صاحب سجادہ بخاری نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

جہاں گیر سرمست کے مزار کے قریب برگد کے پیڑ ہیں۔ یہ پیڑ قدامت کے اعتبار سے واقعی قابل دید ہیں۔ ان کی قدامت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی شاخیں زمین بوس ہو کر خود مستقل تنوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں یہ شاخیں کافی موٹی ہیں اور اصل درختوں کے تنوں کی موٹائی اور ان کی ضخامت میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ برگد کے ان پیڑوں کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہاں ایک شیر آستانہ سید جلال بخاری پر سلامی دینے کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا اور رات بسر کر کے صبحدم واپس لوٹ جاتا تھا۔ اب یہاں ایک کمرہ اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے تعمیر کر دیا گیا ہے۔ برگد کے درخت کو اکثر و بیشتر ہندوستانی مذاہب، ہندومت، بدھ مت اور جین مت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مہاتما بدھ کو اسی پیڑ کے نیچے گیان حاصل ہوا۔ برگد کا وہ پیڑ آج بھی ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک مشہور شہر گیا سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر بدھ گیا میں قائم ہے۔ اوچ کے برگد کے یہ پیڑ بھی نہ جانے کتنی صدیوں کی داستانیں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ساکت و صامت کھڑے ہیں۔ ان پیڑوں نے یہاں حضرت سید جلال سرخ بخاری اور ان کے رفقاء کے قدموں کی چاپ بھی سنی ہے اور محمد بن ناصر محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، ناصر الدین قباچہ، شمس الدین التمش اور ایسے ہی بے شمار سپہ سالاروں اور حکمرانوں کے جاہ و جلال کا منظر بھی دیکھا ہے۔ ان پیڑوں کی جھکی ہوئی اور پیوند زمین شاخوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلام کے ان اولوالعزم مجاہدین کے نقوشِ پا کو جھک کر سلام کر رہے ہیں جنہوں نے ہندوستان

کی تیرہ و تار فضا میں اسلام کی روشن تعلیمات کا اجالا بکھیرا اور اپنی روحانی قوتوں اور جسمانی طاقت کے مظاہروں سے اس برصغیر کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ برگد کے یہ پیڑ اوچ کی تاریخ کے بے شمار صفحات اور اس کے عروج و زوال کے لاتعداد قصوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے مہر بلب، گوش بر آواز اور چشم براہ ہیں کہ پھر یہاں سے سید صفی الدین گازرونی سید جلال سرخ بخاری، شیخ جمال خنداں رو، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور سید محمد غوث گیلانی کی مسحور کن آواز سنائی دے یا اس پایہ کی کسی ایسی شخصیت کا دیدار نصیب ہو جن کی نظیر کم از کم اس خطہ ارضی پر چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

اوچ کے تبرکات اور مخطوطات

اوچ کو جہاں اپنی قدامت پر ناز ہے وہاں یہ خصوصیت بھی اسے حاصل ہے کہ یہاں بعض ایسے تبرکات اور نوادر آج بھی موجود ہیں جو قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کے ساتھ اس بستی کا خصوصی تعلق ظاہر کرتے ہیں۔

خانوادہ بخاریہ میں حسب ذیل تبرکات اوچ کی عظمت اور اس کی روحانیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔

۱۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دستار مبارک۔

۲۔ پنجتن پاک کی چادر

۳۔ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہ کی ردائے مبارک۔

۴۔ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی تلواریں جن کا نام بالترتیب صمصام اور قمقام ہے۔

۵۔ حضرت سلمان فارسیؓ کی چادر

۶۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا رومال۔

۷۔ تسبیح، ٹوپی اور قینچی جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف منسوب ہیں

۸۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا قرآن مجید

خط غبار ہیں۔ ترجمہ فارسی میں ہے اور حاشیہ پر فوائد اور شان نزول آیات درج ہیں۔

۹۔ بیراگن جس کا دستہ عقیق سپید کا ہے، بہت خوبصورت ہے، یہ مراقبہ و عبادت کے دوران سہارے کے طور پر استعمال میں آتی ہے۔

۱۰۔ عقیق زرد کا کنٹھا

۱۱۔ سید فضل اللہ شاہ بخاری کا جُبّہ۔

۱۲۔ خانہ کعبہ کا غلاف۔

۱۳۔ حضورؐ کے روضۂ اقدس کا غلاف مبارک۔

اوچ بخاری کے ان تبرکات کے علاوہ اوچ گیلانی میں بھی اسی قبیل کے بعض تبرکات موجود ہیں جن میں حضرت اویس قرنی کا ایک دانت۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا جبۂ مبارک جس کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ وہی جبّہ ہے جو ڈاکوؤں نے آپ سے چھینا تھا اور پھر آپ کے سچ بولنے کی وجہ سے وہ سب ڈاکہ زنی سے تائب ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی دستار مبارک بھی سادات گیلانیہ اوچ کے پاس بطور تبرک موجود ہے۔

ان نادر و نایاب تبرکات کے علاوہ دونوں خانوادوں کے ہاں بعض ایسی قلمی کتابیں اور بزرگان سلسلہ کے بعض ایسے نادر نوشتے بھی موجود ہیں جو بڑا اہم علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی سرمایہ ہیں۔ سادات بخاریہ کے کتب خانہ میں کتابیں محدود ہیں۔ اور جو ہیں وہ اپنے وارثوں کی قدر ناشناسی کی شکوہ سنج ہیں۔

البتہ گیلانیوں کی لائبریری میں کتابوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے اور وہ نسبتاً بہتر حالت اور مرتب شکل و صورت میں موجود ہیں۔

سجادگان بخاری کی تحویل میں جو کتابیں ہیں وہ زیادہ تر حضرت مخدوم جہاں جہانگشتؒ کے ملفوظات آپ کے ارشادات و فرامین اور آپ کے مکتوبات پر مشتمل ہیں۔ یہ

مجموعے بڑی قدر و اہمیت کے حامل ہیں۔ ان نادر و نایاب مخطوطات میں خزانۂ جلالی، جامع العلوم، جواہر جلالی، مظہر جلالی اور شاہان وقت کے فرامین و توقیعات شامل ہیں۔

خزانۂ جلالی

اس مخطوطہ کا اصل نام "خزانۃ الفوائد الجلالیہ" ہے۔ اس کتاب کے مرتب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مرید احمد بہا ابن حسن بن محمود بن سلیمان قلبنی ہیں۔
کتاب شروع اس عبارت سے ہوتی ہے۔

"حمد بے حد و ثنائے بے عد مر صانع موجودات را و خالق مخلوقات جلّ جلالہٗ و عم نوالہٗ کہ بگردانید علماءٗ را ہم چوں ستارگان کہ بسبب ایشاں راہِ راست یا بند گمراہاں و تحفہ تحیات بر سید کائنات محمّد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم و بر صحابہ کبار و مشائخ بزرگوار کہ مقتدایان اہل دین و ہادیان راہ یقین اند رضوان اللہ تعالٰی علیہم اجمعین"
کتاب کا اختتام اس شعر پر کیا گیا ہے۔

از سخن چوں سخن شود حاصل
کارکن کار لب بدنداں گیر

(یہ مخطوطہ ۱۴۔ ربیع الاول ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء کو تکمیل پذیر ہوا۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے۔)

جامع العلوم

اس کتاب کے مرتب و جامع حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ایک مرید ابو عبداللہ سید علاؤالدین علی بن سعد بن اشرف دہلوی ہیں۔ آپ ۷۷۷ھ / ۱۳۷۵ء میں حضرت مخدوم کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔
یہ کتاب حضرت مخدوم کے ملفوظات کا بڑا انمول ذخیرہ ہے۔ سید علاؤالدین علی بن سعد حسینی نے یہ ملفوظات حضرت مخدوم کے زمانۂ قیام دہلی کے دوران مرتب

گئے۔ حضرت مخدوم ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں دہلی تشریف لے گئے اور سلطان فیروز تغلق کے مہمان ہوئے۔ سید علاؤالدین نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور حضرت والا کے بیش بہا ملفوظات کو ۲۸ ربیع الآخر ۷۸۱ھ / ۱۳۸۰ء سے ۱۷ محرم ۷۸۲ھ / ۱۳۸۰ء کے تمام دنوں میں بالالتزام جمع فرماتے رہے۔

جامع العلوم کا اردو ترجمہ الدرالمنظوم کے نام سے ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہو چکا ہے اور تقریباً نایاب ہے۔ سید علاؤالدین علی بن سعد حسینی نے جامع العلوم فارسی زبان میں مرتب کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"از استقبال ششم ربیع الآخر روز یک شنبہ تا غایت ہفدہم ماہ محرم روز سہ شنبہ سنۃ اثنی و ثمانین و سبع مائۃ شرف ملازمت صحبت مخدوم جہانیاں جہاں حاصل شد۔ الحمدُ للہ علیٰ ذالک۔"

اپنے مرید ہونے کا واقعہ بھی کتاب میں درج فرمایا ہے۔ "بدانکہ مخدوم جہانیاں سید السادات سلمہ اللہ تعالیٰ بکرم جل و علا در شہر معظم دہلی ازاحج مبارکہ برسیدند اول کرت سنہ سبع وسبعین و سبع مائتہ بود از باعثہ ازلی حق تعالیٰ در دل ایں فقیر واقع شد و سلسلہ واسطہ درجنبش آمد ہم در سال مذکور روز عاشورا بعد ادائے نماز پیشین ایں فقیر و مولانا بدرالدین درسلک بندگان مخدوم منسلک شدیم۔"

حضرت مخدوم کے ملفوظات کی ترتیب اس نہج پر ہے۔

"فرمودند از دیوانہ ایں دو بیت سماع دارم

شرم نداری کہ گنہ میکنی   نامۂ خود را چہ سیہ مے کنی
سگ نہ کند با سگ بیگانگاں   آنچہ تو با حضرت شہ می کنی

و حاضراں را فرمودند بنویسید و یاد گیرید۔ بہ چند کرت تکرار کردند، شاہزادہ ظفر خاں بخدمت حاضر بود او نیز نبشت و ایں فقیر در دل نبشت۔"

جواہر جلالی

ملفوظات کا یہ مجموعہ ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں مرتب ہوا ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات و ارشادات کا ایک ضخیم مجموعہ ہے جس کے مرتب و مولف فضل الدین فضل اللہ بن ضیا عباسی ہیں۔ کتاب کا آغاز عربی کے خطبہ مسنونہ کے بعد حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے۔

"ایں خزینہ جواہر جلالیہ مشتمل بر اذکار و اوراد بعضے از مشغولی حضرت عالیہ شیخی و استاذی و مرشدی و ملاذی سلالۃ النبویہ خلاصۃ المصطفویہ معدن انوار التحقیق ـ مخزن اسرار التحقیق بحر العلوم بالحقائق مستخرج الحکم بالدقائق محی مراسم الخیرات جامع جوامع الکلمات مطبوع المحققین قطب الاقطاب الاولیاء العارفین مرشد طوائف الاتقیاء والواصلین وارث علوم معشر الانبیاء والمرسلین ناظم امور المومنین سلطان المشائخ المخصوصین بعون اللہ الخالق الباری شیخ جلال الحق و الشرع و الدین حسن بن احمد بن حسین الحسینی البخاری مداللہ ظلہ و ادام اللہ جلالہ و اوصل الینا فتوحہ و افضالہ و شامل اوراد شیوخ سلف اعلی اللہ اقدارہم فی الجنان و تغمدہم بالرحمۃ والرضوان بحکم فرمان واجب الاطاعۃ آں مرشد محققان و غوث عارفان۔"

نظم

شیخ جہاں قطب حقیقت جلال — یافتہ از نور تجلی جمال
زیر فلک قطب جہاں غوث وقت — قطب دو کونین یگانہ جلال
کامل در علم اصول و فروع — بہرش از علم لدنی بجمال
راہ رو کوئے طریق صفا — صورت و سیرت نبوی خوشخصال

مظہر جلالی

یہ کتاب بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اول و آخر سے ناتمام ہے اس لئے مرتب و جامع کا پتہ نہیں چلتا۔

ان تمام کتابوں کا موضوع عموماً مذہبی مسائل ہیں جیسا کہ ان کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے البتہ کہیں کہیں واقعات کے ضمن میں بعض تاریخی امور پر بھی روشنی پڑتی ہے اور بعض بزرگوں کے سوانحی خاکے بھی ملتے ہیں۔ یوں تو حضرت مخدوم

جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات آپ کے مکتوبات اور آپ کے ارشادات کے بہت سے مجموعے ہیں لیکن خود حضرت مخدوم کے اپنے گھر میں صرف یہی چار کتابیں دستیاب ہیں۔

اوچ کے خلیفہؔ[1] خاندان کے پاس بھی بعض مخطوطات ہیں لیکن ان میں کسی اناڑی شخص نے اپنی چابک دستی کا بھونڈا مظاہرہ کر کے ان کی ساری اہمیت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ایک کتاب جو مخدوم سید ناصرالدین محمود کی طرف فرضی طور پر منسوب کی گئی ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے گزری ہے۔ اس میں جو جعلسازی کی گئی ہے وہ صاف نظر آجاتی ہے۔ غالباً کسی احمق نے اس میں یہ تحریف اس غرض سے کی تھی کہ اس کی قدر و قیمت میں اس سے اضافہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ وہ اپنی واجبی حیثیت سے بھی محروم ہو گئی۔

سادات گیلانیہ اوچ کی لائبریری میں قلمی کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے ان میں بعض بالکل نادر و نایاب کتابیں ہیں۔

گیلانی لائبریری کے مجموعہ مخطوطات کی ایک فہرست ریاست کے دور میں امیر بہاولپور نے مرتب کرائی تھی اور اس کام کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر غلام سرور کی خدمات حاصل کی تھیں۔ انہوں نے بڑی جانفشانی اور تحقیق و تدقیق سے ایک کتاب تیار کی۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور اسے اردو اکیڈمی بہاول پور نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، کتاب کا نام ہے۔

یعنی "مخطوطات گیلانی لائبریری اوچ Manuscripts Gilani Library of Uch

اوچ گیلانی کی نادر و نایاب مخطوطات میں بعض قدیم فارسی شعراٗ دواوین بھی

---

[1] خلیفہ خاندان اوچ کا قدیم خاندان ہے۔ یہ غالباً خانزادہ بخاریہ کے کسی ایسے خلیفہ کی اولاد ہے جو مخادیم بخاری کی جائداد وغیرہ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

موجود ہیں ان میں ہلالی استر آبادی کا قلمی دیوان، مولانا جامی کی مثنوی سلسلۃ الذہب لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا، شمس الدین بن حسام الدین جو ابن حسام کے نام سے مشہور ہیں۔ کا خاور نامہ، دور اکبری کے مشہور شاعر عرفی شیرازی کی کلیات جس میں مثنوی مجمع الابکار، قصائد، مقطعات اور غزلیات کے علاوہ نثریں، ایک رسالہ نفسیہ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ غنی کاشمیری کا دیوان، ناصر علی سرہندی، شوکت بخاری، صائب اصفہانی، مرزا عبدالقادر بیدل، نورالعین واقف بٹالوی اور دوسرے بہت سے معروف اور غیر معروف شعرا کا شعری اثاثہ اور ان کے دواوین اور اشعار کا ایک بہت بڑا حصہ موجود ہے

علمی نوادر کا ایک جائزہ

اوچ کے بیش بہا نوادر میں گیلانی خاندان کی لائبریری خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان میں بعض ایسے مخطوطات بھی ہیں جن کا صرف ایک ہی نسخہ دنیا بھر میں موجود ہے علمی اور تاریخی اہمیت کے اس قومی ورثہ کی دیکھ بھال اور حفاظت اگرچہ بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہونی چاہئے۔ اور اس قسم کے سرمایہ کو کسی ایسے عجائب گھر کی زینت بننا چاہئے جہاں اہل تحقیق و نظر کی رسائی ممکن ہو تاہم یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ گیلانی خاندان بھی اس متاع قومی کی نگہداشت سے غافل نہیں ہے اور کتب خانہ کی ترتیب میں ایک سلیقہ موجود ہے۔ ریاستی دور میں نواب صاحب بہاولپور کی علمی سرپرستی میں اس کتب خانہ کی جو کیٹلاگ تیار کی گئی اس سے بھی یہ ذخیرہ بہت حد تک محفوظ ہو گیا ہے۔ اس لائبریری میں ہر قسم کی نادر و نایاب کتابیں مذہبی، دینی، ادبی، تاریخی اور دیگر علمی موضوعات پر ملتی ہیں۔ ہم ان نوادر کا تذکرہ ہر موضوع کے مطابق علیحدہ علیحدہ عنوان سے کریں گے اور صاحب کتاب نیز کتاب کی اہمیت و افادیت کا اجمالی ذکر بھی کر دیا جائے گا۔

قرآن مقدس اور فن تفسیر

اوچ گیلانی کی لائبریری میں قرآن مقدس کے کچھ اجزاء خطِ کوفی میں ہیں جن کی کھال پر لکھے ہوئے

موجود ہیں۔ اس نسخہ کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دست مبارک کا تحریر فرمودہ ہے۔ آثار قدیمہ میں قرآن مقدس کے ان مخطوطہ اجزا کی جو قدر و قیمت ہو سکتی ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

ملا حسین الواعظ کاشفی کی تفسیر حسینی کا ایک نسخہ "یاقوت رقم" کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ "یاقوت رقم" نام کی دو شخصیتیں اورنگزیب کے عہد حکمرانی میں گزری ہیں۔ ایک عبدالباقی ایرانی تھا جو شاہجہان کے آخری عہد میں ہندوستان آیا اور جسے سرکاری طور پر اس خطاب سے نوازا گیا۔ دوسرا اس کا شاگرد محمد عارف ہراتی تھا جو اس کے تمام شاگردوں میں سے سب سے زیادہ ہونہار تھا اور اس کا خطاب "یاقوت رقم خاں" تھا۔ کتاب پر صرف یاقوت رقم تحریر ہے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ اول الذکر کی فنی مہارت کا شاہکار ہے۔ اگرچہ مخطوطات گیلانی کے مرتب ڈاکٹر غلام سرور کی رائے میں اسے محمد عارف ہراتی نے قلم بند کیا ہے۔

حدیث وفقہ حدیث کے مشہور مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح کے بعض قدیم نسخوں کے علاوہ یہاں شیخ نورالحق ترک بخاری کی کتاب "تیسیر القاری" کا ایک نسخہ محفوظ ہے جو حدیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری کی شرح ہے۔ شیخ نورالحق موصوف مشہور شارح حدیث حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ فارسی کے مشہور پستہ قد شاعر رشید الدین وطواط کی ایک کتاب "صد کلمہ" کا قلمی نسخہ بھی لائبریری کی زینت ہے۔ صد کلمہ میں فاضل مولف نے حضرت امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے سو ملفوظات عالیہ کو یکجا کیا ہے۔ اس مخطوطہ کا سنِ تحریر ۹۷۸ھ ہے اور یہ سمرقند میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ سفرالسعادۃ جسے صاحب قاموس شیخ مجدالدین فیروز آبادی نے ترتیب دیا ہے اس کی شرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے قلم سے لکھی ہوئی یہاں موجود ہے اور غالباً گیارھویں صدی میں معرض تحریر میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ شیخ موصوف

کی ایک کتاب "ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین" کا ایک نایاب نسخہ بھی یہاں محفوظ ہے۔

فقہ کی ایک مشہور کتاب شرح وقایہ کا فارسی میں ترجمہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ عربی کی اس ضخیم کتاب کو فارسی جامہ پہنانے والے بزرگ عبدالحق سجاول سرہندی نام کے کوئی صاحب ہیں جنہوں نے ۱۰۷۶ھ میں اسے مکمل کیا

کسی گمنام مصنف کا لکھا ہوا ایک فقہی رسالہ "عمدۃ الاسلام" ہے جس پر کاتب کا نام فیض اللہ ساکن دارالسلطنت لاہور اور سن تحریر شنبہ ۱۹ محرم ۱۰۷۶ھ درج ہے۔

تصوف و حکمت

گیلانی لائبریری میں حضرت مخدوم علی الہجویری" (داتا گنج بخش) کی مشہور کتاب کشف المحجوب کا انتخاب موجود ہے۔ اس کے مرتب ابوسعید ہجویری ہیں جو حضرت موصوف کے تلامذہ میں سے ہیں۔ عبارت کے انداز سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی الہجویری" کی حین حیات میں ان کی اجازت سے اسے ترتیب دیا ہے۔ کتاب یہاں سے شروع ہوتی ہے

"قال السائل وھو ابوسعید الھجویری" بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوف و کیفیت مقامات ایشان"۔

ایک قلمی نسخہ کسی گمنام رسالہ کا ہے جسے شیخ محمد مبارک نے جو بابا سعید مخدومی کے نام سے معروف تھے، ترتیب دیا ہے۔ دیباچہ کتاب میں وضاحت

ؔ اوچ گیلانی کی اس لائبریری کی ابتدا حضرت سید محمد غوث اوچی" کی زندگی میں ہوئی جب انہوں نے یہاں ایک دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد اس کتب خانہ میں وقتاً فوقتاً کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس طرح ایک اچھا خاصا علمی ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ اوچ گیلانی کے اس علمی خزانہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ اس میں دنیا بھر کے موضوعات پر کتابیں حتیٰ کہ فن تعمیرات، طباخی، بیطاری اور گھوڑوں کے مختلف اقسام اور ان کی دیکھ بھال کے موضوع پر [illegible] کتابیں موجود رہیں۔

کی گئی ہے کہ انہوں نے یہ کتاب اپنے روحانی فرزند شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے لئے تالیف کی تھی۔ فتوح الغیب جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تالیف ہے۔ اس کی ایک فارسی شرح مفتاح فتوح الغیب کا قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ شارح صاحب کتاب کے دوسرے فرزند گرامی شیخ شرف الدین ابو محمد عبدالرحمان علیبی ہیں جنہوں نے ۵۵۵ھ میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ہم خانوادہ گیلانیہ کے ذکر میں شیخ موصوف کا اجمالی تذکرہ کر چکے ہیں۔ گیلانی سلسلہ کے وہ اولین بزرگ ہیں جو اس بر صغیر میں تشریف لائے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین کی ایک شرح مشہور عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے قلم سے بھی یہاں پر محفوظ ہے اور اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ یہ کتاب ملائے موصوف نے شیخ بلاول قادری کی فرمائش پر مرتب کی تھی۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کی دو کتابوں مرقع اور کشکول کے قلمی نسخے بھی اس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ایک بے نام قلمی نسخہ حضرت شیخ شرف الحق بوعلی قلندر پانی پتیؒ کا ذات و صفات خداوندی کے باب میں تحریر فرمودہ ہے۔ تصوف پر ایک بے نام نسخہ مولانا عبدالرحمان جامیؒ کا بھی موجود ہے۔ یہ نظم و نثر کا دلکش مجموعہ ہے۔ حرف سر آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

عشق جز نائے و ما جز نے نئیم
دے دمی بے ما و مابے وی نئیم

کسی گمنام مصنف کی ایک کتاب، تصوف کے موضوع پر "جواہر الاشارات" کے نام سے موجود ہے۔ مشہور صوفی شاعر اور نامور بزرگ سلطان باہوؒ کی ایک کتاب شمس العارفین کا قلمی نسخہ موجود ہے یہ مسدس ہے اور نظم میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت سرائی کی گئی ہے۔

کجائی شاہ محی الدین کجائی چرا در کار مشکل می نیائی

نزہۃ الارواح کا ایک قدیم نسخہ بھی یہاں ملتا ہے جسے تصوف کے موضوع پر رکن الدین حسین بن عالم بن الحسن الحسینی[1] نے مرتب کیا ہے۔ تصوف ہی کے موضوع پر کسی گمنام مصنف کی لکھی ہوئی ایک کتاب لطیفۂ شریفہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب "نزہۃ العاشقین" ہے جسے علی بن محمود الجاج نے مرتب کیا ہے۔ آغاز کتاب ان الفاظ سے ہوتا ہے

"حمد و سپاس آفریدگارے را کہ سینۂ بیدلاں مستمنداں خزینہ اسرار عشق ساخت"!

امام علی بن سید نجف علی اکبر آبادی کی ایک کتاب "جواہر القرآن یا اسرار العرفان" اردو زبان میں ہے۔ کتاب اردو کی اس رباعی سے شروع ہوتی ہے۔

دل میں تھا یہی کہ سب سے اول مضمون
سر نامہ میں حمد کبریا ہو موزوں
پر ملک و زباں کو کب ہے یارا کہ کرے
اس وادی کو طے جو ہوشے حد سے افزوں

یہ کتاب اس اعتبار سے بڑی اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ہے کہ یہ بارھویں صدی کے ایک بزرگ کے رشحات فکر کا نتیجہ ہے اور اردو زبان کے بالکل ابتدائی عہد کی ایک گراں بہا یادگار ہے۔ رباعی کی زبان بتا رہی ہے کہ میر و سودا کا یہ معاصر اردو میں بڑا قادر الکلام اور سلاست و بلاغت میں ان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

فن تاریخ و رجال

تاریخ و سیر کے موضوع پر اوچ گیلانی کی لائبریری میں بعض بیش بہا مخطوطات ملتے ہیں ان میں سے کئی بالکل نادر و نایاب ہیں۔ اس کتب خانہ میں حبیب السیر کے بعض نامکمل اجزا موجود ہیں۔ اس

---

[1] رکن الدین حسین بن عالم بن الحسن الحسینی شیخ امیر کمال حسینی سادات کے نام سے معروف ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری کے ربیع ثانی میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ شاعر بھی تھے اور ان کی ایک مثنوی زاد المسافرین کے نام سے اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

کتاب کو غیاث الدین بن حمام الدین خواند میر نے ۹۳۰ھ میں مکمل کیا۔

ایک قیمتی مخطوطہ "فتوح احمد بن الاعثم" کا ہے جسے تیسری صدی ہجری میں خواجہ ابو محمد احمد بن الاعثمؒ الکوفی نے مرتب کیا۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر حضرت امام حسینؓ کی شہادت عظمیٰ تک کی تاریخ ہے۔ یہاں اس کا فارسی ترجمہ ہے جو محمد بن احمد المستوفی الہروی نے ۵۹۶ھ میں کیا ہے مگر نا تمام چھوڑ کر انتقال کر گئے ان کے بعد اسے محمد بن احمد بن ابی بکر الکاتب الما برنا آبادی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ مولانا عبدالرحمان جامیؔ کی کتاب شواہد النبوۃ کا ایک قیمتی قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے اور دسویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ خواجہ معین الدین بن حاجی محمد الفراہی کی کتاب معارج النبوۃ کا ایک نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔

حسین ابن علی الواعظ الکاشفی کی کتاب "روضۃ الشہداء" جس کا آغاز ذیل کی رباعی سے ہوتا ہے، بھی اس کتب خانہ کی زینت ہے۔

اے شربت دردِ تو دوائے دل ما
آشوب بلائے تو عطائے دل ما
از نام حمد تو شفائے دل ما
وز نام حبیب تو صفائے دل ما

حضرتِ امام علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے فضائل اور اوصاف کے باب میں ایک کتاب "مناقب مرتضوی" بھی گیلانی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اسے میر محمد صالح حسینی ترمذی نے جن کا تخلص کشفیؔ تھا، گیارھویں صدی ہجری میں مرتب کیا ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

خدا وندا عطا کن نشۂ ذوق!
کہ آغازم بنامت نامۂ شوق!

مناقب مرتضوی نام کا ایک اور رسالہ بھی ہے جسے حسین ابن معین الدین میبدی نے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے مناقب میں تحریر کیا ہے۔ اسی مصنف کا

ایک رسالہ آئمہ اثنا عشر (بارہ اماموں) کے حالات و مناقب پر تحریر کردہ موجود ہے۔

شاہ عباس صفوی جو ایران کا نامور بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے وقائع و حالات پر ایک تاریخی کتاب "تاریخ عالم آرائے عباسی" کا ایک نامکمل نسخہ ملتا ہے۔ اس کتاب کا مصنف اسکندر منشی نام کا کوئی مورخ ہے۔

خواجہ فریدالدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء اور شہزادہ دارا شکوہ کی سفینۃ الاولیا کے قلمی نسخے بھی خانوادہ گیلانیہ کی اس بیش بہا لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات زندگی اور فضائل و مناقب پر کئی ایک گمنام مصنفوں کی کتابیں بھی بکثرت موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک رسالہ پر جو کسی گمنام مصنف کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ رباعی سر نقطہ آغاز ہے۔

یارب بہ کمالات شہ جیلانیؒ — کاندر کرم و فضل نہ دارد ثانی

کن باطن ما پاک بہ یک جلوہ او — آلودہ مکن با غرض نفسانی

شہنشاہ جہانگیر کی خود نوشت یادداشتوں کا ایک مجموعہ "اقبال نامۂ جہانگیری" کا قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ خود نوشت سوانح کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے

"دربیان جلوس بر تخت در شہر آگرہ و نمودن جشن عالم افروز بجہت یادگار سرگزشت خویش را پارۂ بیان کنم۔ تا بر صفحات روزگار اثرے بماند.... بتاریخ ہشتم جمادی الثانی ۱۰۱۴ صبح روز پنج شنبہ قریب یک ساعت نجومی در شہر آگرہ در سن سی و ہشت سالگی پادشاہ شدم و بہ مبارکی بر تخت پادشاہی مراد جلوس نمودم۔"

اوچ کی تاریخی کتابوں میں "اخبار الآفاق" ایک چونکا دینے والی تاریخ ہے اس میں اہل بیت نبوت کے گیارھویں امام حضرت حسن عسکری رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ انھوں نے بخارا سے ترک سکونت فرما کر ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا اور اوچ کی سرزمین کو ان کا مسکن بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ع

کلاہ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید

اس روایت کی صحت کے لئے تاریخی شواہد موجود نہیں ہیں تاہم راقم الحروف کے ذہن میں ایک عرصہ سے یہ سوال موجود تھا کہ آخر اوچ میں وہ کون سی خصوصیت تھی یا اس کی آب و ہوا میں وہ کیا تاثیر تھی جس نے سادات کرام کے مقدس طائفہ کو ہر دور میں اس سرزمین کا رخ کرنے پر مجبور کیا اور چوتھی صدی ہجری سے لے کر ساتویں بلکہ نویں صدی ہجری تک خانوادہ رسالت کے عظیم الشان اور جلیل القدر افراد کا تانتا بندھا رہا اور انہوں نے صحرا کے اس تپتے ہوئے خطہ کو اپنی سکونت کے لئے منتخب فرمایا۔ روایت مذکورہ بالا کی روشنی میں اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے اور اوچ کی عظمت کو اس واقعہ سے اگر یہ صحیح ہے تو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ اہل نظر خواہد بود

اخبار الآفاق کے مصنف کا نام افسوس کہ سعی بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔ کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین.... بداں اسعدک اللہ تعالیٰ کہ ایں کتاب از احوال سادات؟

والہ داغستانی جس کا اصل نام علی قلی خاں تھا اس کی کتاب ریاض الشعراء کا قلمی نسخہ بھی اس لائبریری کی قدر و منزلت میں اضافہ کا موجب ہے۔ والہ داغستانی نے اس میں دو ہزار چار سو چھیانوے قدیم وجدید شعراء کے حالات اور ان کا نمونہ کلام درج کیا ہے۔ اس سے اس کتاب کی افادیت و اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مشہور عالم مولانا ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر میں والہ داغستانی کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ مشہور مورخ اور ادیب مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب یدِ بیضیٰ کا قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ یہ بھی شعراء قدیم وجدید کا مستند تذکرہ ہے۔

بادش بخیر حضرت شیخ مصلح الدین عبداللہ متخلص بہ سعدی شیرازی جنہیں فارسی نثر کا باوا آدم اور فارسی غزل کا پیغمبرؐ مانا گیا ہے اور جو اپنی کتاب گلستاں و بوستان

کے توسط سے شہرۂ آفاق عظمت کے حامل ہیں۔ ان کی علمی اور تاریخی تصنیفات میں سے "رسالات ستہ" کا قلمی نسخہ بھی اس لائبریری کا بیش قیمت اثاثہ ہے۔ چھٹی صدی ہجری کی اس رنگا رنگ اور بوقلموں شخصیت کے اس مجموعہ رسالات کو علی بن احمد بن ابی بکر نے جن کا تخلص "بے ستون" تھا، ترتیب دیا ہے۔ سرنامہ آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے۔

"شکر و سپاس معبودے راجلت قدرہ کہ آفرینندہ مخلوقات عالم است۔"

شہاب الدین نظام جو بارھویں صدی ہجری کا ایک نامور مورّخ ہے۔ اس کے دو رسالے ایک مناقب فخریہ جو مولانا محمد فخرالدین محب النبی اورنگ آبادی کے حالات پر مشتمل ہے اور دوسرا اسرار الابرار جو بزرگان طریقت کے حالات و فرامین و واقعات پر مشتمل ہے۔ اوچ گیلانی کی لائبریری میں موجود ہیں۔

گیلانی کے سجادہ نشین شیخ حامد محمد شمس الدین سادس کی ایک کتاب اپنے بزرگان و آباء کرام کے بارے میں موجود ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا ایک سفر نامہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ سفر نامہ کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مرتب کوئی اور ہے عبارت یہ ہے کہ

"الحمد للہ رب العالمین .... اما بعد ایں رسالہ ایست متبرکہ ازاں قطب الاقطاب حضرت شیخ جلال الدین جہانیاں جہاں گیر قدس اللہ سرہ العزیز کہ عالم کون و مکان، سیر و طیر چہل سال بر و بحر طے کردہ و ہفت حج اکبر گزاردہ چوں ایں دعا گو ہفتم حج گزاردہ در روضہ پاک آمدہ بہ شیخ عبداللہ مطری

ے جامی کا یہ قطعہ اس کا ثبوت ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

قلب مدینہ ملاقی شدم گفت نام تو چیست و از کجا آمدۂ و مولود تو کدام زمین است۔ گفت نام من جلال و مولود من اچ است و از اچ آمدہ ام"۔

فلسفہ و آداب اس موضوع پر چند ایک کتابیں گیلانی لائبریری میں موجود ہیں جن میں ایک بے نام رسالہ الشیخ الامام الزاہد ابوالحسن علی بن یحییٰ بن محمد زندویسی کا تصنیف کردہ ہے جسے ان کے کسی شاگرد نے مرتب کیا ہے۔ گمنام مصنفوں کے بعض اور رسالے بھی یہاں اس موضوع پر ملتے ہیں۔ حسین بن علی الواعظ الکاشفی کی "اخلاق محسنین" جو اخلاق محسنی کے نام سے معروف ہے۔ اس کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ بھی اس لائبریری کی زینت ہے۔

طب میڈیکل سائنس میں بعض بیش قیمت قلمی نوادر بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔[1] طب کے ایک نادر و نایاب مجموعہ ذخیرۂ خوارزم شاہی کے بعض حصے بھی موجود ہیں۔ فارسی زبان میں چھٹی صدی ہجری کے ربع اول کی یہ تصنیف طب کی بالکل ابتدائی عہد کی کتابوں میں سے ہے۔ اس کے مرتب و مولف زین العابدین ابو ابراہیم اسماعیل بن الحسین بن محمد بن احمد حسینی الجرجانی نام کے ایک بزرگ ہیں جو غالباً ۵۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے یہ کتاب خوارزم کے پہلے بادشاہ قطب الدین کے لئے جس کا عہد حکومت ۴۹۱ھ سے ۵۲۱ھ تک ہے۔ ۵۰۴ھ میں تالیف کی۔ ذخیرہ خوارزم شاہی دس حصوں میں تقسیم ہے اور ہر حصہ میں کئی ابواب و فصول ہیں۔ کتاب کا چھٹا حصہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے۔

"کتاب ششم از ذخیرۂ خوارزم شاہی یہ باید دانست کہ اندریں کتاب بیماریہائے جزوی از سر تا پا یاد کردہ شود و اسباب و معالجات آں و ایں کتاب بیست و یک

---

[1] طب کی بیشتر کتابیں اس عہد کی پیداوار ہیں جب طب یونانی اپنے پورے عروج پر تھا۔ اس موضوع پر تقریباً ہر شعبہ سے متعلق الگ الگ کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں مگر فن جراحی جو طب کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اس زمانہ میں عملاً ناپید تھا اس لئے جراحی کے موضوع پر کوئی کتاب یہاں نہیں ملی۔

گفتار است "

ذخیرۂ خوارزم شاہی کے ان اجزاء کے علاوہ بعض دیگر قیمتی طبی مسودات اور بیش بہا مخطوطات موجود ہیں ان میں علی بن حسین الانصاری جو حاجی زین العابدین عطار کے نام سے معروف تھے، کی کتاب " اختیارات بدیعی" ہے جسے آٹھویں صدی ہجری میں لکھا گیا۔

منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن فقیہہ الیاس کی کتاب " کفایۂ منصوری" بھی طبی معلومات پر ایک مستند اور جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کو اس کے مصنف نے نویں صدی ہجری کے وسط میں کشمیر کے مشہور بادشاہ زین العابدین کی طرف منسوب کیا ہے۔ کتاب کا آغاز اس خطبہ مسنونہ سے ہوتا ہے۔

" شکر و سپاس مرخالقے را کہ در خلقت انسان دقائق حکمت او بے پایاں است "

سکندر آملی کی کتاب مرآۃ السلطنت جو اس نے اپنے ایک لڑکے محمد صادق کے لیے بہ طور خاص تصنیف کی۔ طب پر ایک معلومات افزا کتاب ہے۔ دہلی کے مشہور طبیب حکیم محمد شریف خاں کی ایک کتاب " علاج الامراض" بھی اس کتبخانہ کی قیمتی متاع ہے۔ کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

در فیض است منشیں از کشائش ناامید ایں جا
بہ رنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

کسی گمنام مصنف کی لکھی ہوئی ایک کتاب " ریاض الادویہ" ہے، جسے ۹۴۰ھ میں کسی قابل طبیب نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

" الحمدُ للہِ الذی خلق لکل داءٍ دوا .... و بعد بر ضمائر صافیہ محجوب نماند کہ ایں نسخہ الیست "

ایک کتاب " قرابا دین قادری" ہے جسے محمد اکبر معروف بہ محمدؐ ازرانی ابن

حاجی محمد مسکین نے ۱۱۰۶ھ میں مرتب کیا ہے۔" از ملہم غیب بداں مامور شدہ کہ فرابا دینی بنولیسد"۔ اس کے علاوہ طب کی ہر صنف پر کتابیں موجود ہیں۔ ایک کتاب مختلف جانوروں کے گوشت کی خاصیت کے باب میں ہے۔

شعر و ادب گیلانی لائبریری میں فارسی کے قدیم و جدید شعرا کے دواوین اور ان کے شعری سرمایہ کا معتد بہ ذخیرہ موجود ہے اور مشاہیر شعرا میں بہت کم ایسے فارسی شاعر ہوں گے جن کے رشحاتِ فکر کے نادر قلمی نسخے یہاں دستیاب نہ ہوں۔

فردوسی جسے ابیات فارسی کا پیغمبر کہا گیا ہے اور جسے انوری جیسے نامور شاعر نے فارسی شاعری کا خداوند کہا ہے۔ انوری کا قطعہ ہے۔

آفریں بر روانِ فردوسی　　　آں ہمایوں نژاد فرخندہ

او نہ استاد بود و ما شاگرد　　　او خداوند بود و ما بندہ

فردوسی کی شہرہ آفاق نظم شاہنامہ جو ۶۰ ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے اس کا ایک مصور قلمی نسخہ گیلانی لائبریری کی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہا ہے شاہنامہ فردوسی کا ایک نثری انتخاب" کتاب منتخب شاہنامہ" کے عنوان سے توکل بیگ ولد تولک بیگ حسینی کا ترتیب دیا ہوا بھی اس کتب خانہ کی زینت ہے۔ یہ کتاب غزنی کے گورنر شمشیر خاں کی فرمائش پر لکھی گئی اور اس لئے اس کا نام " تاریخ دلکشائے شمشیر خانی" بھی ہے۔ یہ مخطوطہ بھی مصور ہے اور اس میں ۵۷ خوب صورت قلمی تصاویر اس انتخاب کی جان ہیں۔ مشہور فلسفی شاعر حکیم سنائی جسے مولانا رومی نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او

ما از پس سنائی و عطار آمدیم

چھٹی صدی ہجری کے اس صوفی شاعر جس کا پورا نام ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی ہے کی مشہور کتاب " حدیقۃ الحقیقۃ و شریعۃ الطریقت" جو مثنوی کے

رنگ میں لکھی گئی ہے یہاں اس کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔ کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

برتر از وہم و عقل و حسن و قیاس
چیست جز خاطر خدائے شناس

اوحدالدین الوزی جو فارسی قصیدہ گوئی میں طرز خاص کا موجد ہے۔ اس کا دیوان بھی اس کتب خانہ کی زینت ہے۔ دیوان کا سر آغاز یہ شعر ہے۔

مقدری نہ بالست قدرتِ مطلق
کند ز شکل بخاری چو گنبدِ ازرق [1]

خمسۂ نظامی گنجوی جس میں چھٹی صدی کے اس مشہور شاعر کی پانچ مختلف مثنویوں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک مصور ایڈیشن بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ پانچ مثنویاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) صفت پیکر، جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے جہاں دیدہ بود خویش از تو
ہیچ بودی نبود پیش از تو

(۲) لیلیٰ مجنوں، اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

اے نام تو بہترین سر آغاز
بے نام تو نامہ کے کنم باز

---

[1] اوحدالدین الوزی کا یہ شعر عہد قدیم کے اس فلسفہ کا غماز ہے جس میں آسمان کو بخارات کا ایک غیر مادی وجود قرار دیا گیا ہے۔ جدید فلسفہ بھی اسے کسی حد تک صحیح قرار دیتا ہے۔ الوزی فلکیات بالخصوص نجوم کا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۵

(۱) فردوسی طوسی کا انتقال محمود غزنوی کے عہد میں ۱۱ھ میں ہوا۔

(۲) حکیم سنائی غزنوی کا انتقال ۵۴۵ھ میں ہوا۔

(۳) خسرو شیریں، یہ اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

خدا وندا در توفیق بکشائے!
نظامی را رہِ تحقیق بنمائے!

(۴) مخزن اسرار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!!
ہست کلید در گنجِ حکیم!

(۵) سکندر نامہ، اس کے دو حصے ہیں۔ ایک سکندر نامہ بری جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

خدایا جہاں بادشاہی تراست
ز ما خدمت آید خدائی تراست

اور سکندر نامہ بحری، جس کا مطلع ہے۔

خرد ہر کجا گنج آرد پدید!
بنام خدا سازد آں را کلید

سکندر نامہ کا ایک الگ مصور قلمی نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔
ابو حامد یا ابو طالب محمد بن ابی بکر ابراہیم فریدالدین عطار نیشاپوریؒ کا ایک منظوم رسالہ منطق الطیر بھی یہاں موجود ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوا ہے۔

آفریں جان آفریں پاک را!
آنکہ جان بخشید مشتِ خاک را

---

(۳) انوری ۵۸۷ھ میں فوت ہوا۔

(۴) نظامی گنجوی کا پورا نام نظام الدین ابو محمد الیاس ابن یوسف ابن مویدا لگنجوی ہے۔ ۵۳۵ھ میں پیدا ہوا اور ۵۹۹ھ میں فوت ہوا۔

لہ خواجہ فریدالدین عطار ۵۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۲۷ھ میں انتقال فرمایا۔

فریدالدین عطار کی ایک اور مثنوی "جواہر الذات" جس کا پہلا شعر یہ ہے

به نام آنکه نور جسم و جان است
خدائے آشکارا و نہان است

اور "مظہر العجائب" جس کا سر مطلع دیوان یہ شعر ہے

آفریں جاں آفریں بر جان جہاں
آنکه ہست او آشکارا و نہاں

بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی(۲) کی مثنوی کا ایک قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مثنوی کے پہلے دفتر کی شرح جسے ان کے ہمنام مولانا جلال الدین واعظ بخارا نے قلم بند کیا ہے کا ایک نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

دیوان شمس تبریز جو در اصل مولانا رومی ہی کے کلام کا مجموعہ ہے اور جسے غلطی سے ان کے مرشد کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ دیوان کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے گل زاہل شکری یا از شکر اولیٰ تری
شکر خوش و گل ہم خوش است از بر دو نیکوتر وفا

دیوان سعدی کا ایک عمدہ نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس دیوان میں شیخ سعدی شیرازی کے قصائد ہیں۔ طیبات اور مقطعات ہیں۔ یہ گویا سعدی کی کلیات ہی کا ایک نامکمل نسخہ ہے افسوس کہ اس مجموعہ میں سعدی کی غزلیات موجود نہیں ہیں جو اس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ سعدی کے قصائد کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

شکر و سپاس نعمت و منت خدائے را
پروردگار خلق و خداوند کبریا!

---

(۲) مولانا رومی ۶۰۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۷۲ھ میں فوت ہوئے۔

طیبات کا پہلا شعر یہ ہے

اول دفتر بہ نام ایزد دانا !
صانع پروردگار حی و توانا !

مقطعات میں پہلا قطعہ یہ ہے۔

آں ماہ دو ہفتہ درحجاب است
یا جوز کر دست در نقاب است
آں وسمہ بر ابروانِ دلبند
چوں قوس قزح بر آفتاب است

سعدی کے پندنامہ یعنی "کریما" کا ایک قلمی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ شرف بخاری کا مشہور رسالہ" نام حق" بھی ہے جو درس نظامی میں شامل ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

نام حق بر زباں ہمی رانیم کہ بجان و دلم ہمی خوانیم !

یمین الدین ابوالحسن امیر خسروؒ ابن سیف الدین محمود شمسی کی مثنوی قرآن السعدین کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بھی اس کتاب خانہ میں موجود ہے۔ زادالمسافرین جسے رکن الدین حسین بن عالم بن ابی الحسن الحسینی نے ترتیب دیا ہے اس کا قلمی نسخہ بھی یہاں محفوظ ہے آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

اے برتر ازاں ہمہ کہ گفتند
آنانکہ پدید یا نہفتند !!

دیوان حافظ شیرازیؒ کے کئی قلمی نسخے بھی یہاں موجود ہیں۔

---

(۳) امیر خسرو جو بیک وقت صاحب سیف بھی تھے اور صاحب قلم بھی۔ صوفی بے ریا بھی تھے اور رند پاکباز بھی۔ شاعر شعلہ نوا بھی تھے اور مغنی آتش نفس بھی۔ ٦٥١ھ میں پیدا ہوئے اور ٧٢٥ھ میں وفات پائی اور اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے قدموں میں دفن ہوئے۔

لہ حافظ شیرازی جو غزل میں طرز نو کے علمبردار تھے۔

شاہنامہ کی طرز پر لکھا ہوا "خاور نامہ" جو حضرت امام علی ابن ابی طالب کے معرکہائے حرب و قتال کی داستان ہے اور جسے نویں صدی ہجری میں شمس الدین بن حسام الدین نے جو ابن حسام کے نام سے مشہور ہے قلم بند کیا ہے اس کتب خانہ میں موجود ہے

مولانا نورالدین عبدالرحمان جامیؒ فارسی کے مشہور نغز گو شاعر گزرے ہیں ان کی مثنویوں "سلسلۃ الذہب"، "اعتقاد نامہ"، "لیلیٰ مجنوں"، "یوسف زلیخا" کے قلمی نسخے بھی یہاں محفوظ ہیں۔ محی لاری کی فتوح الحرمین جسے غلطی سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا نسخہ بھی یہاں محفوظ ہے۔ آغاز کا شعر یہ ہے۔

اے ہمہ کس را بہ ورت التجا ‏ ‏ ‏ ‏ کعبۂ دل راز تو نور وصفا

بدرالدین ہلالیؒ استرآبادی کا ایک دیوان بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ مطلع سر آغاز یہ ہے۔

اے نورِ خدا در نظر از روئے تو مارا ‏ ‏ ‏ ‏ بگزار کہ در روئے تو بینیم خدا را

ہلالی استرآبادی کی ایک مثنوی صفات العاشقین بھی یہاں موجود ہے۔

غربتی نام کے ایک شاعر کا دیوان بھی یہاں موجود ہے۔ پہلا شعر یہ ہے۔

کل حمد لوجہ مولائی ‏ ‏ ‏ ‏ کہ عطا کرد طبع و گویائی

کمال الدین وحشی یزدی کی مثنوی فرہاد و شیریں میر مشتاق کا دیوان جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ان کا انتقال ۷۹۱ھ میں ہوا۔ پورا نام شمس الدین محمد اور حافظ تخلص تھا۔

لہ مولانا عبدالرحمان جامی بہت ۔۔ بڑے عالم۔ فقیہہ شاعر اور ادیب تھے۔ وہ حضرت سید محمد غوث اوچی کے ہمعصر تھے۔ ۸۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۹۸ھ میں رحلت فرمائی۔ مولانا عبیداللہؒ احرار سے بیعت ہوئے انکا ایک شعر ہے

چوں فقر اندر لباس شاہی آمد ‏ ‏ ‏ ‏ بہ تدبیر عبیداللہی آمد (جامی)

ےہ ہلالی استرآبادی کا انتقال ۹۳۵ھ میں ہوا۔

مخواں زدیرم بہ کعبہ زاہد کہ بردہ از کف دل من آں جا
بہ نامہ مطرب بہ عشوہ ساقی بخندہ ساغر بہ گریہ مینا

اور محتشم کاشی کی غزلیات بھی یہاں موجود ہیں۔

سید محمد بن زین الدین بن جمال الدین جس کا تخلص عرفی شیرازی[1] تھا اور جو مغل بادشاہ اکبر کے عہد کا نامور شاعر تھا۔ اس کی کلیات کا ایک نادر مجموعہ بھی یہاں محفوظ ہے۔ کلیات میں "رسالہ نفسیہ" کے علاوہ جو نثر میں ہے اس کی غزلیات، مقطعات، قصائد اور مثنوی مجمع الابکار شامل ہیں۔ عرفی شیرازی کے قصائد کا ایک الگ مجموعہ بھی کتب خانہ میں موجود ہے۔

غنی کاشمیری[2] کا دیوان بھی یہاں ناقص حالت میں موجود ہے۔ مرزا محمد علی صائب[3] اصفہانی کے دیوان کا کلام بھی یہاں موجود ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوا ہے۔

خردہ دانست آنکہ جرم خویش را بے چارہ شد
آدمؑ از جنت برائے گندمے آوارہ شد

محمد اسحاق شوکت بخاری[4] کے دیوان کا ایک نسخہ بھی محفوظ ہے۔ پہلا شعر

الٰہی رنگ تاثیرے کرامت کن فغانم را
زموج اشک بلبل آب دہ تیغ بیانم را

میر عسکری[5] عاقل خاں رازی کی مثنوی مرقع کا ایک نسخہ بھی موجود ہے۔ پہلا شعر یہ ہے۔

الیہا الساقی اغثنی فی الغمام   اسقنی من جرعتہ الکاس الکرام

ناصر علی سرہندی[6] کا دیوان جس کا مطلع یہ ہے۔

---

[1] عرفی شیرازی ۹۹۹ھ میں فوت ہوا
[2] ۱۰۷۹ھ میں فوت ہوا۔
[3] ۱۰۸۸ھ میں فوت ہوا
[4] ۱۱۰۷ھ میں وفات ہوئی
[5] میر عسکری فوج میں ایک عہدہ تھا اس کا انتقال ۱۱۰۸ھ میں ہوا۔ [6] وفات ۱۱۰۸ھ میں ہوئی۔

الٰہی ذرہ دردے بجاں ریز ! شرر در پنبہ زار استخواں ریز

مرزا محمد رفیع خاں باذل[1] کی مثنوی حملہ حیدری کا ایک نایاب نسخہ بھی یہاں ملتا ہے۔ پہلا شعر

بنام خداوند بسیار بخش خرد بخش دیں بخش دینار بخش

مرزا عبدالقادر بیدل[2] کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب بھی جس میں اس کی رباعیات ترکیب بند، ترجیع بند اور قصائد شامل ہیں، یہاں موجود ہے۔ بیدل کی ایک رباعی ہے

زاں کس کہ منزہ است نہ آب و گل ما
بے او عدم است خلوت و محفل ما
نامش از پردہ بر زباں مے آید !!!
واللہ کہ نیست جائے او جز دل ما !

صدر الدین[3] محمد بن زبردست خاں فائز کا مجموعہ کلام جس میں غزلیات و قصائد اور دیگر اصناف شعری کے علاوہ مرثیے بھی ہیں، یہاں موجود ہے۔ مرثیہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

یا مصطفےٰ حسین خورت در بلا ببیں افتادہ سر جدا بہ رہِ کربلا ببیں

نظام الملک آصف جاہ کے درباری شاعر فیض[4] کا دیوان بھی کتب خانہ کی زینت ہے۔

تا نگہ افتاد بر لعل لب دلبر مرا
برد ہوش از سر خیال بادۂ احمر مرا

---

[1] سن وفات ۱۱۲۳ھ ہے۔

[2] اردو اور فارسی کے اس نامور شاعر کا سن وفات ۱۱۳۳ھ ہے۔ دہلی میں قلعہ کہنہ کے قریب مدفون ہے۔ اس کا یہ شعر زبان زد ہے:

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

[3] بارھویں صدی کے وسط میں فوت ہوا۔ [4] فیض کا پورا نام محمد فیض اللہ تھا۔ دیوان پر خود اس کی اپنی مہر ثبت ہے

قصیدہ کا یہ شعر

چو فیض خستہ احوالم خرابست　　نظام الملک آصف جاہ بے تو

نورالعارفینؒ واقف بٹالوی کا دیوان بھی موجود ہے۔ پہلا شعر ہے

مبارک است بہ نام تو افتتاح کلام　تبارک اسمک یا ذوالجلال والاکرام

واقف بٹالوی بڑا اچھا غزل گو بھی تھا اس کا یہ شعر قابلِ داد ہے۔

تولی کہ ساختہ ای درد مند واقف را

تولی کہ چارہ آں درد مند را نہ کنی

سرائیکی زبان کے مشہور شاعر خواجہ غلام فریدؒ کے برادر بزرگ حضرت خواجہ محمد غلام فخرالدین ایک نامور صوفی گزرے ہیں ان کا تخلص اوحدی تھا کتب خانہ میں ان کا دیوان بھی موجود ہے۔ سر مطلع آغاز یہ شعر ہے۔

اوحدی آنکہ گشت محو بہ ذات　　از جہات و قیود یافت نجات

معروف و غیر معروف شعرا کے اس ذخیرۂ کلام میں "کلیات سید" ایک اہم اور نہایت بیش قیمت مجموعہ ہے۔ سید در اصل تخلص ہے۔ اوچ گیلانی کے سجادہ نشین حضرت مخدوم حامد محمد شمس الدین ساوس کا جو اردو، فارسی اور سرائیکی کے قادرالکلام شاعر تھے، کلیات سید کے کئی نسخے یہاں موجود ہیں جن میں بعض مختصر اور بعض ضخیم ہیں۔ مخدوم صاحب کا انتقال ۱۳۰۳ھ میں یعنی آج سے ۸۲ برس پہلے ہوا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی مثالیں ملتی ہیں۔ اردو غزل میں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کیوں نہ ہر لحظہ زباں پر ہو مری حمد خدا

تجھ سا بت، سنگدل و عربدہ جو خلق کیا

اور اس پر ۱۱۹۹ھ ثبت ہے۔

لہ واقف بٹالوی کا سن وفات ۱۲۰۰ھ ہے۔ والد کا نام امانت اللہ تھا۔

یا خدا کوئی بشر مجھ سا گرفتار نہ ہو
جان سے جائے بلا سے پہ یہ آزار نہ ہو

مرثیہ کا انداز
کرو مجھو غم شہ میں چشم گریانی!
لب فرات ہوا آہ قتل بن پانی!

بعض دیگر اردو اشعار

یا الٰہی کون ہے فریاد رس تیرے سوا
درد مندم بکیم بس عاجزم سر تا بہ پا
کس سے جا کر کہوں میں راز دل!
تجھ سا ہے کون دیوے داد مری
اے جناب کبریا میری یہی ہے التجا
پنج تن کے واسطے میرا بر آوے مدعا

سرائیکی کے اشعار

الف اللہ آن ملاوے تینوں میں سوز فراق جلاوندا ہے
اندر گیری ہویاں باہر ویری ہویاں میکو دوہیں جہان جلاوندا ہے

ایک اور شعر

الف آویں ڈھولا کدی اناں جھوکاں سانوں عشق تساڈے نن لدیاں چوکاں

فارسی اشعار

یارب چہ شد کہ یارب من از سما گذشت
ناسور دل ز مرہم و درد از دوا گذاشت
ولا تشکر خدا کن تا توانی کہ داد انساں را شیریں زبانی
ایں چہ در دلیست کہ دل یاس بہ خود بہ گزیند
دامن خویشتن از زیست فراہم چینید
الٰہی شد بہ عصیاں روزگارم کنوں از کردۂ خود شرمسارم

غزل کا ایک شعر

الا اے آنکہ بربستی ہزاراں قافلہ دل ما

بیا روزے درون دیدہ من ساز منزل ہا

اوچ گیلانی کی اس لائبریری کا ایک نادرۂ روزگار نسخہ علامہ قاضی قطب الدین کاشانی کا منظوم رسالہ تحفۃ الفقہ ہے۔ قاضی موصوف ناصرالدین قباچہ کے عہد میں ملتان اور اوچ کے قاضی القضاۃ رہے ہیں اور حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے ہم عصر تھے۔ تحفۃ الفقہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

شکر حق را کہ رب عالمیانست   نعت عاقبت بہ متقیانست

گوسائیں ولی رام نام کے ایک ہندو شاعر کا متصوفانہ فارسی کلام بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے جو اسلامی تصوف و معرفت کے چھ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

ما ہمہ از کفر و دیں برگشتہ ایم   محو اصل و زیں دو بیخود گشتہ ایم

کشمیر جنت نظیر کی تعریف میں نیز مغلیہ فن تعمیر اور مغل بادشاہوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کے وصف میں ایک مجموعہ کلام کسی گمنام شاعر کا یہاں موجود ہے آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

نمی گویم کہ اسپم رفت از باد   نسیمے می وزید از جنبش افتاد

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں ایک رسالہ "حلیۃ النبی" نظم میں ہے۔ شاعر کا نام اعظم ہے۔ سر مطلع دیوان یہ شعر ہے۔

تاریخ اوچ میں مولوی حفیظ الرحمٰن مرحوم نے قاضی قطب الدین کا مزار اوچ میں لکھا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ملتان میں مدفون ہیں۔ ان کا مزار قلعہ کہنہ پر حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے مزار کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ قباچہ نے انہیں حضرت زکریا ملتانیؒ کا زور توڑنے کے لئے بلایا تھا مگر بعد میں قباچہ ان کا مخالف ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ قباچہ نے انہیں اوچ بلا کر قتل کروا دیا تھا۔

حمد مر خالق محمدؐ راست که جمال محمدی آراست

نثری ادب

نثری ادب میں بعض نامور ادیبوں اور علمی شخصیتوں کے خطوط کے علاوہ حکایات، رقعات اور پند و نصیحت پر مشتمل بعض ادبی نگارشات بھی اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

سعدی کی گلستان کے قلمی نسخے کے علاوہ انشائے ابوالفضل، شیخ حامد گنج بخش حسنی کے مکتوبات جو انہوں نے اپنے مریدین اور نواب امیر محمد مبارک خاں اور نواب بہاول خاں ثانی کے نام لکھے۔

حسین بن علی واعظ کاشفی کی انوار سہیلی اور لطائف الظرائف اور شیخ عنایت اللہ کنبوہ کی بہار دانش کے قلمی نسخے بھی یہاں موجود ہیں۔ نورالدین محمد عوفی کی جامع الحکایات جو اس صنف ادب میں فارسی کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے اس کا ایک قلمی نسخہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ جامع الحکایات کے مصنف ناصرالدین قباچہ کے عہد کے اہم علمی بزرگ تھے اور انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اوچ میں گزارا۔ ان کا تذکرہ اوچ کی علمی شخصیتوں کے باب میں ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ جامع الحکایات کا حرف آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

"شکر و سپاس مر خدائے را کہ آفرینندۂ گیتی و ستایندہ نیکی است"

متفرقات

مذکورہ بالا ادبی تصنیفات کے قلمی نسخوں کے علاوہ مختلف شعرائے فارسی کے کلام کے انتخابی مجموعے بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں ان انتخابی مجموعوں سے ان کے مرتبین کے ذوق بلند اور حسن نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دلی کہ بے تو رود زندگی نمی شمرم بیا کہ خون جگر می رود ز چشم نزم
بہ ہمواری ادب کن خصم سرکش را کہ خاکستر
بہ نرمی زیر دستِ خویش می گرداند آتش را
ترا کہ نور نظر نیست اغتیاں انگیز نظر بہرچہ کنی می شود غبار آمیز

تشریح مخطوطات خانوادۂ بخاریہ

۱۔ کپڑے پر قرآن پاک کی مشہور آیت کریمہ آیت الکرسی بہترین خطِ نسخ میں لکھی ہوئی ہے۔ طرزِ تحریر اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں باریک تحریر میں ایک مسلسل عبارت یا بعض مبہم کلمات کے ذریعے حروف بنتے چلے گئے ہیں۔

۲۔ ہرن کی کھال پر لکھا ہُوا خطِ نسخ میں قرآن پاک

ان دونوں نسخوں کے بارے میں بخاری سجادگان نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اوّل الذکر امام حسنؓ اور دُوسرا امام حسینؓ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے حالانکہ یہ طرزِ تحریر اس زمانہ میں قطعاً مروج نہیں تھا۔

تشریح مخطوطات خانوادۂ گیلانیہ

۳۔ شرح غنیۃ الطالبین ،۔ برِصغیر کے نامور عالم مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی جو دورِ شاہجہانی کی معروف علمی شخصیتوں میں سے ہیں، انہوں نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی معرکۃ الآرا کتاب غنیۃ الطالبین کی شرح فارسی میں لکھی ہے جبکہ شیخ کی کتاب کا متن عربی میں ہے۔

۴۔ تفسیر حسینی کا ایک ورق ،۔ یہ مخطوطہ گیارھویں صدی ہجری کا ہے، عبدالباقی یاقوت رقم کے کلکِ تحریر کا نادر نمونہ ہے حاشیہ پر خطِ نسخ ہی میں حسین الواعظ کاشفی کی تفسیر حسینی مرقوم ہے جو کاشفی نے نویں صدی ہجری میں ہرات کے حکمران سلطان حسین مرزا کے وزیرِ اعظم اور فارسی کے مشہور شاعر علی شیر نوائی کیلئے تالیف کی

۵۔ مشکوٰۃ المصابیح، جو حدیث کی مشہور کتاب ہے اس کا ایک ورق حاشیہ پر توضیح مطالب کے ساتھ ساتھ فنِ اسماء الرجال سے متعلق بعض ضروری معلومات بھی درج کی گئی ہیں۔

۶۔ خطِ کوفی میں قرآن پاک کا ایک نادر و نایاب نسخہ جو ہرن کی کھال پر لکھا گیا اور جس کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے اسے تحریر کیا ہے۔

۷۔ خطِ کوفی میں قصیدۂ غوثیہ جس کی نسبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف کی جاتی ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قصیدہ کا پہلا شعر ہے

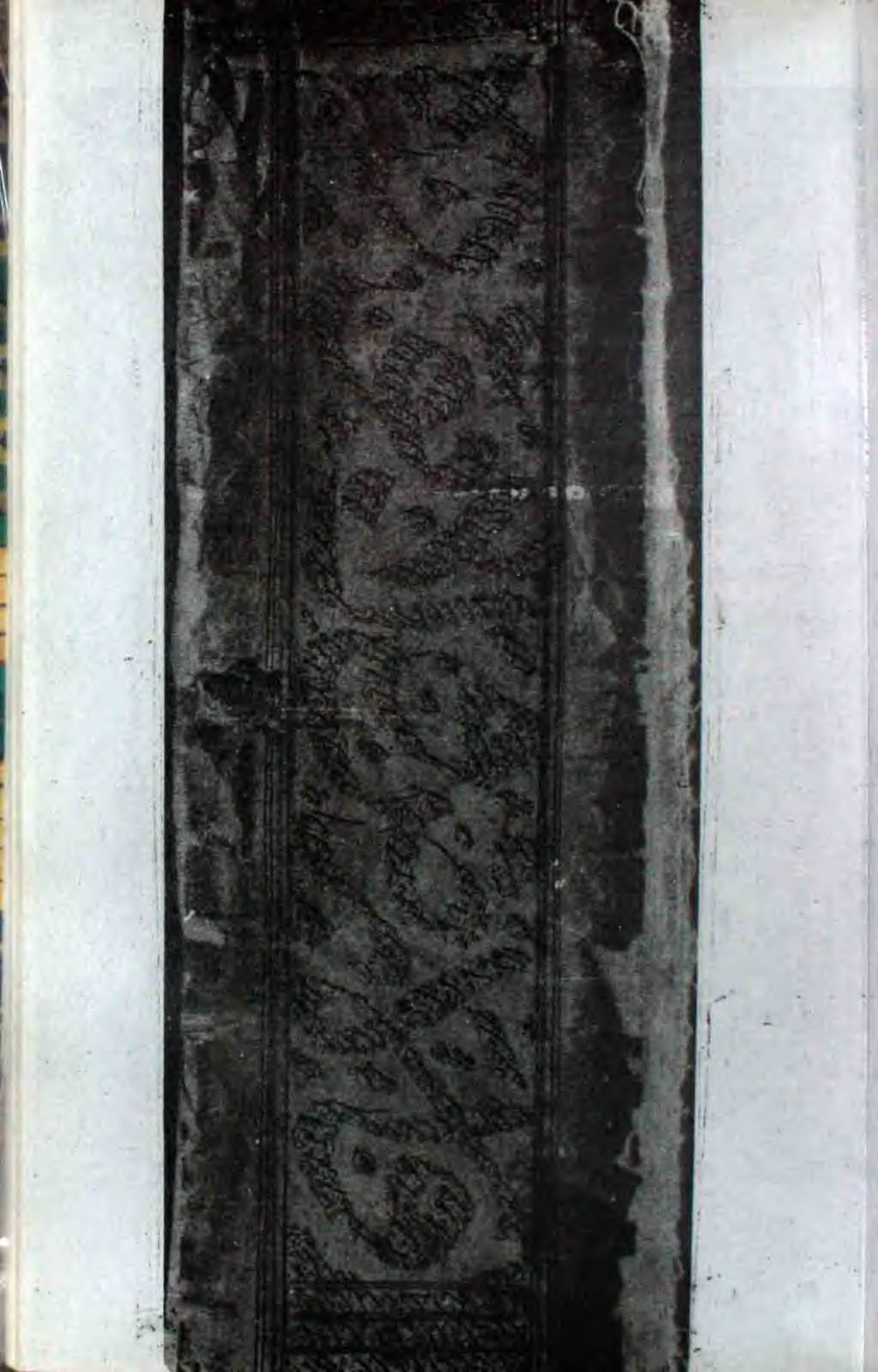
سقانی الحبُّ کاسات الوصالِ فقلتُ لخمرتی نحوی تعالی

۸۔ قرآن مقدس کا ایک قیمتی نسخہ ہے جو طلاء مرصّع ہے اور خطِ کوفی سے ملتے جلتے طرزِ تحریر کا ایک دلکش و دلآویز نمونہ۔

۹۔ قرآن مقدس کا ایک نایاب نسخہ جس کے بین السطور میں قرآن پاک کے الفاظ کی ترکیبِ نحوی بیان کی گئی ہے۔

۱۰۔ دلائل الخیرات کے قلمی نسخے کا ساتواں حزب

۱۱۔ خطِ نسخ میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے اسمائے گرامی اور خطِ نستعلیق میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل اور آپ کے حلیہ مبارک پر مشتمل مخطوطہ کا ایک ورق۔



بسم الله الرحمن الرحيم
الم ذلك الكتاب
لا ريب فيه هدى
للمتقين الذين
يؤمنون بالغيب
ويقيمون الصلوة
ومما رزقناهم ينفقون
والذين يؤمنون
بما انزل اليك

مبين * فان زللتم من
بعد ما جاءتكم البينات
فاعلموا ان الله عزيز حكيم
هل ينظرون الا ان
ياتيهم الله في ظلل من
الغمام والملائكة وقضي
الامر والى الله ترجع الامور
سل بني اسرائيل كم
اتيناهم من اية بينة ومن
يبدل نعمة الله من بعد
ما جاءته فان الله شديد
العقاب * زين للذين
كفروا الحيوة الدنيا ويسخرون

صلى الله عليه وسلم من مات على وصية مات على سبيل

وسنة ومات على تقى وشهادة ومات مغفورا له رواه ابن

ماجة عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن العاص بن

وائل أوصى أن يعتق عنه مائة رقبة فأعتق ابنه هشام خمسين

رقبة فأراد ابنه عمرو أن يعتق عنه الخمسين الباقية فقال

حتى أسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم فأتى النبي صلى

الله عليه وسلم فقال يا رسول الله إن أبي أوصى أن يعتق عنه

مائة رقبة وإن هشاما أعتق عنه خمسين وبقيت عليه خمسون

رقبة أفأعتق عنه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

إنه لو كان مسلما فأعتقتم عنه أو تصدقتم عنه أو حججتم

عنه بلغه ذلك رواه أبو داود أنس قال قال رسول الله

نا لمو سو د و ا لا ه
ر و سـها فسف ا
معكد و ر و مر كل
ـطـا و و حر لكم
نحر خو و ر فو و ا
ا لو الله ع ى لكم
سه لد لف صر و لا

كان عليما قديرا ولو يؤاخذ
الله الناس بما كسبوا ما ترك على ظهرها من د
ابة ولكن يؤخرهم إلى أجل مسمى فإذا جا
أجلهم فإن الله كان بعباده بصيرا



بسم الله الرحمن الرحيم
يس والقرآن الحكيم إنك لمن المرسلين على
صراط مستقيم تنزيل العزيز الرحيم لتنذر
قوما ما أنذر آباؤهم فهم
غافلون لقد حق القول على أكثرهم فهم لا
يؤمنون إنا جعلنا في أعناقهم أغلالا فهي
إلى الأذقان فهم مقمحون وجعلنا من بين
أيديهم سدا ومن خلفهم سدا فأغشيناهم
فهم لا يبصرون وسواء عليهم أأنذرتهم أم لم
تنذرهم لا يؤمنون إنما تنذر من اتبع الذكر
وخشي الرحمن بالغيب فبشره بمغفرة وأجر
كريم إنا نحن نحيي الموتى ونكتب



أنعمت عليهم

غير المغضوب

عليهم ولا الضالين



أن تصلي عليه وعلى آله عدد
نبات الأرض في قبلتها وجوفها
وشرقها وغربها سهلها وجبالها
من شجر وثمر وأوراق وزرع
وجميع ما أخرجت وما تخرج

منها من نباتها وبركاتها
من يوم خلقت الدنيا الى يوم
القيمة في كل يوم ألف
مرة أن تصلي عليه وعلى آله
عدد ما خلقت من الإنس و
الجن والشياطين وما أنت خالقه
منهم الى يوم القيمة في كل يوم

بوده میبردند از انگشت دست راست بر کف دست چپ چون خشم میکردند و غضب شدند روی بپهلوی خود

ن خوش میشد ولذت می یافتند از چیزی می پوشیدند چشم و بود اکثر ضحک مبارک ایشان تبسم میشد

در تبسم دندان شریف مانند ژاله در صفا و آب صلی الله علیه وآله وسلم

بسم الله الرحمن الرحیم

شجاع ۞ حارب ۞ مسلم ۞ علی ۞ مخبر ۞ مجتبی ۞ مرتضی

مکی ۞ وفی ۞ رضی ۞ خلیل ۞ تقی ۞ نجی ۞ صفی ۞ لی

فسیح ۞ مسیح ۞ محلل ۞ ملیح ۞ فاتح ۞ ناصح ۞ رائح ۞ جمیل

قاضی ۞ مکبر ۞ رفیع ۞ رابع ۞ سرمد ۞ مجدد ۞ صحیح

منصور ۞ سرور ۞ وفور ۞ حضور ۞ نور ۞ شفیع ۞ مشفع

رؤف ۞ معلم ۞ ذاکر ۞ معمود ۞ مشکور ۞ مغفور

مبارز ۞ رابط ۞ مجاهد ۞ جاهد ۞ باذل ۞ عادل ۞ موالد

نصیر ۞ ناطق ۞ منطق ۞ معجم ۞ معرب ۞ صادق ۞ سابق

صاحب ۞ وافی ۞ زاکی ۞ شریف ۞ مکرم ۞ کریم

زاهد ۞ راکع ۞ مطیب ۞ حبیب ۞ عابد ۞ ماجد ۞ لطیف

عجائب نشہ دارم مبین کردہ آرامم :: زچشم یار ساغری دہد ہر حلقۂ دامم

سالہا شد کہ بہ آں رخ نگرانی دارم

زیر باشد کہ ز زلف تو نشانی دارم

ذرہ خاک بہ مشت کہنم می خندد :: بر سر خرمنم اے برق درخشندہ بیا

اوچ گیلانی کی لائبریری کا سب سے قیمتی سرمایہ اور اس کی سب سے بیش بہا دولت مصوری کے وہ نادر شاہکار ہیں جن کے کئی مجموعے اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔ قلمی تصاویر کے ان مختلف مجموعوں میں جو کسی ماہر فن مصوّر کے موئے قلم کے شہ پارے ہیں۔ بادشاہوں، فقیروں، درویشوں، شاہزادوں اور اہل اللہ کی قلمی تصاویر بڑی عمدہ اور نفیس حالت میں موجود ہیں۔

بادشاہوں میں خسرو ساسانی، طغان شاہ دکن، نوشیرواں فارسی، امیر تیمور، شاہجہان، ہمایوں، اورنگ زیب عالمگیر، بابر، جہاں گیر، اکبر، عمر شیخ ابن ابو سعید، سلطان محمد ابن میراں شاہ، نادر شاہ وغیرہ۔

شاہزادوں میں دارا شکوہ، مراد بخش، شجاع اور کئی دوسرے شاہزادوں اور مغل شاہزادیوں کی تصویریں شامل ہیں۔

بزرگان دین اور اہل اللہ میں حضرت اویس قرنیؒ، خواجہ حسن بصریؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ حضرت علی الہجویریؒ (داتا گنج بخش)، ابراہیم بن ادہم، سید جلال سرخ بخاریؒ، شیخ نظام الدین محبوب اولیاؒ دہلویؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، مخدوم شیخ راجوؒ، لعل شہباز قلندرؒ، شاہ رکن عالمؒ، سید عبدالوہاب گیلانیؒ، شیخ صدرالدینؒ، میاں میرؒ شاہ دولہؒ، شیخ محمد کیمیا نظر بخاریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شاہ ابو المعالیؒ، شاہ شرفؒ، شیخ محمد حامد محمد گنج بخشؒ ثالث بانی قلعہ اوچ اور سکھوں کے مشہور مذہبی پیشوا گورو ارجن۔

شعرا میں شیخ سعدیؒ، مولانا رومیؒ، شمس تبریزیؒ، امیر خسروؒ، حافظ شیرازیؒ،

مولانا جامیؒ اور شوکت بخاریؒ۔ یہ تصاویر دسویں اور بارھویں صدی کے مصوّروں کے وہ فنی شاہکار ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ اہل فن ہی کر سکتے ہیں۔

دیگر فنی کتب اوچ گیلانی کی لائبریری میں موسیقی، سپاہ گری، عملیات و تعویذات، نجوم اور آثار قدیمہ پر بھی بعض بیش قیمت مخطوطات محفوظ ہیں۔

موسیقی میں سماع الالحان، تحفۃ الابرار، مونس العشاق، رسالہ راگ ہندی، مقامات ہندی و فارسی اور ابوالنغم جیسے عمدہ رسالے موجود ہیں۔ سپاہ گری میں کسی گم نام مصنف کا لکھا ہوا ایک رسالہ موجود ہے۔ آغازِ رسالہ اس عبارت سے ہوتا ہے۔

"بدانکہ ایں رسالہ در باب سپاہ گری حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرمودہ ہر کہ مر سپاہی باشد باید کہ ایں چند کلمہ یاد کردہ با خود دارد۔"

علم جغرافیہ پر ایک کتاب معلومات الآفاق ملتی ہے جسے امین الدین خاں سید ابوالمکارم امیر خاں مرحوم حسنی الہروی نے مرتب کیا ہے۔ یہ ۱۰۸۰ھ میں لکھی گئی۔ نجوم و ہیئت و افلاک و ہندسہ پر چند رسالے خواجہ نصیرالدین طوسی کے یہاں موجود ہیں۔ اس پر "علی ابن ابی طالب" کی مہر ثبت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب مشہور فارسی شاعر علی حزیںؔ[1] کے پاس رہی ہے۔ علم جفر اور فالناموں پر بھی یہاں کئی ایک نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔ رمل کے فن پر حقائق الرمل نام کی ایک کتاب بھی موجود ہے۔ شکاریات کے موضوع پر ایک بے نام رسالہ حسین الحسنی الطیبی کا جس کا خطاب صدر جہاں تھا یہاں موجود ہے۔ کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

"سپاس بے قیاس و شکر مدحت اساس پادشاہی را سزاوار است کہ مرغابیاں دلہائے عارفاں آگاہ شعار باز بلند پرواز او بند آہوان شیر گیر سیاہ چشماں فریبندہ نگاہ صید کمند انداز داؤ"

ایک کتاب "دستور الصید" ہے۔ ایک رسالہ "باز نامہ" ہے۔ پرندوں کی پرورش اور ان کی مختلف بیماریوں کے علاج معالجہ کے باب میں بھی کئی قلمی رسالے یہاں موجود ہیں۔ گھوڑوں کی قسموں اور ان کی خوبیوں اور دیگر خواص نیز ان کی بیماریوں کے

---

[1] حزیںؔ کا نام علی اور اس کے باپ کا نام ابوطالب تھا۔

بارے میں ایک رسالہ خیل نامہ کسی گمنام مصنف کا یہاں موجود ہے۔ غرضیکہ ایک چمنستان بوقلمون اور ایک گلستانِ لفظ و معنی ہے جو اوچ گیلانی کی علمی اور تاریخی عظمت کا داستان سرا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان علمی نوادر اور ان تاریخی شاہکاروں کی طبع و اشاعت کا مناسب اہتمام کیا جائے تاکہ یہ قومی خزانہ محفوظ رہ سکے اور علم پدر سے بے بہرہ قوم کہیں میراث پدر سے یکسر محروم نہ رہ جائے۔

میراثِ پدر خواہی علمِ پدر آموز

اوچ گیلانی کے اس وافر علمی ذخیرہ کے پیشِ نظر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اوچ بخاری کے مخادیم کے پاس زیادہ علمی سرمایہ محفوظ ہوتا اس لئے کہ قدامت کے اعتبار سے ان دونوں خانوادوں میں موخرالذکر کو کم و بیش ڈھائی تین سو برس کی اوّلیت و اقدمیت کا شرف حاصل ہے لیکن ہم پہلے یہ نوحہ خوانی کر چکے ہیں کہ اوچ بخاری کا بیشتر سرمایہ دست بردِ حوادث کا شکار ہو کر برباد ہو چکا ہے۔ جو کچھ باقی بچا وہ بھی بے احتیاطی کی وجہ سے اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھا۔ اب چند ایک مخطوطات ہیں جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات و ارشادات پر مشتمل ہیں مگر ان میں سے بیشتر ناقص ہو چکے ہیں۔

ہم نے اوچ بخاری کی لائبریری کے بعض نادر و نایاب مخطوطات، شاہی فرامین اور دیگر قیمتی دستاویزات کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے، جو انتہائی خستہ و خراب حالت میں لکڑی کے ایک بڑے صندوق میں پڑے سڑ رہے ہیں اور جن لوگوں کو اس کی تولیت سپرد ہے وہ نہ اس کی تاریخی حیثیت سے واقف ہیں نہ علمی حیثیت سے۔ ان حالات میں اوچ بخاری کے ان علمی نوادر سے استفادہ نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

ویسے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات کے دیگر بہت سے نمونے برِّ صغیر کے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ ان کے فرامین و ارشادات کا ایک بڑا ذخیرہ جامع العلوم ہے جس کا اردو ترجمہ الدر المنظوم کے نام سے دہلی

سے چھپ چکا ہے اور اسے کسی بھی اچھی لائبریری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اوچ بخاری میں ان چند ایک

کتابوں کے علاوہ ایک مترجمہ قرآن پاک بھی ہے، ترجمہ فارسی میں ہے اور غالباً پانچویں یا چھٹی صدی ہجری کے کسی بزرگ کا لکھا ہوا ہے۔

اوچ بخاری میں بابا گورو نانک کی کھڑاؤں بھی ہیں۔ بابا صاحب سکھوں کے مشہور مذہبی پیشوا تھے۔ سکھ دھرم کے بانی بھی وہی تھے۔ ممکن ہے وہ اپنی جہاں گردی کے دوران بزرگان اوچ سے اکتسابِ فیض کے لئے یہاں حاضر ہوئے ہوں۔ ان کے متعلق یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ مرنجان مرنج اور صلح کل بزرگ تھے۔ ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف دونوں سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ ان کے خیالات وافکار پر جو گرنتھ صاحب کی شکل میں موجود ہے ان دونوں فلسفوں کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اور وہ اپنے عقائد کے اعتبار سے اسلام کے بہت زیادہ قریب تھے۔ ان کی گرنتھ کا پہلا شعر ان کی خوش عقیدگی کا مظہر ہے۔

اوّل نام خدا دا جانوں دوجا نام رسولؐ
تیجا کلمہ پڑھ لے نانکا جو درگاہ پوے قبول

اوچ کی زبان

اوچ کی بستی کے متعلق ہم پہلے ہی اچھی طرح وضاحت کر چکے ہیں کہ اس کی تاریخ کا آغاز آریائی عہد کے بالکل ابتدائی دور سے ہوتا ہے جب دریودھن کی بہن رانی دھسلا کی حکمرانی تھی اور اوچ اس کا پایہ تخت تھا۔ آریائی قوم کی زبان سنسکرت تھی۔ اگرچہ اس علاقہ میں بسنے والی دو مشہور قوموں جاٹ اور میدکی زبان سنسکرت سے مختلف تھی تاہم سیاسی غلبہ کی بدولت سنسکرت کو یہاں فروغ حاصل ہوا۔ وید مقدس کی روایت کے مطابق رانی دھسلا کے ساتھ برہمنوں کی ایک جماعت بھی آئی جس نے اس علاقہ میں ہندو مت کی تبلیغ و اشاعت کی۔

مقامی زبانوں کے ساتھ سنسکرت کے باہمی اختلاط سے کئی علاقائی زبانوں نے جنم لیا۔ چنانچہ حسب ذیل زبانیں وجود میں آئیں۔ ہندی، سندھی، گجراتی، مارواڑی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی اور ملتانی۔ اکبر کے مشہور درباری عالم ابوالفضل نے کشمیری اور افغانی زبانوں کو بھی سنسکرت ہی کی پیداوار بتایا ہے مگر ہمیں ابوالفضل کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیری اور افغانی دونوں زبانیں آریائی کی بجائے سامی زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ؎

مذکورہ بالا زبانوں میں سے ہندی اور سندھی نسبتاً زیادہ قدیم زبانیں ہیں۔ اسی

طرح پنجابی بھی قدامت میں کسی طور کم نہیں ہے۔ سندھ اور پنجابی کے اختلاط سے ایک زبان پیدا ہوئی جو ملتانی کہلائی۔ یہی حال اور زبانوں کا ہے کہ ان کے آپس کے خلط ملط سے کئی دوسری زبانیں پیدا ہوتی چلی گئیں۔

ملتانی زبان مختلف احوال و ظروف کے اعتبار سے مختلف ناموں سے مشہور ہوئی۔ ڈیرہ غازی خاں اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں اس زبان کو ڈیرہ والی پشاور کے علاقہ میں ہندکو کشمیر میں گجری، مظفر گڑھ میں مظفر گڑہی، اوچ میں اوچی اور ملتان میں ملتانی کہا جانے لگا۔ اس زبان کا ایک معروف نام "سرائیکی" بھی ہے۔ سرائیکی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ بعض لوگوں کی دانست میں اسے یہ نام ملتان اور سندھ کے ایک سرحدی شہر" سرادا " کی نسبت سے حاصل ہوا۔ سرائیکی نام کی ایک توجیہہ یہ بھی کی گئی ہے کہ چوں کہ زمامِ حکومت ملتان والوں کے ہاتھ میں تھی ان کے محل سراؤں میں جو زبان مستعمل تھی اسے اس مناسبت سے سرائیکی کہا جانے لگا۔

ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ عربوں کے دورِ فتوحات میں سندھ اور ملتان سے نکل کر ایران و عراق تک مسافروں کی سہولت کے لئے جا بجا سرائیں بنی ہوئی تھیں ان میں مختلف ملکوں کے لوگ آ کر قیام پذیر ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے باہمی میل ملاپ سے ایک نئی زبان کا ڈھانچہ تیار ہوا جو ہندی، سندھی، عربی اور فارسی کا ایک ملغوبہ تھی اور اسے سراؤں کی پیداوار ہونے کے باعث سرائیکی کہا جانے لگا۔

چرچ مشن ملتان کے ایک پادری ریورنیڈ بمفورڈ (۱۸۹۵ء) نے اوچ کے کسی ہندو عالم سری رام کالشتھ کا تذکرہ کیا ہے جو بڑا فاضل شخص اور کئی کتابوں

لہ بعض محققین کی رائے میں کشمیری اور افغانی دونوں اسرائیل نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ حوالہ کے لئے دیکھئے خواجہ کمال الدین کی کتاب (Christ in heaven on earth)

کا مصنف تھا۔ اس کے نام کی رعایت سے یہ زبان سری رام پوری کہلائی اور بعد میں بگڑ کر یہ سرائیکی بن گئی۔

بہر حال اس کے نام کی ان وجوہ سے قطع نظر یہ طے ہے کہ ملتانی زبان اوچ کی قدیم ترین زبان ہے اور ہندوؤں کے غلبہ کے دوران اس کا رسم الخط دیو ماگری تھا جو ہندی کی نسبت گجراتی سے زیادہ قریب تھا۔

سنسکرت کے بطن سے جو زبانیں وجود میں آئیں ان کا رسم الخط یہ ادنیٰ تغیر ایک سا رہا ہے اور اس رسم الخط کو دیو ماگری رسم الخط کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں سے سندھی کو مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کی بدولت عربی رسم الخط میں لکھا جانے لگا اور اب تک سندھی کا یہی رسم الخط رائج ہے۔ دوسری زبانوں کے طرزِ تحریر میں چند ادنیٰ اور معمولی تبدیلیوں اور لفظوں کی بناوٹ میں تھوڑے بہت فرق کے سوا اور کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ گجراتی اور ہندی رسم الخط میں جو اختلاف ہے وہ ایک تو اس لکیر کا ہے جو ہندی اکھروں کے اوپر کھینچی جاتی ہے۔ اور اس طرح پوری تحریر کو مربوط رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ گجراتی میں یہ لکیر نہیں ہے۔ اوچی اکھروں میں بھی یہ لکیر موجود نہیں۔ گجرات اور اوچ کے طرز تحریر میں اس مماثلت کا بڑا سبب یہ رہا ہے کہ ملتان، اوچ، گجرات اور سندھ کا علاقہ از منہ وسطی میں سیاسی اور جغرافیائی وحدت تھا۔ قیاس ہے کہ پہلے زمانہ میں سندھی زبان کا رسم الخط بھی یہی رہا ہو گا۔ اوچی اور گجراتی اکھروں میں تھوڑا بہت فرق تو ضرور ہے مگر ایسا اہم فرق نہیں ہے کہ انہیں دو الگ الگ رسم الخط قرار دیا جائے۔

اوچی رسم الخط

الف w	ب ч	بھ 3	پ 4	پھ ч	ٹ 3
ٹھ ч	ڑ ∠	د 3	ڈ v	دھ u	ج U
چھ 8	ج 3r	جھ 3	ر 8	ک 2	کھ J
ل ×	م n	ن n.	ناں n	س 3	گھ ч
گ ɣ	ٹر 2	ہ S	و ٤	او ɒ	ای 6

اوچی اور گجراتی رسم الخط میں چند الفاظ کی تحریر کا چارٹ، درج ذیل ہے جس سے ان کی مماثلت اور ان کا فرق واضح ہوتا ہے۔

	اوچی	گجراتی
درگاہ	38x15	દરગાહ
پیر صاحب	768515ч	પીર સાહેબ
محمد	nsnn3	મોહમ્મદ
حضرت	s3x3	હઝરત
شاہ	315	શાહ
شریف	3x64	શરીફ

گجراتی اور اوچی میں ب گ پ بالکل ایک جیسے ہیں۔ دوسرے حروف ہیں

بھی بہت حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ حروف علت ای، او بھی ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں "د" الٹ لکھا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے اوچی زبان کی کوئی مربوط عبارت نہیں ہے ورنہ ان میں باہمی مشابہت کے اور پہلو بھی نمایاں ہو سکتے تھے۔

اس امر کے بے شمار ثبوت موجود ہیں کہ عربوں کے عہد میں اور پھر ایرانیوں اور مغلوں کے دور حکومت میں یہاں کی سرکاری اور رسمی زبان عربی رہی تاہم مقامی زبان وہی تھی جو آج بھی اس علاقہ میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔

نور نامہ جو ملتانی زبان کا قدیم ترین منظوم رسالہ ہے اس کی زبان معمولی تغیرات سے قطع نظر آج بھی وہی ہے جو ملتان واوچ میں مستعمل ہے۔ اس کتاب کی اپنی شہادت اس کے لب ولہجہ اور اس کے اسلوب بیان کی رعایت سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے بالکل ابتدائی دور میں لکھی گئی۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ آٹھویں صدی ہجری کے نامور بزرگ تھے۔ ان کے کئی ملفوظات بھی اس زبان میں ملتے ہیں۔ ہم یہاں ملتانی زبان و ادب کے قدیم نمونوں میں سے چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں۔

مولانا ابو ظفر ندوی مرحوم کی "تاریخ سندھ" میں عربی عہد کے ایک بزرگ ہارون بن عبداللہ ملتانی کا تذکرہ ملتا ہے جو ملتانی زبان کے شاعر تھے اور اپنے جنگی کارناموں کو مقامی زبان میں نظم کیا کرتے تھے۔[۱]

نور نامہ کے بارے میں "پنجاب میں اردو" کے نامور مصنف حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اسے گیارھویں صدی ہجری کی تصنیف قرار دیا ہے لیکن خود رسالہ میں شاعر نے اپنا عہد چھٹی صدی ہجری بتایا ہے۔ غالباً "نور نامہ" کے یہ اشعار حافظ صاحب موصوف کی نظر سے نہیں گزرے۔

---

[۱] عراقی نام کے ایک سندھی عالم نے ۲۷۰ھ میں قرآن مقدس کا ترجمہ سندھی زبان میں کیا۔ برصغیر ہند وپاک میں

بنج سے سال جو گزرے آہے ہجرت بعد رسولں
ملاں کہے غریب وچارا کم علماواں کرولں ! !
نیکی عمل نہ کیتم کوئی شامت نفس جھولں
عمر گزری تو پچھوں تاواں بھر لیہاں قبولں
جو کچھ روئے زمین تے پیدا سب کجھ ہوسی فانی
نام نشان نہ رہسی کائی جز ایمان نشانی

شاعر کے اس بیان کی تکذیب کے لئے ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس کی زبان میں کچھ تغیّر ضرور ہوا ہے اور غالباً امتداد زمانہ کے باعث بعد کی تحریف و ترمیم کا نتیجہ ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے بعض ایسے ملفوظات ملتے ہیں جو ملتانی زبان میں ہیں۔ حضرت موصوف کی ولادت ۵۶۹ھ میں ملتان کے ایک مضافاتی گاؤں کوٹھوال میں ہوئی۔ آپ نے ایامِ ریاضت کا کچھ عرصہ اوچ کی مسجد حاجات میں بھی گزارا ہے اور اس کے ملحقہ کنویں میں نمازِ معکوس ادا فرمائی ہے۔ اس دوران ایک کوّا آپ کے اوپر آ کر بیٹھا اور آپ کے جسم پر چونچیں مارنے لگا۔ جب اس نے آنکھ پر چونچ مارنی چاہی تو آپ نے یہ شعر پڑھا[۱]

کاواں کرنگ ٹکیندیاں سب چن کھائیو ماس
ایہ دو نین مت کھائیو مِن دی ہاسے آس

جب آپ اجودھن (پاک پٹن) پہنچے اور وہاں سکونت اختیار فرمائی تو لوگوں کی مردم ناشناسی کو دیکھ کر فرمایا

بلکہ پوری دنیا میں قرآنِ مقدس کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو عربی سے کسی دوسری زبان میں کیا گیا اور اولیت کا یہ شرف سندھ کے خطہ کو حاصل ہوا۔ اوچ اس زمانہ میں سندھ کا حصہ تھا اس لئے یقین ہے کہ وہ ترجمہ یہاں بھی متداول رہا ہوگا۔

[۱] گلزار فریدی، ملفوظات حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ مرتبہ گل محمد شیرودی متوفی ۱۲۷۸ھ قلمی نسخہ۔

فریدا اٹھاں ٹکٹے جتھاں وستن اُٹھے !
نہ کو ساکوں جانے نہ کو ساکوں منّے !

حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر سال حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت میں بطور تحفہ گاجریں بھیجا کرتے تھے اور حضرت خواجہ فرید پاکپتن کی بیریوں کے بیر ارسال فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ گاجروں کا تحفہ وصول نہ ہوا تو آپ نے بھی بیر نہ بھیجے اور یہ شعر لکھ بھیجا۔

ہتھڑیں وٹوں ہتھڑے پیراں وٹوں پیر
تساں نہ گھتیاں گاجراں اساں نہ گھتے بیر [۱]

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے بے شمار ملفوظات اسی زبان میں متفرق کتابوں میں ملتے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایک قلمی رسالہ "مناقب برہانی" ہے جس کی ایک نقل احمد آباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں موجود ہے۔ مناقب برہانی دراصل حضرت قطب العالم برہان الدینؒ کے حالات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے جسے انہی کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید عبداللطیف[۲] مرحومؒ نے ترتیب دیا ہے۔ حضرت قطب العالم برہان الدین حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پوتے تھے مناقب برہانی میں مذکور ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنی سیاحت گجرات کے دوران جب بٹوا پہنچے تو آپ نے اسی جگہ قیام فرمایا جہاں آجکل حضرت قطب العالم کا مزار ہے آپ نے اس جگہ فرمایا۔

"ایتھاں اساڈے ہاڈاں دی خوشبو ہے"

---

[۱] حضرت خواجہ فریدؒ کے یہ اشعار ٹھیٹھ ملتانی یا سرائیکی زبان میں ہیں۔ سات سو برس پہلے کی یہ زبان اوچؒ کی موجودہ زبان سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ مذکورہ بالا تینوں اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر نظر ڈالیے باوجودیکہ ان شعروں کا انداز ہندی کا سا ہے مگر محولا بالا خط کشیدہ الفاظ سرائیکی کے ہیں اور ان کا لب ولہجہ بھی وہی ہے۔ [۲] سید عبداللطیفؒ کا مزار بٹوا ضلع احمد آباد میں اپنے جد اعلیٰ حضرت قطب العالم

اپنے ایک مرید خاص کو ایک موقعہ پر آپ نے مخاطب ہو کر فرمایا

" اساں وی جہانیاں تساں دی جہانیاں"

اپنے چھوٹے بھائی سید صدرالدین راجن قتال کو آپ نے پیار بھرے لہجہ میں فرمایا " اساں خوجے تساں راجے "

حضرت مخدوم جب دہلی تشریف لے گئے تو آپ نے بادشاہ فیروز تغلق کے بارے میں استفسار فرمایا۔

کاکا فیروز چنگا ہے۔

(کاکا ملتانی زبان میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں)

حضرت قطب العالم برہان الدینؒ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے اپنے ایک فرزند کی پیدائش پر فرمایا تھا۔

" اساں تھیں وڈا تساں تھیں وڈا مخدوم جہانیاں آیا " [1]

آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں سرائیکی زبان کا ایک اور فقرہ ہماری نظر سے گزرا ہے جو ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ سندھی اور سرائیکی میں کچھ زیادہ تباعد نہیں ہے اور دوسری طرف اس عہد کی مروجہ زبان پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے محمد تغلق نے سندھ پر ۷۵۲ھ میں حملہ کیا۔ ابھی وہ

برہان الدین کے مزار کے احاطے سے باہر جانب مغرب واقع ہے مناقب برہانی کا سن تصنیف غالباً دسویں صدی ہجری ہے

[1] حضرت قطب العالم برہان الدین دس گیارہ برس کی عمر میں اوچ سے گجرات تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور شہر پٹن میں فروکش ہوئے۔ آپ کے ساتھ آپ کی والدہ ماجدہ بھی تھیں اور ایک خادم بھی ہم رکاب تھا۔ آپ کا ملتانی زبان میں گفتگو کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ اپنے آبائی وطن کی زبان سے واقف تھے اور یہ وہی زبان تھی جو اوچ میں آج بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ حضرت قطب العالم کا سن پیدائش ۷۹۰ھ ہے گویا آٹھویں صدی ہجری میں بھی اس زبان کا لب ولہجہ اور اس کی ہیئت موجودہ سرائیکی سے ہرگز مختلف نہ تھی تاہم ان بزرگوں کی علمی زبان فارسی اور عربی تھی۔

ٹھٹھہ کو فتح کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا کہ پیغام اجل آگیا اور وہ فتح سندھ کی حسرت لئے دنیا سے رخصت ہوگیا۔

محمد تغلق کے بعد فیروز تغلق نے از سر نو سندھ پر حملہ کیا لیکن قحط اور وبا کے ہاتھوں اسے بھی اس ارادے کی تکمیل سے باز رہنا پڑا اور وہ مجبوراً محاصرہ سندھ سے دست کش ہوکر گجرات کی جانب چلا گیا۔ اس موقع پر سندھیوں نے یہ فقرہ کہا۔

برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا۔

بعض روایتوں میں یہ فقرہ یوں ہے

برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا۔

شمس سراج عفیف نے اس فقرہ کو اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں نقل کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

شیخ کی برکت سے ایک مرگیا اور دوسرا بھاگ نکلا۔

راقم الحروف کی رائے میں کتابت کی غلطی سے اس فقرہ کی عبارت میں کچھ جھول پڑ گیا ہے۔ اصل فقرہ یوں ہونا چاہئے۔

برکت شیخ ٹھٹھا اک موا اک نٹھا۔

ٹھٹھہ کے بزرگ شیخ کی برکت سے ایک مرگیا اور ایک بھاگ گیا۔ ممکن ہے اس زمانہ میں ٹھٹھہ میں کوئی ایسی بزرگ شخصیت موجود ہو جن کے بارے میں سندھی یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ ان کی برکت سے دشمن خوار و زبوں ہوا۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اس فقرہ کو ہندی کا فقرہ قرار دیا ہے لیکن ان کی یہ رائے صائب نہیں ہے۔ یہ فقرہ سندھی ہی کا ہے مگر چونکہ سندھی اور ہندی دونوں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہیں اس لئے ان میں لفظی اشتراک ممکن ہے یہی حال سرائیکی کا ہے۔

بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اردو زبان سرائیکی سے وجود میں آئی۔ در اصل اردو ہندوستان کی تمام زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے اور اس

کی ہیئت و ترکیب پر سرائیکی سے زیادہ ہندی کا اثر غالب ہے تاہم اتنا تسلیم ہے کہ اردو سرائیکی سے بھی متاثر ہوئی ہے۔ اردو میں " ہلنا جُلنا" مستعمل ہے اور بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ " جُلنا " جسے ہم " ہلنا " کا تابع مہمل سمجھتے آئے ہیں وہ در اصل سرائیکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی چلنے کے ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے قید ہونے کا واقعہ نظم میں لکھا ہے انہیں تورانی لشکر نے ملتان میں گرفتار کیا اور قیدی بنا کر لے جایا گیا اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں

من کہ بر سرنمی نہادم گل   بار بر سر نہاد و گفتا جل

یہ " جل " آج بھی ملتانی سرائیکی میں چل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (میں کہ جس نے کبھی سر پہ پھول کا بوجھ بھی نہیں اٹھایا تھا اس نے میرے سر پہ سامان رکھ کر کہا کہ چل)

نور نامہ کے حسب ذیل اشعار ملتانی زبان کا اچھا نمونہ ہیں۔ اگرچہ تحریف و تغیر سے کوئی سا شعر بھی بچ نہیں سکا۔

شرم کنوں ڈوں اکھیں پیدا رنگ بہشتی عنبر
عبرت دے ڈوں کن سنوارے نبی رسول پیغمبرؐ
ڈوں لب نبی محمدؐ سندے پیدا از تسبیحاں
ذکر خدا زبان سنوارے ایہ حدیث صحیحاں

ان اشعار کی زبان بتا رہی ہے کہ یہ تحریف لفظی کا شکار ہوئی ہے اس لئے کہ اس میں وہ ہم آہنگی اور یکسانیت موجود نہیں جو ایک ہی زبان میں کہی گئی نظم میں ہونی چاہئے چنانچہ یہ قیاس کچھ غلط نہیں ہے کہ اس کی اصل زبان جو ٹھیٹھ ملتانی تھی اسے پنجاب کے بعض ناشروں نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر عام فہم اور آسان بنا کر اس کی اصلیت Originality کا سارا حسن اور اس کی تمام دلکشی ختم کر دی۔ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں سومروں کے حکمران جمبر کی ہجو میں کہے ہوئے اشعار کا سراغ ملتا ہے جو اوچ کی قدیم زبان کی صحیح نشان دہی کرتے ہیں۔ راجہ ہمیر (جمیر) کا دارالحکومت پتی پور تھا جو پتن منارا کے نام سے آج بھی

معروف ہے اور جس کے کھنڈر آج بھی زبانِ حال سے اپنی عظمتِ رفتہ کی داستان دہرا رہے ہیں۔ پہلے ان اشعار کا پس منظر سن لیجئے۔ ایک چرن جسے لوگ سوامی کہتے تھے اسے پتن پور کی ایک ہمسایہ حکومت کے راجہ نے چند گھوڑے بطور انعام دیئے۔ وہ سوامی جب ان گھوڑوں کو لے کر خوشی خوشی پتن پور پہنچا تو راجہ ہمیر یا اس کے وزیر دھوڑا رائے کے ایما سے یہ گھوڑے چرا لئے گئے اس واقعہ سے متاثر ہو کر سوامی نے یہ اشعار کہے جو بہت جلد عوام میں پھیل گئے: راجہ ہمیر کا سنِ وفات ۵۲،۵ ہے۔ یہ اشعار آج سے سات سو برس پرانے ہیں۔ سوامی کہتا ہے

دھاڑی دھوڑا رائے جینہہ چرن سانکھیا
پتن پیٹھیو تھیو سیج وٹایو راہ
ہمیرا پورا راج نہ کند اسمرا [1]

آٹھویں صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک کا دور ایسا ہے جس میں کسی قابل ذکر ملتانی ادیب و شاعر کا تذکرہ نہیں ملتا تا آنکہ گیارھویں صدی ہجری [2] میں مولوی عبدالحکیم اوچی کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ انہوں نے بارھویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں اپنی معرکہ آرا کتاب یوسف زلیخا کی تصنیف کی یہ ایک داستان منظوم ہے اور فارسی میں مولانا جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کے بعد اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو برِ صغیر کی کسی زبان میں قلم بند ہوئی۔ یہ شرف اوچی یا ملتانی زبان کو حاصل ہوا اور یہ اعزاز بھی اوچ ہی کے ایک

---

[1] دھوڑا رائے (وزیر) لٹیرا ہے جس نے چرن کو لوٹ لیا۔ پتن تباہ ہو جائے اور دریا اپنا رخ اس بستی سے تبدیل کرلے اور ہمیرا سمرا پوری مدت تک داد حکومت نہ دے سکے۔

[2] گیارھویں صدی ہجری میں شیخ عبداللہ لاہوری نے جو مولانا عبدی کے نام سے معروف ہیں، کئی منظوم رسالے لکھے۔ یہ رسالے پنجابی زبان میں ہیں مگر اس پر سرائیکی زبان کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ مولانا عبدی کی تصنیفات کا موضوع زیادہ فقہی مسائل ہیں۔

باشندے کو نصیب ہوا۔

مولوی عبدالحکیم اوچ کے رہنے والے تھے۔ یہی سرزمین ان کی جنم بھومی اور ان کا آبائی وطن تھا وہ خود لکھتے ہیں۔

اُچاں وچ مصطفےٰ لائی میری پاڑ ۔۔۔ ہیں عباسی قریشی شیخ ہاں لاڑ
اُچاں وچ ہے میرا اصلی ٹکانہ ۔۔۔ وچ احمد پور دے مشہور ٹھانہ

مولوی عبدالحکیم کی یوسف زلیخا کے چند منتخب اشعار بطور نمونہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

چلو عبدالحکیماں طرف بازار ! ! ۔۔۔ توں بھی یوسف دا ہو جاویں خریدار
لے آئیں تا زلیخا نوں دیوایں ! ۔۔۔ دل اس دا ماہ سون روشن کرا ہیں !
جو شاید تا کرے ساڈوں دعائیں ۔۔۔ میرا مطلوب بھی ربا دیوا ہیں!
جدوں یوسف دا ہویا گرم بازار ۔۔۔ ہوئے خورشید دے لکھاں خریدار

ویکن ایہ خیانت نہ کریساں ۔۔۔ ایہو ٹکا مُتھے اپنے نہ لیساں
اسی گل تے مرا دل نا کھڑ دسی ! ۔۔۔ جو میتھوں ایہ سخن مولی نہ ہوسی

اکھن یارو کوئی تدبیر کیجئے ۔۔۔ کدی باہر مریجے یا ردیجے

مگر یک طور ہیں تھوں یاد رکھنا ۔۔۔ گینے تے اصیلاں نوں پرکھنا

وسنے راتیں گزاریں اس طرح نال ۔۔۔ نہ ہووس دور دل سون یار دا خیال

مولوی عبدالحکیم اوچی کے ہم عصر ملتانی زبان کے ایک نامور اور نادرالکلام شاعر مولوی لطف علی تھے جو ملتان کے باشندے تھے مگر انہوں نے بہاولپور کو اپنا مسکن بنا

لیا تھا اور نواب بہاول خاں کے درباریوں کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کی ایک معرکہ آرا کتاب سیف الملوک ہے جو سرائیکی زبان و ادب کا شاہکار تسلیم کی گئی ہے۔ مولوی لطف علی مرحوم نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح کی منقبت بھی اسی زبان میں لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرد نجیب حبیب سچے سبحان دا   در دستار محمد عالی شان دا
گل گوہر دل بند علی سلطان دا
تول فرزند حسینؓ شہید جوان دا

واہ پُر نور جلالی آپ جناب اے   کرن تعریف تنہاں دی بہت ثواب لے
وچ ہر ملک منور جون آفتاب اے
سیر کیتیاں توُ ہر زمین آسمان دا

رہن حضور ہزار پریاں ہن باہنیاں   حوراں ہم رخ ڈیکھ تھیاں ستانیاں
کہن سدا سردار جلال جہانیاں
شام سحر ہر ویلے ورد زبان دا

چو رُخ پیر گھمائے پیر زمین تے   تھی چودھار عمارت ودھی دین تے
ہر جا کرم کتونے میں مسکین تے
باغ کھلیا چو طرف تیرے احسان دا

شرف ڈتا رب شان وڈا سادات کوں   موج مراتب رتبہ عالی ذات کوں
شاعر کرے شمار توڑے ڈینہہ رات کوں
نہیں انتہاں ہے پچھن شرح بیان دا

ساتویں، آٹھویں، گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے نثر و نظم کے یہ چند نمونے جو ہم نے یہاں پیش کئے ہیں اس امر کی دلیل ہیں کہ اوچ کی قدیم زبان وہی سرائیکی تھی جو مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکاری گئی اور اسی زبان کا ایک نام اوچی بھی ہے اور درحقیقت یہ نام اس اعتبار سے بڑی موزونیت کا

حاصل ہے کہ پہلے پہل سنسکرت بولنے والوں نے اوچ ہی کو اپنا صدر مقام بنایا مقامی بولیوں کی آمیزش سے زبان کا جو سانچہ یہاں تیار ہوا اسی نے آگے چل کر ملتانی یا سرائیکی کا روپ دھارا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ملتانی یا سرائیکی زبان کا اصل ماخذ و منبع اوچ کی سرزمین ہے۔

سرائیکی بڑی وسیع زبان ہے اس میں مترادفات، محاورات، ضرب الامثال اور ترکیبات کی اس قدر بہتات ہے کہ اسے دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک بد شکل اور بد ہیئت لڑکی کے سراپا کو مولوی لطف علی پیش کرتے ہیں اور الفاظ کے در و بست سے اس کی کیسی صحیح تصویر کھینچتے ہیں۔ صرف ان چند شعروں سے زبان کی وسعت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

بھئی بد حال ہتھائی کانی زنگالی منہ کالی
سر بد ڈول قد آدر کناوات عظیم کنالی
بینی گرم دکان ڈسے ہس ہر ہک ناس کٹھالی
ڈیکھ ڈراکل ڈنڈاوندے خود تھیوے خجل ڈندالی
بنڈر خوب کلہوٹے چھوٹے پیٹ بلند برالی
جھلے ہاں غریباں دا جاڈیوے ڈین ڈکھالی
بھن ہزار کھمیاں دے منہ تے ڈیکھ اوبدین بد حالی
بھڑدی دھکڑی خچری نظرے پھردی ڈنگ ڈیوالی
دوزخ شکل دکھالی ڈینڈی ویندی بال پچالی
لوشن لوڈ لٹور دھرلنڈی ڈسے سراسر گالی
ہے تکرار جنیں دی نانی یا سسم روحین والی
ہر گانے تے زیور باجھوں پھردی کونتل خالی
تھئی عاشق شہزادے تے بہ بھوں کرے ذوالحالی
اوجھی کو جھی کملی کالی کان وصال اوبالی

موضوع زیر بحث میں علم الالسنہ پر بحث ہمارا مقصود نہیں ہے بلکہ ہم صرف یہ بتانا چاہتے تھے کہ اوچ کی قدیم زبان وہی ہے جو آج بھی اس علاقہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر الفاظ میں کچھ تبدیلی آئی ہے یا کوئی فرق پڑا ہے تو وہ بہت کم اور بالکل برائے نام سا ہے اور بہت تھوڑے الفاظ اس زبان کے ایسے ہوں گے جو اب متروک قرار دیئے جا چکے ہوں گے ورنہ صدیوں پہلے کی روایت اور آج کے روزمرہ میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی اور کوئی غیر معمولی فرق نظر نہیں آتا۔

سیاہ حبشی بڑی بدشکل ہتھنی کی طرح ڈھنگی اور کالی سیاہ تھی۔ اس کا بے ڈھنگا سر سیاہ رنگ کے بڑے مٹکے کی طرح تھا اور اس کے منہ کا دہانہ بڑی کنالی (آٹا گوندھنے کا برتن) کی مانند تھا۔ اس کی ناک کسی لوہار کی بھٹی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتھنے پگھلی ہوئی دھات سے بھری ہوئی دو کٹھالیاں تھیں۔ اس کے پیلے پیلے دانت دیکھ کر گوبر اور کوڑا کرکٹ کھینچنے والی دندالی بھی شرما جاتی تھی۔ اس کے کولہے اناج بھرنے کے دو مٹکے تھے اور اس کا پیٹ مٹی کی بہت بڑی الماری کی شکل کا تھا۔ جب وہ ڈائن نظر آتی تھی تو کمزور لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کی بری شکل کو دیکھ کر ہزاروں مکھیاں اس کے منہ پر بھنبھناتی رہتی تھیں۔ وہ برے کام میں مدد دینے والی، دلالی کرنے والی، بیہودہ بکنے جھکنے والی اور بے ڈھنگم طریقے پر راستہ چلنے والی تھی۔ وہ جن دوزخ کی سی شکل وصورت کی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر جگر کباب ہو جاتا تھا۔ آوارہ بال پھٹے ہوئے، آوارہ گرد اور بے رعب اور پاگل نظر آتی تھی۔ لوگ اس بات پر بحث کرتے تھے کہ یہ جنات کی نانی ہے۔ پہاڑوں میں رہنے والی غم ہے۔ وہ زیورات سے عاری تھی اور بے دنار گھومتی رہتی تھی۔ وہ بد زیب کریہہ المنظر، کالی کلوٹی اور پاگل شہزادے پر عاشق ہو کر روتی رہتی اور اس کے وصل کے لئے سخت بے چین تھی۔

اوچ کی اقوام

سابقہ ریاست بہاولپور کے علاقہ میں جو قومیں آج بھی آباد ہیں تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قومیں اس علاقہ میں ظہور اسلام کے اوّلیں دور میں بھی موجود تھیں۔ تاریخ لب سندھ کے مصنف لکھتے ہیں۔

"و ہم چناں مردمان اقوام لوہانہ و سہتہ و چندر و ماچھی و کوریجہ کہ ایں اقوام اکثرے در بعضے پرگنات ملک سندھ ساکن اند و شغل شاں کاشت کاری است در حضور امیر محمد بن قاسم رسیدند" (ص ۲۵)

یعنی لوہانہ، سہتہ، چندر، ماچھی اور کوریجہ کہ جن کی اکثریت ملک سندھ کے پرگنوں میں آباد ہے اور ان کا پیشہ کاشت کاری ہے، امیر محمد بن قاسم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

بہاولپور بالخصوص اوچ کے اطراف میں لوہانہ، سہتہ، چندر، ماچھی اور کوریجہ قومیں آج بھی بہ کثرت آباد ہیں۔ مین لائن پر ماچھی گوٹھ نام کا ایک ریلوے اسٹیشن اور اسی نام کا ایک قصبہ موجود ہے اور قدیم العہد آبادی ہے۔ اسی طرح کوریجہ قوم بھی ریاست بہاولپور کی ممتاز قوموں میں شمار ہوتی ہے۔ سرائیکی زبان کے شہرۂ آفاق شاعر حضرت خواجہ غلام فریدؒ اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اوچ

کی قدیم ترین اقوام میں مید اور جاٹ نامی دو قوموں کا تذکرہ بھی ملتا ہے اس کے علاوہ بھٹی، سومرہ اور سمہ قبیلے کے لوگ بھی زمانۂ قبل از تاریخ کی وہ قومیں ہیں جو اوچ پر ایک عرصۂ دراز تک دادِ حکمرانی دیتی رہی ہیں اور جن کے بقیۃ السیف آج بھی اس علاقہ میں موجود ہیں۔

اوچ کے مذاہب

تاریخ بتاتی ہے کہ اوچ مختلف ادوار میں متفرق مذاہب و ادیان کا مرکز بنا رہا ہے۔ آج سے پانچ ہزار سال قبل جب اوچ تہذیبی اور ثقافتی طور پر وادیٔ عراق کی سمیری تہذیب سے مربوط تھا۔ یہاں کے لوگ مظاہر پرستی اور اصنام پرستی کے اس مسلک پر کاربند تھے جس پر بابل کے قدیم باشندے گامزن تھے۔ پھر جب یہاں آریاؤں کا تسلط ہوا تو انہوں نے دیوی دیوتاؤں کا وہ برہمنی تصور پیش کیا جو آج بھی ہندوستان میں اپنی اصلی شکل و صورت میں موجود ہے۔ بعد ازاں ایرانی غلبہ و اقتدار کے ایام میں آتش پرستی کی رسم چلی اور کفند کے عہد اقتدار تک یہ علاقہ اہرمن ویزداں کے ایرانی فلسفہ پر عمل پیرا رہا۔ بدھ مت کے عروج کے ساتھ ساتھ یہاں کی قدیم اقوام نے نروان کے تصور کو اپنایا اور مہاتما بدھ کی تعلیمات یہاں کا دستورالعمل قرار پائیں۔ پھر ایک دور وہ آیا جب برہمنوں نے دوبارہ اس سرزمین پر قبضہ جمایا اور ہندو مت کو از سرِ نو یہاں زندہ کیا گیا۔

چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور ایک صدی کے اندر اندر اسلامی تعلیمات کا اجالا گھر گھر پھیل گیا۔ اس کے بعد اگرچہ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے تاہم آہستہ آہستہ غلبہ اسلام ہی کو حاصل ہوا اور اوچ مسلمانوں کی

اکثریت اور ان کے اقتدار کا مظہر بن گیا۔

اسلامی عہد میں اوچ مختلف فرقوں کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ ایک زمانہ میں یہاں فرقۂ باطنیہ کا اثر و نفوذ رہا پھر اہل سنت، والجماعت کے گروہ حق پرست نے یہاں ڈیرے ڈالے اور کم و بیش پانچ صدیوں تک یہ لوگ اس بر صغیر پر چھائے رہے۔

دسویں صدی ہجری کے اواخر میں یہاں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا اور مخادیم بخاری کے ایک سجادہ نشین جندوڈہ شاہ نے اس مسلک کو رواج دیا اس کے اثرات آج بھی اس بستی میں پائے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی ہجری کے اوائل میں ایک فرقۂ باطلہ قادیانیت کے جراثیم نے بھی اس بستی کو متاثر کیا اور یہاں کے بعض گھرانے ایک جھوٹے مدعیٔ نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کے حلقہ بگوش بن گئے تاہم ان کا وجود و عدم برابر ہے۔

اوچ میں اسماعیلی خوجے بھی کافی تعداد میں آباد ہیں اور سید حسن کبیر دریا کی خانقاہ سے وابستہ ہیں۔

لے تاریخ اوچ مصنفہ مولوی حفیظ الرحمٰن مرحوم

باب ہشتم

اوچ کی ہمعصر بستیاں

استدراک دریائے ہاکڑا کے کنارے جو آبادیاں ہیں عہد قدیم کی یاد دلاتی ہیں اور قدامت میں اوچ کی ہمسر ہیں۔ ان میں قلعہ ڈیراور، مئو پتن منارا، قلعہ مروٹ، بھٹہ واہن اور اسی قبیل کی دیگر کئی آباد یا ویران بستیاں یا ان کے آثار موجود ہیں۔ اس دریا کی سرد مہری اور تغافل نے ان آبادیوں کا سارا حسن تباہ کر کے رکھ دیا اور انہیں اپنی عظمت رفتہ کا نوحہ خواں بنا دیا ہے۔

دریائے ہاکڑا کے آغاز و انجام اور اس کی مختلف گزرگاہوں کے متعلق متعدد روایات مشہور ہیں جو اپنے جزوی اختلاف کے باوجود اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ وادی سندھ کی تہذیب کے بناؤ اور بگاڑ میں اس دریا کی نت نئی تبدیلیوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

دریائے ہاکڑا کے کنارے بسنے والی ان ویران آبادیوں کے کھنڈروں سے پرانے ٹھیکرے اور مٹی کے جو برتن برآمد ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ یہ علاقہ کسی دور میں تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز اور تجارت و سیاست کا ایک اہم خطہ تھا اور موئن جوڈیرو، ہڑپہ اور کالی بنگن جیسے قدیم شہروں سے اپنی اہمیت و وقعت کے اعتبار سے کچھ کم نہیں تھا۔ زمانہ قبل از تاریخ کے یہ مقامات جو دریائے



پتن منارا رحیم یار خاں

ہاکڑا کی قدیم گزرگاہوں کے آس پاس واقع تھے۔ بہاولپور ڈویژن کے تقریباً ۱۲ ہزار مربع میل رقبہ پہ پھیلے ہوئے ہیں اور اس خطہ میں واقع ہیں جو چولستان[1] کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ یہ سرزمین اب ایک وحشت ناک اور بے آب و گیاہ ریگستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن اب بھی کہیں کہیں اس کے دامن میں ایسے آثار ضرور مل جاتے ہیں جو قدیم تاریخ کے مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

پتن منارا

ان آثار قدیمہ میں ایک قابل ذکر جگہ پتن منارا ہے جو بدھ مت کے دور کی قدیم یادگار ہے۔ رحیم یار خاں ریلوے اسٹیشن سے پانچ میل مشرقی جانب دریائے ہاکڑا کی خشک گزرگاہ کے مشرقی کنارے واقع ہے۔ یہاں بدھ مت کی ایک بڑی درسگاہ تھی۔ یہ منارا جو اب منہدم ہو چکا ہے۔ اس عمارت کا وسطی برج تھا۔ اسکے چاروں طرف اسی بناوٹ اور وضع قطع کے چھوٹے چھوٹے چار اور برج تھے۔ یہ چاروں برج بالائی منزل کی عمارت کی نچلی سطح پر مل کر اوپر والی عمارت کا خوبصورت حصہ بن جاتے تھے۔ پتن منارا کے اردگرد کچھ دور تباہ شدہ ٹیلے بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں یہاں ایک وسیع شہر آباد تھا۔ اس برج کے قریب بہت سے تہہ خانوں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ کھوکھار کے کھنڈر یہاں سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہیں اور بندور سے دو میل کے فاصلہ پر، تعجب ہے کہ ہندوستان کے سیاحوں میں سے کسی مسلمان سیاح نے اس عمارت کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ یہ عمارت مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے برباد ہو چکی تھی۔

---

[1] چولستان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں "جغرافیہ سندھ" نے لکھا ہے کہ سرائیکی زبان میں وسطی حصہ کو "چول" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ علاقہ سندھ کی قدیم جغرافیائی حدود [illegible] تھا اس بنا پر اسے چولستان کہا جانے لگا جو بعد میں بگڑ کر چولستان

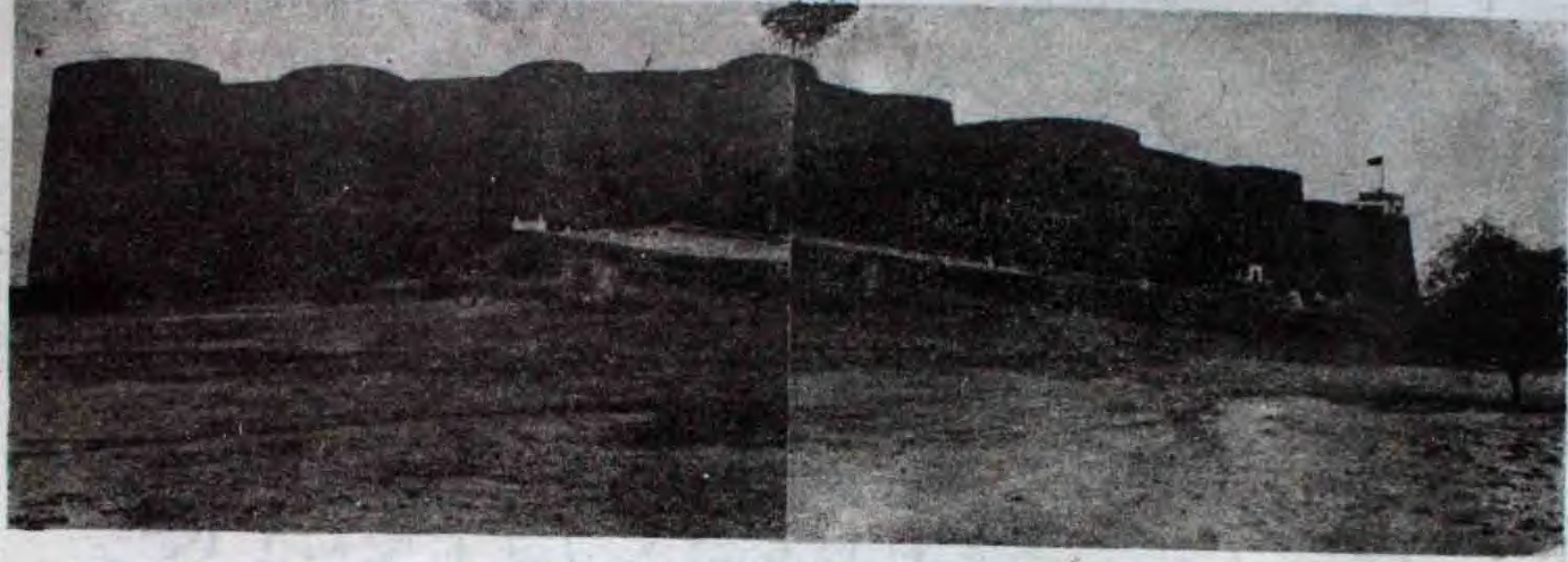
کرنل ٹاڈ نے جیسلمیر کے جو تاریخی واقعات تحریر کئے ہیں ان کی رو سے دسویں صدی عیسوی میں یہ مقام ایک ہندو راجہ کے دارالحکومت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں یہاں دریائے سندھ کے کنارے ایک سات منزلہ بڑی حسین عمارت تھی جس کے وسط میں دو تالاب پانی اور دودھ سے بھرے رہتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک یہ عمارت خستہ حالت میں موجود تھی لیکن اس کے بعد فضل علی خاں بلانی داؤد پوترہ نے اسے مسمار کر کے اس کی اینٹیں دین گڑھ اور بھاگلہ کے قلعوں میں استعمال کیں۔

۱۸۴۰ء میں اگر ذات کا ایک جوگی اس مقدس عمارت کا رکھوالا تھا جس نے نمک کے ڈھیر میں اپنے آپ کو دفن کر کے خودکشی کر لی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے ایک چیلے نے اس کی مڑھی پر لنگ بنوا کر پوجا کا سلسلہ شروع کر دیا بانجھ عورتیں بچوں کی تمنا میں جوق در جوق پوجا کرنے لگیں۔ مسلمانوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور انہوں نے غصہ میں آ کر اس مڑھی کو ڈھا کر اس کی جگہ ایک مسجد تعمیر کر دی۔ یہ مسجد پتن منارا کے قریب اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے۔

کرنل منچن لکھتے ہیں کہ :۔

پتن منارا کی اندرونی دیوار کے پلستر اکھاڑنے کے بعد وہاں کچھ سندھی زبان کے حروف کندہ پائے گئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ بعض اشیاء ۱۵۵۹ء اور ۱۵۶۹ء کے درمیانی دور میں بطور تحفہ مندر میں لائی گئی تھیں۔ ایک تحریر کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے ہر قسم کے منافع میں سے آدھ آنہ فی روپیہ مندر کو بھیجنے کا اقرار کیا۔"

اس عمارت کے مغربی جانب قدیم قلعہ کے آثار بھی موجود ہیں اس کی ایک دیوار میں شیروں کے سروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ عمارت پنجا زنتا ٹائپ کی ہے۔ اینٹوں کی ساخت، سائز اور بناوٹ سے پایا جاتا ہے کہ چندر گپت کے عہد کی بنی ہوئی ہیں۔



قلعہ ڈیراور

قلعہ ڈیراور

دریائے ہاکڑا کے کنارے ایک قلعہ ڈیراور کے نام سے بھی موجود ہے۔ اس قلعہ کو بھاٹیہ قوم کے ایک راجہ ببجے راؤ کے ولی عہد دیوراج نے سمت ۹۰۹ بکرمی میں تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ احمد پور اور بہاولپور سے مساوی طور پر ۱۸ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور نہایت مضبوط اور اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بہت محفوظ قلعوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں تاریخ مراد میں یہ روایت ملتی ہے کہ:۔

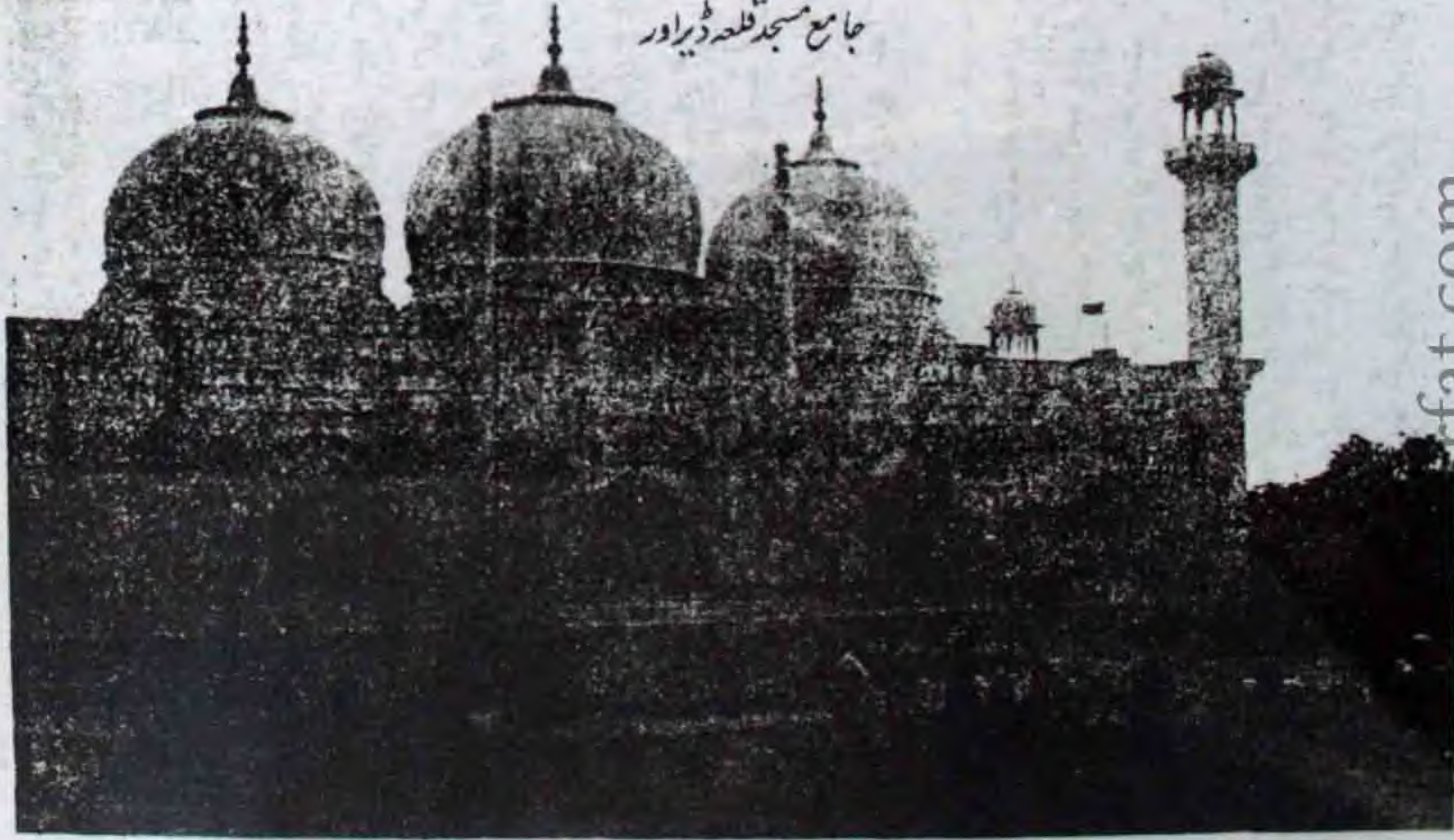
ججی اور دیوا سدھ دو بھٹی راجہ تھے۔ دیوا سدھ ججی کی بہن کا بیٹا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں ججی موجودہ تحصیل خانپور اور تحصیل احمد شرقیہ کے علاقہ میں حکومت کرتا تھا۔ سمت ۹۰۰ میں ججی نے اپنے نام پر ایک قصبہ کی بنیاد رکھی۔ یہ قصبہ ججہ کے نام سے اب بھی موجود ہے۔ اس زمانہ میں دریائے سندھ جو قصبہ کے مغربی جانب دس میل کے فاصلہ پر بہتا ہے، اس قصبہ کے قریب گزرتا تھا۔ دیوا سدھ نے جو دیوراول کے نام سے بھی مشہور ہے۔ سمبت ۹۰۹ میں ججی بھٹی کی اجازت سے ایک قلعہ تعمیر کیا اور اپنے نام پر اس کا نام رکھا بعد میں ججی نے حسد کی وجہ سے اپنے بھانجے کو قلعہ کی مزید تعمیر روک دینے کا حکم دے دیا۔ دیوراول کی ماں یعنی ججی کی بہن کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے ججی کو لکھا کہ بھٹہ اور بھٹی دونوں ایک ہیں۔ دیوراول کو قلعہ کی تعمیر مکمل کرنے دو۔ چنانچہ ججی نے اجازت دے دی اور دیوراول نے بلا تاخیر قلعہ کی تعمیر مکمل کر لی۔ اس قلعہ کی تعمیر کے بارے میں ایک اور روایت بھی ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ کنڑ کے بیٹے تنّو کے مرنے کے بعد جب راجہ تنّو کا بیٹا ببجے راؤ تخت نشین ہوا تو بعض بلوچی قبائل نے اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ ایک دن اسے اپنے ہاں دھوکہ سے بلوا کر قتل کروا دیا۔ اس کے ساتھ اس کی قوم بھاٹیہ کے آٹھ سو افراد تھے وہ بھی موت کے گھاٹ

اتار دیئے گئے۔ بجے راؤ کا بیٹا دیوراج بھی اس ہنگامہ میں موجود تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی ماں کے پاس اپنی ننھیال میں رہنے لگا۔

جب دیوراج جوان ہوا تو اس نے اپنے ماموں راجہ بھوڑہ سے ایک بھینسے کے چمڑے کے برابر زمین طلب کی جو اسے اس کے ماموں نے دے دی۔ دیوراج نے اس چمڑے کا باریک تسمہ بنا کر زمین کے ایک وسیع رقبہ پر قبضہ جما لیا۔ اسی دوران اس کی ملاقات ایک سنیاسی سے ہوئی جس نے اسے کیمیاوی عرق سے سونا بنانے کی ترکیب بتائی۔ جب کافی مقدار میں سونا تیار ہو گیا تو اس نے اس قلعہ کی تعمیر شروع کر دی۔ اس کے ماموں کو جب اپنے بھانجے کے عزائم کی خبر ہوئی تو اس نے دیوراج کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر جرار بھیجا۔ دیوراج نے اس کے مقابلہ کے لئے یہ چال چلی کہ قلعہ میں اپنی کتیہ کو چھپا دیا اور قلعہ کی چابیاں حملہ آوروں کے سپرد کر دیں۔ فتح کے نشہ میں جھومتے ہوئے جب راجہ بھوڑہ کی فوج کے سردار اندر داخل ہوئے تو کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے فوجیوں نے بارہ سرداروں کے سر قلم کر کے قلعہ سے باہر پھینک دیئے۔ یہ دیکھ کر راجہ بھوڑہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور قلعہ حملہ آوروں سے مامون رہا۔ دیوراج نے اس قلعہ کا نام "دیوراول" رکھا جو بعد میں بگڑ کر ڈیراور ہو گیا۔

دریائے ہاکڑا کے خشک ہو جانے کے باعث اس قلعہ تک حملہ آوروں کی رسائی مشکل ہو گئی کیونکہ اس کے اطراف و جوانب میں دور دور تک پانی کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اسی بنا پر امرائے بہاولپور نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں اس قلعہ کو خزانۂ شاہی کے لئے منتخب کیا تھا۔

سمبت ۹۰۹ب سے ۱۷۹۰ء تک یہ قلعہ دیوراول کی اولاد کے قبضہ میں رہا۔ ۱۷۹۰ء میں نواب صاحب محمد خاں اول نے قلعہ ڈیراور کو راول رائے سنگھ سے چھین لیا۔ اگرچہ ۱۸۰۴ سمبت میں راول رائے سنگھ نے نواب صادق محمد خاں اول سے


جامع مسجد قلعہ ڈیراور

یہ قلعہ واپس لے لیا لیکن ۱۸۱۶ (سمبت) میں اس نے رضاکارانہ طور پر یہ قلعہ نواب مبارک خاں کو دے دیا۔ البتہ یہ شرط طے کر لی کہ وہ اس علاقہ کی آمدنی کا نصف حصہ اسے ادا کرتے رہیں گے۔ سمبت ۱۸۴۲ تک راول رائے سنگھ اور اس کا بیٹا رگو ناتھ سنگھ مقررہ رقم نواب بہاولپور سے وصول کرتے رہے۔ بعد میں یہ رقم گھٹتے گھٹتے پچاس روپے سال رہ گئی اور ۱۸۹۳ سمبت کے بعد یہ سلسلہ منقطع کر دیا گیا البتہ نواب بہاولپور اس خاندان پر یہ نوازش کرتے رہے کہ جب ان کا کوئی فرد نواب صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا تو اسے خلعت و انعام سے نوازا جاتا۔ اس قلعہ میں ایک عرصہ تک والیان ریاست مقیم رہے۔ بہاولپور اور احمد پور شرقیہ آباد ہونے سے قبل یہی قلعہ ان کے محل کا کام دیتا تھا۔ والیان ریاست کی خصوصی توجہ کی وجہ سے یہ قلعہ دست بُردِ زمانہ سے محفوظ رہا۔ اس میں بڑے بڑے تہہ خانے ہیں۔ سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر جو آئینہ کی چھت سے ڈھکا ہوا ہے، شاہی خاندان کی قبریں ہیں۔ قلعہ کے بالمقابل ایک نہایت خوبصورت مسجد ہے جس کی بناوٹ دہلی کی جامع مسجد سے ملتی جلتی ہے۔ مسجد کے سامنے ایک تالاب ہے جس میں مسجد کا عکس پڑتا ہے۔ قلعہ کے ایک حصہ میں ایوان شاہی ہے جس نے اس قلعہ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔

بھٹہ واہن

دریائے ہاکڑا کے کنارے ایک پرانا قصبہ بھٹہ واہن بھی ہے جو رحیم یار خان سے دس میل شمال میں واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وادیٔ سندھ کے مشہور رومان سستی پنوں کی داستان کا ایک باب تکمیل کو پہنچا۔ اس بستی کے متعلق مشہور ہے کہ راجہ داہر کے عہد میں بسائی گئی جس پر بعد میں بھٹہ نامی ایک راجہ قابض ہو گیا اور اس کے نام پر اس مقام کا نام بھٹہ واہن پڑ گیا۔

اس زمانہ میں دریائے سندھ بھٹہ واہن سے بمشکل ایک میل کے فاصلہ پر

بہتا تھا۔ اس مقام پر دریائے سندھ کی دو شاخیں آ کر ملتی تھیں جن سے تین نہریں نکلتی تھیں۔ یہ سہ شاخ نہریں "تریکوہی" (تین منہ والی) کہلاتی تھیں چنانچہ سستی کے باپ کو جو ٹھاٹی برہمن تھا جب سستی کی جنم پتری سے یہ معلوم ہوا کہ وہ کسی مسلمان بلوچ کے عشق میں مبتلا ہو جائے گی تو اس نے اپنی بے عزتی سے بچنے کے لئے اپنی دودھ پیتی بچی کو ایک صندوق میں بند کر کے رات کی تاریکی میں اس سہ شاخ نہروں کے مقام پر بہا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سسی اسی قصبہ میں پیدا ہوئی تھی۔

یہاں مقامی طور پر یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ملا مبارک کے بیٹے اور عہد اکبری کے نامور عالم ابوالفضل اور فیضی بھی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ قصبہ بھٹہ واہن کے متعلق یہ روایت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس قصبہ میں ایک ایسا مقام بھی ہے کہ اگر وہاں کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ ضرور ابوالفضل کی طرح مدبر ہوگا یا فیضی کی طرح دانشور اور عالم ہوگا اور اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو سسی کی طرح اس کا عاشق جانباز ہونا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے اس مقام کی آج تک نشان دہی نہیں ہو سکی ورنہ مذکورہ بالا روایت کی روشنی میں اب تک نہ جانے کتنے ابوالفضل، فیضی اور سسی جیسی شہرت کے لوگ اس سرزمین سے اٹھ کر بقائے دوام حاصل کر چکے ہوتے۔

سسی پنوں کے رومان کا واقعہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ جب کہ سابق صوبہ سندھ کے علاقہ "سہوان" میں ہندو راجہ دلو رائے کی حکومت تھی۔ اس اعتبار سے چولستان کا وہ دریا جو اب خشک ہو چکا ہے۔ آٹھویں صدی کے وسط تک جزوی طور پر جاری ہو گا۔

قلعہ مروٹ

یہ قلعہ بھی چولستان میں خشک دریائے ہاکڑا کے جنوبی کنارے پر ایک بلند ٹیلہ پر واقع ہے۔ اس کا بانی چتوڑ کا حاکم مروٹ تھا جب کی چچ برہمن کے ساتھ


قلعہ مروٹ کے باقیات

جنگ ہوئی تھی۔ اس قلعہ کے قریب سے ملتان سے دہلی جانے والی قدیم سڑک گزرتی ہے۔ مشہور مورخ اور طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج ۶۴۸ھ میں اسی راستے سے یہاں آیا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں یہ قلعہ ایک زبردست فوجی چھاؤنی تھا اور جب سلطان شمس الدین التمش نے اوچ پر چڑھائی کی تو اوچ کا بادشاہ ناصر الدین قباچہ یہیں قیام پذیر تھا۔

قلعہ مروٹ کے دروازے کی ایک اینٹ پر ہندی میں جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر جام سومرا کا قبضہ رہا ہے جس نے ۱۴۹۱ء میں اس کی مرمت کروائی تھی۔ قلعہ کے اندر ایک مسجد تھی جو شہنشاہ اکبر کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی اس کے ایک پتھر پر یہ عبارت کندہ تھی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بنا شد ایں مسجد جامع شریف در دہر جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی"۔

۱۷۴۹ء میں نواب مبارک خاں نے جیسلمیر کے راجہ سے یہ قلعہ فتح کر لیا۔ اس سلسلہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ مروٹ کا کمانڈر جسے بعض بدعنوانیوں کی بنا پر برخاست کر دیا گیا تھا۔ نواب محمد بہاول خاں سوئم کے پاس دوبارہ ملازمت کے لئے حاضر ہوا اور عرض کیا کہ

"یا میت یا مروٹ" یعنی موت یا مروٹ۔

ان الفاظ نے نواب صاحب کا دل موہ لیا اور انہوں نے اس کی درخواست منظور کر لی۔ یہ قلعہ اب برائے نام رہ گیا ہے۔ اس کے کئی حصے منہدم ہو چکے ہیں۔ البتہ دروازہ موجود ہے جو کئی بار مسمار ہوا اور کئی بار مرمت ہوا قلعہ کا حصار بہت بلند ہے۔ اس کے اندر لوگوں نے گھر بنا لئے ہیں۔ یہاں ہندوؤں کے زمانہ کے قدیم آثار میں راجہ نانک رائے کا برج اور جین مت کے ایک قدیمی مندر کے علاوہ برج سون ماڑی مٹی کے تودوں کی شکل میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ نانک رائے سون ماڑی پر بیٹھ کر دریا کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

قلعہ کے ساتھ ہی شاہ مردان کے نام کا ایک قبرستان ہے جس میں شیر شاہ

سید جلال الدین بخاریؒ کے زمانہ کے اکابر کے مزارات ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ بزرگ کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ انہی میں بعض قبائلی رقابتوں کے نتیجہ میں مرنے والوں کے مزارات بھی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہاں بوہڑ اور نائچ دو قبیلے آباد تھے۔ ان میں ایک عرصہ سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاریؒ نے ان دونوں قبیلوں کے درمیان مصالحت کرا دی۔ چونکہ یہ قبیلے حضرت مخدوم کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور آپ ہی کی نصیحت سے ان میں دوستی کی بنیاد پڑی تھی اس لئے آپ نے ان کو قرابت کے رشتہ میں منسلک کر کے اس دوستی کو پائدار کرنا چاہا۔ بوہڑوں نے اپنی ایک لڑکی نائچ قبیلہ میں بیاہ دی لیکن نائچ قبیلہ والوں نے دلہن کو قتل کر ڈالا۔ یہیں سے وہ زبردست معرکہ جنگ و جدال ان دونوں قبیلوں کے درمیان برپا ہوا جس کی یادگار بوہڑ قوم کے ۲۲ سرداروں کی قبریں آج بھی یہاں موجود ہیں۔ وہ علاقہ جہاں قلعہ مروٹ واقع ہے کافی اونچا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تہہ در تہہ بستیاں دفن ہیں اور آخر میں ان بستیوں کے ڈھیر پر قلعہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آئین اکبری میں درج ہے کہ مروٹ کے پختہ قلعہ اور اس کی متعلقہ زمین ۵۴۵۶۰ بیگھ اور آمدنی ۲۰۴۰۰۰ سکہ رائج الوقت تھی۔ دو سو سوار اور ایک ہزار پیادہ فوج اس قلعہ میں رہتی تھی۔ درحقیقت اوچ، ملتان اور مروٹ قدامت کے لحاظ سے ایک ہی عہد کی یادگار ہیں۔ ان سب میں زیادہ خستہ حالت قلعہ مروٹ کی ہے۔

قلعہ مئو

رحیم یار خاں سے چھ میل شمال کی طرف مئو مبارک کا قدیم قلعہ واقع ہے۔ یہ رائے ساہسی دوم کے چھ قلعوں میں سے ایک ہے۔ بیس گڑھیوں اور برجوں کے کھنڈرات اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ان میں سے ۵۰ فٹ بلند ہے جو تا حال قائم ہے۔ فصیل چھ سو گز ہے۔ رائے منس کھر وڑ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے


قلعہ موج گڑھ

زمانہ میں اپنی ماں کی رہائش کے لئے بنوایا تھا لیکن مئو نام ہوا راۓ بھوج کے عہد میں، جب سلطان محمود غزنوی سومنات کو جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تو راجہ بھوج نے مزاحمت کی۔ محمود غزنوی نے قلعہ پر حملہ کر کے اسے تباہ و ویران کر دیا۔

سلطان حمیدالدین حاکم جو حضرت شاہ رکن عالم ملتانیؒ کے اجلہ خلفاءؒ میں سے تھے اور ساتویں صدی ہجری کے آخر میں یہاں آئے ہیں اور جن کا مزار بھی اسی شہر میں ہے۔ ان کے تذکرہ نگار نے اس بستی کے قلعہ کے متعلق لکھا ہے کہ

"باید فہمید کہ قلعہ مئو قلعہ الیست معظم موہبت با ہیبت با اوج و رفعت با بالائی و بلندی و با عظمت و رفعت مزین با بروج و مینار و محکم بدہلیز و دروازہ آہنی و واقع است درمیان ملتان و بھکر کہ بعد از زمان عیسیٰ علیہ السلام رائے سہنس کرور آں را بنا گردہ است۔ بعدہٗ راۓ کلاس آرائش و زینت داد و در عہد رائے بھوج شاہ غزنی او را پامال ساخت و قلعہ مئو را ویران انداخت و آں چناں دروازہ آں مسدود مطلق نمود کہ ہیچ بنی آدمؑ را یارائے رفتن بالائے قلعہ نماند۔"

ترجمہ: "جاننا چاہئے کہ مئو کا قلعہ بہت بڑا بارونق اور شان و شوکت والا قلعہ ہے۔ نہایت بلندی پر واقع ہے۔ بہت عظیم و رفیع اور آراستہ و پیراستہ اس کے برج اور مینار بہت اونچے اور خوبصورت ہیں۔ اس کی دہلیز بڑی مضبوط اور دروازہ لوہے کا ہے اور یہ ملتان اور بکھر کے درمیان واقع ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے عہد کے بعد راجہ سہنس کرور نے اس کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد راجہ کلاس نے اس کی آرائش کی۔ راجہ بھوج کے زمانہ میں شاہ غزنی نے اس کو تباہ و برباد کر دیا اور اس کے دروازے کو اس طرح مسدود کیا کہ کسی کو قلعہ میں جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی"

ساتویں صدی ہجری تک مئو کے قلعہ کے آس پاس اچھی خاصی آبادی تھی اور یہ شہر بڑا بارونق تھا۔ دریائے ہاکڑا اس کے قدموں میں بہتا تھا۔ مکانات پختہ اور بلند سطح پر واقع تھے۔ چاروں طرف ہرے بھرے باغات اور سرسبز و شاداب

کھیت لہلہا رہے تھے۔

سہروردی سلسلہ کے نامور بزرگ حضرت مخدوم بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے تربیت یافتہ اور حضرت شاہ رکن عالم ملتانیؒ کے خلیفہ اعظم حضرت سلطان حمیدالدینؒ[1] حاکم کے مزار کی وجہ سے یہ بستی اوچ کی طرح آج بھی مرجع خلائق ہے۔[2]

پھولڑہ

یہ قلعہ بیکانیر کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کے گرد پہلے ایک خندق تھی۔ دیواریں بہت بلند اور فصیل بہت دلکش تھی۔ ایک زمانہ میں اس کی شمالی دیواریں پانی سے دھوئی جاتی تھیں اور اس میں سرسبز درختوں کا خوش نما جزیرہ نظر آتا تھا۔ اس قلعہ پر تین توپیں بھی نصب تھیں۔ اب یہ قلعہ بالکل منہدم ہو چکا ہے۔ البتہ کچھ کھنڈر

---

[1] سلطان حمیدالدین حاکم کیچ مکران کے بادشاہ تھے۔ جوانی میں ترک دنیا فرماکر درویشی کے مسلک پر گامزن ہو گئے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد پہنچے۔ کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر ہندوستان تشریف لائے۔ ان دنوں مئو میں حضرت غوث العالم بہاؤالحق زکریا ملتانی ملتان منتقل ہو گئے تھے۔ آپ نے لاہور میں اپنے نانا حضرت سید احمد توختہؒ کی خدمت اقدس میں کچھ وقت گزارا۔ اس کے بعد حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانی کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منزلیں طے کیں لیکن جو فیض باطنی آپکو حضرت ابوالفتح شاہ رکن عالم سے ملا وہ آپ کی نسبت طریقت کے لئے وجہ امتیاز اور سرمایۂ افتخار بن گیا۔ آپ کی عمر مبارک اپنے پیرومرشد سے ۷۰ سال زیادہ تھی تاہم عقیدت و نیازمندی کا جو تعلق آپ کو اپنے مرشد کی ذات گرامی سے تھا اس میں "بزرگی بہ عقل است و نہ بسال" کا اصول ہمیشہ پیش نظر رہا۔ آپ کا انتقال مئو مبارک میں ۷۳۰ھ میں ہوا۔

[2] تذکرہ حمیدیہ از شیخ شہراللہ بن رحمۃ اللہ شکاہ


قلعہ پھلڑہ

باقی ہیں۔ قدامت میں یہ قلعہ بھی مذکورہ بالا قلعوں کا ہمسر ہے۔

ان قلعوں کے علاوہ چولستان کے قدیم دریائے ہاکڑا کے کنارے پر اور بھی متعدد قلعے موجود ہیں ان میں دین گڑھ۔ اسلام گڑھ اور موج گڑھ کے آثار موجود ہیں جو زمانہ کی گردشوں کے ساتھ ساتھ برابر انحطاط پذیر ہیں۔

باب نہم

اُوچ، عبرتوں کا مرقّع

اوچ کی علمی، روحانی، سیاسی اور تمدنی اہمیت کا دور ختم ہوئے اگرچہ مدّت گزری اور اوچ کی تاریخساز حیثیت ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ اب اس کے درودیوار پر حسرتوں کی سیاہی پھیل چکی ہے، اس کی پختہ دیواروں کی سنگینی قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ مرورِ سال کی تہہ بہ تہہ گرد کے نیچے اس کے اوراق دفن ہو کر رہ گئے ہیں اور اب یہ شہر عبرتوں کا مرقع اور حسرتوں کی تصویر بن چکا ہے، تاہم اس کے ذرّوں میں زندگی کی حرارت بالکل ہی مفقود نہیں ہوئی اور باوجودیکہ

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا

کی سی کیفیت ہر چہار طرف مسلّط نظر آتی ہے مگر پھر بھی یہ بستی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار ضرور اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر کا یہ ضابطہ بھی عجب ہے کہ وہ جسے پامال کرتے ہیں، اسے سربلند بھی ضرور کرتے ہیں اور جسے اوجِ کمال تک پہنچاتے ہیں اسے رو بہ زوال کرنے میں بھی انہیں تامّل نہیں ہوتا۔ کیا عجب کہ یہ بستی جو کبھی عروج و کمال کے منتہا تک پہنچ کر زوال

و انحطاط کا شکار ہوئی ہے خود اپنے ہی سوز باطنی کے دم قدم سے پھر ایک بار انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے اور اس کے گلی کوچوں میں وہی پرانی رونقیں جاگ اٹھیں جن کی دعوتِ نظارگی نے ایک عالم کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ آثار بتاتے ہیں کہ یہ شہر ایک بار پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ اس کے دن پھریں گے۔ اس کا بول بالا ہوگا اور پھر وہ وقت آئے گا جب یہ علوم و فنون کا مرکز، تہذیب و تمدن کی آماجگاہ اور علم و عرفان کا سرچشمہ بن جائے گا۔

اوچ کی موجودہ تصویر ایک ایسی بستی کی ہے جہاں غربت و امارت اور بلندی و پستی کا واضح تضاد موجود ہے جہاں بعض گھروں میں بھوک اور افلاس ننگے ہو کر ناچتے ہیں اور جہاں کچھ لوگ نانِ شبینہ تک کو محتاج ہیں۔ جہاں کسمپرسی، شکستگی، سرافگندگی اور سرگرانی کے مناظر عام ہیں، وہاں انہی آثار وحشت و ویرانگی کے درمیان بلند و بالا ماڑیاں اور محل نما عالیشان مکانات بھی نظر آتے ہیں جن میں بزرگانِ اوچ کی درگاہوں کے سجادہ نشین رہائش رکھتے ہیں اور جنہیں اپنے نیک نام آباؤ اجداد کی عمر بھر کی ریاضتوں، مجاہدوں، عبادتوں اور نفس کشی کی کٹھن آزمائشوں کے صدقے میں فارغ البالی کی تمام آسائشیں حاصل ہیں۔

اوچ جس کے حدود اربعہ کی وسعت آج ایک ناقابلِ یقین کہانی محسوس ہوتی ہے، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہ ۲۶ میل لمبا اور ۲۴ میل چوڑا شہر تھا۔ اس طول و عرض کا حامل شہر کیا کچھ نہ ہوگا، ذرا چشمِ تصوّر سے کام لے کر اس کی پہنائیوں کا اندازہ لگائیے اور ان پہنائیوں کے دامن میں جس جس قسم کے ہنگامے پلتے اور ابھرتے ہوں گے ذرا ان کے بارے میں سوچئے تو پتہ چلے کہ آج اوچ عاشق کے دل کی طرح سمٹ کر کیا سے کیا رہ گیا ہے۔

کس پائمالِ آفتِ فرسودگی مباد

ایک روایت کے مطابق اوچ کی بستی چار دروازوں میں محصور تھی۔ اس کا ایک دروازہ خرم پور کی جانب کھلتا تھا۔ یہ خرم پور اس دور کی وہ چھوٹی سی

بستی تھی جو آج احمد پور شرقیہ کے نام سے اوچ کی عظمت کا منہ چڑا رہی ہے اس کا دوسرا دروازہ الہ آباد کے قدیم شہر سے متصل واقع تھا۔ تیسرا دروازہ علی پور اور چوتھا چودھری نام کی ایک بستی کے قریب تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ چاروں بستیاں اوچ کے دامن میں یوں سمٹ آئی تھیں جیسے آج لاہور بڑھ کر شاہدرہ، جلّو، کوٹ لکھپت اور برکی تک بڑھ چکا ہے یا جیسے کراچی کی حدود لانڈھی، حب ندی، منوڑا اور منگھو پیر کی دُور افتادہ بستیوں تک پھیل چکی ہیں، یہی حال اوچ کا تھا۔ اوچ کے قرب و جوار کی وہ بستیاں جو آج اپنی انفرادی حیثیت کو نمایاں کر چکی ہیں آج سے پانچ سات سو برس پہلے تک اس شہر کے دُور افتادہ محلّے شمار ہوتے تھے مگر آج یہی محلّے مستقل بستیوں کی شکل میں خود اوچ کی عظمت کے حریف بن چکے ہیں اور اوچ خود ان کے سامنے نکّو بن کر رہ گیا ہے۔

اوچ کی موجودہ آبادی تقریباً دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کا مجموعی رقبہ چار مربع میل سے کسی طور زیادہ نہیں، یہاں کے بازاروں میں ویرانیوں کے ڈیرے اور گلی کوچوں میں اداسیوں کے ٹھکانے ہیں۔ محلّے سنسان، گھر تباہ حال، آبادی پر نکبت کا مہیب سایہ، کھنڈروں میں آسیب زدگی کی دہشت اور مزاروں پر " نے چراغ نے گلے" کی مُردنی چھائی ہوئی ہے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جن کی ہستی بذاتِ خود ایک انجمن اور علم و فضل و معرفت کی ایک آباد دنیا تھی آج ان کے مزار پر محکمۂ اوقاف کے ایک آدھ ملازم کے سوا نہ کوئی جاروب کش ہے نہ کسی اہل علم کا ڈیرہ۔ ان کا مدفن ایک بڑے ہال میں سطح سے چار فٹ کی بلندی پر " رہے نام اللہ کا" قصیدہ خواں ہے۔ ان کے مزار کی بائیں جانب پہلو میں ان کے فرزندِ جلیل مخدوم ناصرالدین محمود کی قبر ہے جس کا تعویذ نسبتاً چھوٹا ہے اور ان دونوں مزاروں کے اردگرد بیسیوں قبریں ایک ترتیب کے ساتھ قائم ہیں۔ یہ ان لوگوں کی قبریں

ہیں جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے نسبتِ فرزندی رکھتے ہیں۔ مزار جس ہال کمرے میں ہے اس کی چھت منقش ہے اور اس کی بیرونی دیواروں پر ملتانی کاشی کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ ہال کے اندر مغربی سمت میں ایک دیوار نصب ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس دیوار پر سوار ہو کر حضرت مخدومؒ دہلی سے اوچ آئے تھے۔ برِ صغیر پاک و ہند میں ایسی ہی اور بھی بہت سی دیواریں ملتی ہیں جن کے متعلق اسی قسم کی روایات عام ہیں کہ ان پر بیٹھ کر بزرگوں نے طے رحال کیا اور دور دراز کے سفر بڑی خوش اسلوبی سے طے کئے۔ بہر حال یہ حسنِ عقیدت کا ایک ایسا پہلو ہے جس کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مزار کے شمال مشرقی کونے میں قدم مبارک کا ایک چھوٹا سا حجرہ موجود ہے جس میں ایک پتھر نصب ہے۔ اس کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ حضرت علیؓ کا نقشِ پا ہے۔ مخدوم جہانیاں جہاںگشت کے مزار کے مشرقی جانب وہ قدیم العہد مسجد ہے جسے مسجد حاجات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مسجد کے شمال مشرقی کونے میں وہ تاریخی کنواں ہے جس کے بارے میں یہ روایت زبان زدِ عوام ہے کہ اس میں خانوادۂ چشتیہ کے فردِ فرید حضرت خواجہ فریدالدین گنجشکرؒ نے نمازِ معکوس ادا کی۔ اسی مسجد میں خواجہ نصیرالدین چراغِ دہلی نے چلہ کشی فرمائی۔ مسجد حاجات سے ملحق شاہ فضل الدین فضل اللہ کا مزار ہے۔ بیچ میں ایک پتلی گلی حائل ہے۔ شاہ فضل اللہؒ کے مزار کے جانب جنوب بی بی نگنی کی قبر ایک حجرے میں بنی ہوئی ہے اور اس میں صرف مستورات کو داخل ہونے کی اجازت ہے۔ بی بی نگنی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی بہو اور مخدوم ناصرالدین محمود کی اہلیہ تھیں۔

یہیں سے ایک کھلا میدان شروع ہوتا ہے جس میں شمال کی جانب ابوحنیفہ نامی کسی بزرگ کا مزار ہے۔ اس میدان کے مشرقی سرے پر ایک پتلی سی گلی ہے جو حضرت شیخ سید صدرالدین راجن قتال کے مزار تک جاتی ہے۔ سید

صدرالدین راجن قتال کا مزار دریائے ہکڑہ کی قدیم گزرگاہ کے جنوبی کنارے پر ہے۔ مزار فنِ تعمیر کا نادر و دلکش نمونہ ہے۔ مرورِ ایام نے اگرچہ اس عمارت کے رنگ و روغن کو چاٹ لیا ہے مگر چھوٹی اینٹوں پر مرصع کاری اپنی تمام تر نظر فریبیوں اور جاذبیتوں کے ساتھ آج بھی "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست" کی مصداق ہے۔ سید صدرالدین راجن قتال کا مزار ایک بڑے ہال میں ہے اور اسے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ خانوادہ بخاریہ کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید جلال سرخ بخاری بھی یہاں کچھ عرصہ آسودۂ خوابِ استراحت رہے ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مزار کے مغرب میں خانوادۂ بخاریہ کے سجادگان کا ڈیرہ ہے۔ ایک وسیع دعریض اور بلند و بالا ہال ہے جس کے ارد گرد کئی اور چھوٹے موٹے کمرے ہیں۔ بڑے کمرے میں قالین بچھے ہوئے ہیں یہیں معتقدین و مریدین آکر ٹھہرتے ہیں۔ موجودہ سجادہ نشین سید نو بہار شاہ اب تارک الدنیا ہو چکے ہیں۔ ان کے ولی عہد سید محمد اکبر شاہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب ان کے بھائی اچھے میاں سجادگی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ ٹاؤن کمیٹی اوچ کی مسندِ صدارت پر فروکش ہیں۔

سجادگانِ بخاری کے پاس حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات و فرامین کا ایک نادر و نایاب ذخیرہ بڑی ناقدری اور بے التفاتی کا شکار ہو کر پڑا سڑ رہا ہے۔ شاہی فرامین کی بھی یہی کیفیت ہے کہ ان کے اوراق بوسیدہ ہو چکے ہیں اور ان کی سیاہی جگہ جگہ سے اس قدر دھندلا گئی ہے کہ عبارت پڑھی نہیں جا سکتی۔ حضرت مخدوم کی بعض قلمی کتابیں مثلاً خزینۂ جلالی، جواہر جلالی اور ملفوظ المخدوم اور اسی قبیل کے دیگر مخطوطات صندوقوں میں ایک ڈھیر کی شکل میں بند ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بھی رفتہ رفتہ بوسیدگی کا شکار ہو رہے

ہیں۔ عام لوگوں کی دسترس سے یہ کتابیں باہر ہیں۔ خواص بھی وہی ان کتابوں سے باریابی حاصل کر سکتے ہیں جو حکومت کے توسط سے یہاں پہنچیں ورنہ تاریخ کے ایک طالب علم یا کسی محقق کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔

مخادیم بخاری کے اس مہمان سرائے سے جانبِ جنوب ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر خانوادہ بخاریہ کی خشت اوّل حضرت سید جلال سرخ بخاری نوّر اللہ مرقدہٗ کا مزار ہے جس کے ارد گرد قبروں کا ایک شہر خموشاں آباد ہے۔ اس مزار کے احاطہ سے باہر دریائے ہکڑہ کی قدیم گزرگاہ کے مشرقی کنارے پر بہاول حلیمؒ اور بی بی جیوندی کے مقبروں کے گنبد اس حال میں استادہ ہیں کہ ان کا نصف حصہ دریا کی طغیانی اور دست برد زمانہ کی چیرہ دستیوں کی نذر ہو چکا ہے۔ بہاول حلیم جن کا اصل نام قاضی بہاالدین تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے استاد تھے اور بی بی جیوندی جن کا اصل نام بی بی جندوڈی تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی اولاد میں سے تھیں۔ بڑی مستجاب الدعوات تھیں۔ ان کا مقبرہ خراسان کے بادشاہ محمد دلشاد نے ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ مقبرے حسنِ صناعت کے اعتبار سے آج بھی جذب و کشش کا کافی سامان رکھتے ہیں اور ہر تماشائی کے دل پر اوچ کی عظمتِ رفتہ کا نقش مرتسم کر دیتے ہیں۔

حضرت سید جلال سرخ بخاری کے احاطۂ مزار سے متصل گامن سچار کی قبر ہے۔ یہ اوچ کی ان زندہ جاوید شخصیتوں میں سے ہیں جو اپنی حق گوئی اور بے باکی کی خوبی کی بنا پر سچار کے لقب سے معروف ہوئے۔

سید جلال سرخ بخاری کا مزار دریائے ہکڑہ کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ دریا کی جانب کے حصہ میں بعض ایسے کھنڈر اور ایسی شکستہ دیواریں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی پرانے قلعہ کے بچے کھچے آثار ہیں، اس نظریہ کی تائید اس نشیبی راستہ سے بھی ہوتی ہے جو حضرت سید جلال سرخ بخاری کے مزار کے دروازے کے عین سامنے سے دریا کی جانب اترتا ہے

حضرت مخدومؒ کا مزار ایک عالیشان کمرے میں ہے جو وسعت کے اعتبار سے اوچ کے تمام مزارات سے زیادہ کشادہ ہے۔ مزار کے احاطہ میں مسجد بنی ہوئی ہے اور مزار کے دروازے کے متصل ایک تالاب ہے۔ احاطۂ مزار میں داخل ہونے کے لئے شمال کی جانب جو دروازہ موجود ہے وہاں سے ایک سڑک قبروں کے بیچوں بیچ مشرق کی جانب جاتی ہے اور جہاں جا کر یہ سڑک ختم ہوتی ہے وہاں مشہور مجذوب سرمست کا مزار ہے جو حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ کے ہمعصر تھے۔ یہیں بڑ کے وہ تاریخی درخت ہیں جہاں پہلے پہل حضرت مخدومؒ نے قیام فرمایا تھا اور جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک شیر وہاں آپ کی سلامی کے لئے روزانہ حاضر ہوا کرتا تھا۔

اوچ کی بستی کے بالکل جنوب میں حضرت سید صفی الدین گازرونی حقانیؒ کا مزار آج بھی اوچ کی عظمت و قدامت کا نقیب بن کر وقت کی شورانگیزیوں اور حوادثِ زمانہ کی تلاطم خیزیوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ یہ ایک مسطح عمارت ہے جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی ہے۔ بالخصوص اس مزار کی عقبی دیوار جہاں خانقاہ گازرونیہ کی عظیم الشان عمارتیں واقع تھیں اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب گری کہ تب گری۔ اس کمرے میں جو زیادہ بڑا نہیں ہے حضرت سید صفی الدین گازرونیؒ کی قبر کا تعویذ کمرے کی سطح سے تقریباً ۵ فٹ بلند ہے اور خود مزار کا یہ کمرہ بھی زمین کی عام سطح سے ساٹھ ستّر فٹ کے قریب بلندی پر ہے۔ اس مزار کے محلِّ وقوع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی پرانے شہر کا ٹیلہ تھا جسے سید موصوف نے آ کر آباد کیا۔

مزار کے کمرے میں اور بہت سی قبریں موجود ہیں جو حضرت گازرونیؒ کی اولاد کی ہیں۔ مزار کے متصل ایک پرانی مسجد ہے جو غالباً سید صفی الدین گازرونی کے عہد کی یادگار ہے۔ آجکل اس مسجد پر اثنا عشری فرقہ کے لوگوں

نے اپنے بورڈ چسپاں کر رکھے ہیں۔

سید صفی الدین گازرونی کے مقبرہ کی جانب اگر بسوں کے اڈے سے سڑک کے راستے جائیں تو واٹر ورکس کی نئی عمارت نظر آتی ہے۔ پانی کی ٹنکی تقریباً دو سو فٹ بلند ہے۔ اس سے اوچ کی آبادی کے لئے پانی کی فراہمی کا منصوبہ پورا کیا گیا ہے۔ پانی کی اس ٹنکی کے قریب ایک کھلا میدان ہے اس میدان کو عبور کرنے کے بعد اوچ گیلانی کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔

اوچ گیلانی میں حضرت سید بندگی محمد غوث گیلانی اور ان کی اولاد و احفاد کی قبریں ہیں۔ مزارات کی عمارت مسطح ہے۔ مزارات کے ساتھ ہی اوچ گیلانی کی جامع مسجد بڑی خوبصورت اور ملتانی فنِ تعمیر کا دلکش نمونہ ہے۔ اس کی شمالی سمت میں ایک تالاب ہے جہاں نمازی وضو کرتے ہیں۔ اوچ گیلانی کی درگاہ کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک عالیشان مقبرہ نظر آتا ہے جو اندر سے خالی ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں ملتان کے مشہور بزرگ حضرت موسیٰ پاک شہید دفن ہوئے جو حضرت بندگی محمد غوث کے پڑپوتے تھے لیکن پھر خاندان میں باہمی منافست کے باعث جب اختلاف سنگین ہو گیا تو موسیٰ پاک شہید کے ورثاء ان کا تابوت ملتان لے گئے اور وہاں دفن کر دیا۔ آجکل یہاں اس گنبد نما عمارت میں بچوں کا مدرسہ قائم ہے۔

حضرت بندگی محمد غوث گیلانی کے مزار سے متصل جانبِ مشرق اس قلعہ کے آثار موجود ہیں جو مخدوم حامد گنج بخش ثالث نے والیٔ ریاست بہاول پور نواب بہاول خاں ثانی سے معرکہ آرائی کے دوران تعمیر کیا تھا۔ یہیں کچھ فاصلے پر مرحوم سجادہ نشین مخدوم شمس الدین گیلانی کی قیام گاہ ہے جو شمس محل کے نام سے مشہور ہے۔ شمس محل اپنی خوبصورتی، دیدہ زیبی اور خوشنمائی کے اعتبار سے اوچ کی سب سے شاندار کوٹھی ہے۔ مخدوم شمس الدین دینی اور دنیاوی دونوں وجاہتوں کے حامل اور خوش وضع اور باذوق انسان تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی

ورثہ کی نہ صرف مناسب نگہداشت کی بلکہ اس کو ترقی دینے میں بھی کوشاں ہیں گیلانی لائبریری مخطوطات و نوادر کے اعتبار سے ایک گراں بہا علمی ذخیرہ ہے اور اس سے استفادہ کے لئے مخدوم صاحب نے عام اجازت دے رکھی ہے

مخدوم صاحب کا انتقال اپریل ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ آپ حضرت غوث بندگی کے پہلو میں دفن ہیں۔ آجکل انکے صاحبزادے سید افتخار حسن گیلانی سجادہ نشین ہیں۔ جو پڑھے لکھے نوجوان ہیں اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پہ رواں دواں ہیں۔

اوچ کے گیلانی خاندان کی شاخیں برصغیر ہند و پاک کے مختلف شہروں میں آباد ہیں اور سب کے سب دینی و دنیاوی وجاہتوں کے حامل ہیں۔ خود مخدوم صاحب مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن رکین رہے ہیں اور یہ اعزاز انہیں برس ہا برس سے حاصل رہا ہے۔

اوچ گیلانی سے باہر نکلیں تو راستے میں ہاتھی دروازہ پڑتا ہے جو اس قلعہ کی فصیل کا دروازہ ہے جو مخدوم حامد گنج بخش ثالث نے فرمانروایانِ بہاولپور سے دشمنی کے زمانہ میں اپنی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا۔ دروازے پر یہ شعر ثبت ہیں۔

"در زمانِ جانشین غوثِ اعظم گنج بخش
رخ نمود ایں قلعۂ دارالامانِ قادری
ہاتفم دربارۂ بدخواہ آں تاریخ گفت
از یزید آمد عدوِ خاندانِ قادری"

ہاتھی دروازے سے متصل بسوں کا اڈہ ہے اور بسوں کے اڈے سے چند گز کے فاصلہ پر اوچ کا پولیس اسٹیشن ہے۔ پولیس اسٹیشن کے عقب میں رورل ہیلتھ سنٹر کی شاندار عمارت وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ رورل ہیلتھ سنٹر کے جنوب میں گورنمنٹ ہائی اسکول کی عمارت ہے۔ اوچ میں ایک گرلز مڈل اسکول بھی موجود ہے۔



ہاتھی دروازہ

احمد پور شرقیہ کو جانے والی سڑک کے بائیں کنارے اوچ سے تقریباً چار فرلانگ کے فاصلہ پر سید حسن کبیرالدین کا مزار ہے جو عوام میں "حسن دریا" کے نام سے مشہور ہیں۔

اوچ جو کبھی دینی اور دنیاوی تعلیم کے لئے دُور دُور تک شہرت رکھتا تھا اب وہاں دینی تعلیم کا کوئی قابلِ ذکر ادارہ موجود نہیں ہے۔ لے دے کے تنظیم اہل سنت کی جانب سے ایک دینی درسگاہ "مدرسہ فاروقیہ" کے نام سے قائم ہے جس کی حیثیت عام دینی مدرسوں سے زیادہ نہیں ہے۔ البتہ اب یہاں مڈل اور ہائی سکول اور ایک گورنمنٹ انٹر کالج حال میں قائم ہوا ہے

اوچ میں محکمہ آثارِ قدیمہ کے قیام کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اگر حکومت اب بھی یہاں اس محکمے کے قیام کا بندوبست کر دے تو اوچ کی قدامت و عظمت کے وہ نقوش جو ناقدری و بے التفاتی کا شکار ہو کر معدوم ہوتے جا رہے ہیں مزید بربادی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

کتابیات

الف

آثار الصنادید مصنفہ سرسید احمد خاں
آب کوثر
اشکال البلاد
احسن التقاسیم
آئین اکبری
الدولۃ العربیۃ الکبریٰ
اخبار الاخیار
الدر المنظوم
انساب جلالی
اتحاف النبلاء
النور السافر
اقبال نامۂ جہانگیری
اخیار الافاق
امپیریل گزیٹئر آف انڈیا
اینشینٹ ہسٹری آف انڈیا

ب

بلاذری
بزم صوفیہ
بہاول پور گزیٹئر

ت

تاریخ ہند کی تمہید
تحفۃ الکرام
تشریحات بر چچ نامہ
تاریخ اوچ مصنفہ مولوی حفیظ الرحمٰن

تاریخ یعقوبی
تاریخ فرشتہ
تاریخ مبارک شاہی
تاریخ سندھ
تاریخ ہند
ترجمان القرآن
ترمذی شریف
تاریخ یمینی
تاریخ جہاں کشائے جوینی
تاریخ فیروز شاہی
تاریخ معصومی
تاریخ نظام الدین
تاریخ جہاں خاں لودھی
تذکرہ قطب الاقطاب
تاریخ بنگال
تحفۃ السادات
تذکرہ حضرت ابوالنجیب سہروردی
تذکرۃ الاولیاء
تاریخ عالم آرائے عباسی
تحفۃ الابرار
تذکرہ حمیدیہ

ج

جوامع الحکایات
جامع العلوم
جنۃ المشرق
جواہر جلالی

چ

چچ نامہ

ح

حجج کرامہ فی آثار قیامہ
حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار
حل شبہات

خ

خزینۃ الاصفیاء
خلاصۃ التواریخ
خزانۂ جلالی

د

دربار اکبری
دی لینڈ آف فائیو رورس اینڈ سندھ

ر

رگ وید

ز

زاد المسافرین

س

سیر البلاد
سفر نامہ ابن بطوطہ
سفر نامہ ابن مہلہل
سیر العارفین
سبع سنابل
سفینۃ الاولیاء
سفر نامہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ
سہیل یمن
سیف الملوک

ص

صبح صادق

ض

ضمیمہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا از مورٹیمر

ط

طبقات ناصری
طبقات اکبری

ظ

ظفر الوالہ بمظفر والہ

ع

عرب ہند تعلقات

غ

غیاث اللغات
غبار خاطر

ف

فوائد الفواد

ق

قدیم تاریخ ہند
قدیم سندھ انجا مشہور شہر ماٹھو

ک

کامل ابن اثیر

کتاب الہند

کلیاتِ سید

کولمبیا لین کاٹ گزیٹر آف دی ورلڈ

کیمبرج ہسٹری آف انڈیا

کرائسٹ ان ہیون ان ارتھ

گ

گلزار فریدی

ل

لطائف اشرفی

م

معجم الامکنہ

مجمل التواریخ

معجم البلدان

مروج الذہب

مقدمہ تاریخ فرشتہ

منتخب التواریخ

مرآۃ الاسرار

مرقع ملتان

مخزن افاغنہ

منبع البرکات

منبع الانساب

ملفوظ المخدوم

مظہر جلالی

مسالک الابصار فی ممالک الامصار

مناقب برہانی

مرآۃ المبتدین

مآثر الکرام

مقدمہ کاشف الاسنار

مرآۃ المناقب

مخزن پنجاب

مقرر نامہ

مجمع السلوک

معارج الولایت

مخطوطات گیلانی لائبریری اوچ

ن

نزہتہ الخواطر

و

ویدک بنداز زیڈ۔ اے راگوزن

وقائع بیکانیر

ی

یوسف زلیخا

اسمائے اشخاص واقوام

الف

ب

پ

ت

ص

ض

ط

ع

ہ

ی

اماکن وبلاد

کتبہ: محمد شریف تلمیذ جناب حاجی محمد اعظم معظم رقم صاحب

اردو اکیڈمی بہاولپور



Title Designed & Photography By

Bilal Javaid

MFA in Graphic Design Professional, P.U

0300 - 9465791